Kashif Azad @ OneUrdu.com
نیا اضافہ شدہ ایڈیشن
زیرو پوائنٹ
جاوید چودھری
Kashif Azad @ OneUrdu.com
Kashif Azad @ OneUrdu.com

زیرو پوائنٹ 1

جاوید چودھری

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور
فون: 7352332-7232336

نام کتاب	زیرو پوائنٹ 1
مصنف	جاوید چودھری
ناشر	گل فراز احمد
	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ	ملک محمد زاہد
کمپوزنگ	انیس احمد
سن اشاعت	اکتوبر 2009ء
قیمت	=/500 روپے

بہترین کتاب چھپوانے کے لئے رابطہ کریں:۔ 0300-9450911

......ملنے کے پتے......

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7352332-7232336

کتاب گھر

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

ویلکم بک پورٹ

اردو بازار، کراچی

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جہت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے۔ (ناشر)

انتساب!

اپنے ابا جی

کے نام

ترتیب

Kashif Azad @ OneUrdu.com

مجرم حاضر ہے

شاید سردیاں تھیں یا گرمیاں میری ماں کو میری تاریخ پیدائش یاد نہیں۔ میں نے اس سے جب بھی پوچھا، اس کا جواب حیرت، بے بسی اور تاسف ہی تھا۔ میرے سوالوں پر میری ماں کا یہی رد عمل ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس نے مجھے گجرات کے جس پسماندہ گاؤں میں جنم دیا تھا وہاں صرف پیدائش ہوتی ہے تاریخ پیدائش نہیں۔ بلکہ نہیں ٹھہریئے وہاں شاید تاریخ بھی نہیں ہوتی کیونکہ تاریخ کے لیے کیلنڈر بدلنا، مہینوں کا گزرنا اور برسوں کا بیتنا ضروری ہوتا ہے جبکہ وہاں میرے گاؤں میں پچھلے آٹھ دس ہزار سال سے ایک ہی مہینہ، ایک ہی سال، ایک ہی تاریخ ہے وہاں اشو کا عہد کا ''خیلو'' اور اکیسویں صدی کا ''فضلو'' ایک ہی چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے اور ماہیے گاتے ہیں۔

میری ماں بچپن میں مجھے ایک لمبا کرتا پہنا دیتی تھی۔ اس کرتے نے اس وقت تک میرا ساتھ دیا جب تک یہ سکڑتا سکڑتا میری ناف تک نہ آ پہنچا۔ (یہ مسئلہ آج تک حل طلب ہے کہ میں پھیلتا رہا تھا یا کرتا سکڑتا رہا تھا) یہ کرتا میرا پہلا استاد تھا کیونکہ اسی کرتے نے مجھے پہلا لفظ سکھایا تھا، وہ لفظ تھا ''شرم''۔ میں جب کبھی بچپن میں ناک صاف کرنے کے لیے سرِ عام کرتا اوپر اٹھا دیتا تھا تو میرے قریب سے گزرتے میرے چاچے مامے ''اوئے، اوئے شرم کر، شرم'' کا نعرہ لگا کر مجھے شرمندہ کر دیتے تھے۔ بچپن کے اس ''درسِ نظامی'' نے مجھے بہت ہی چھوٹی عمر میں کرتے اور شرم کا تعلق سمجھا دیا لہٰذا میں نے آنے والی زندگی میں کرتے کا دامن اٹھایا اور نہ ہی کبھی پھیلایا۔ مجھے یقین ہے میں آئندہ زندگی میں بھی ان علتوں سے محفوظ رہوں گا کیونکہ میرا رب شرم والوں کی شرم محفوظ رکھتا ہے۔

اڑھائی برس تک میرے والدین نے میرا نام نہیں رکھا۔ ان کا خیال تھا نام کی ضرورت تو بڑوں کو ہوتی ہے، بچے بچے ہوتے ہیں انہیں اوئے کہہ کر پکار لیا جائے یا کاکا، بچو یا منا کہہ دیا جائے کام چل جاتا ہے۔ یہ کام کاکے، بچو اور منے کی مدد سے مزید دس بارہ برس تک چل سکتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں میری ماں نے ایک روز مجھے بیٹھے بٹھائے ''جاوید'' کہہ دیا۔ میرے والد کو یہ حرکت پسند نہ آئی۔ ان کا کہنا تھا لوگ ''جاوید'' کو بڑی آسانی سے بگاڑ کر جیدی، جیدا یا جیدو بنا دیں گے لہٰذا ہمیں گاؤں میں رائج کسی ایسے نام کا انتخاب کرنا چاہیے

جس میں اللہ رسول ﷺ کا ذکر آتا ہو۔ میرے والد کا خیال درست تھا۔ ہمارے گاؤں میں لوگ ایسے ناموں کو بگاڑنا جن میں اللہ رسول ﷺ کا لفظ آتا ہو شرک سے بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے ہمارے گاؤں میں جتنے اللہ دتے، اللہ رکھے اور اللہ وسائے ملتے ہیں اتنے شاید مجموعی طور پر پورے کرہ ارض پر نہ پائے جاتے ہوں لیکن، لیکن صرف میرے والد نہیں میری ماں کا کہنا بھی درست تھا۔ اس کا کہنا تھا اگر میرا بیٹا کرماں والا ہوا تو اسے جیدی، جیدا اور جیدو سے جاوید بنتے دیر نہیں لگے گی، نالائق نکلا تو ہم اس کا نام کچھ بھی رکھ لیں لوگ بگاڑنے سے باز نہیں آئیں گے۔ میرے والد نے میری ماں کی بات مان لی۔ یہ گھر کے میدان میں میرے والد کی آخری شکست اور میری ماں کی پہلی اور آخری فتح تھی۔

میں بڑا ہوا تو ایک طویل عرصے تک اس گومگو میں رہا کہ میں ''محمد جاوید'' ہوں یا ''جاوید اقبال۔'' آنے والی زندگی میں یہ گتھی بھی دوسری گتھیوں کی طرح مجھے ہی سلجھانا پڑی۔ یوں میٹرک کے بعد سے میں ''محمد جاوید'' ہوں اور اخبار کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد سے ''جاوید چودھری'' آپ پوچھ سکتے ہیں، میں ''محمد جاوید'' یا ''محمد جاوید چودھری'' کیوں نہیں لکھتا۔ بات بہت واضح ہے، میں نہیں چاہتا میرے ناراض دوست جب میرا نام لے کر اپنی نفرت کا اظہار کریں تو لفظ ''محمد'' کے باعث ان پر بخشش کے دروازے بند ہو جائیں ہاں البتہ میں نے جب بھی اکاؤنٹ کھلوایا تو ''محمد جاوید چودھری'' کے نام ہی سے کھلوایا اس لیے کہ جب زندگی مجھے سمجھوتے پر مجبور کرنے لگے تو میرے نام میں شامل دنیا کی سب سے بڑی پاکیزگی ''محمد'' مجھے لوٹ جانے، واپس لوٹ جانے کا حکم دے سکے۔

آج یہ سطریں لکھتے ہوئے مجھے اپنی ان پڑھ، بھولی بھالی ماں بہت یاد آ رہی ہے، وہ اس وقت مجھ سے ڈیڑھ دو سو میل دور ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھی ہے۔ اس احساس کی دو وجوہات ہیں، ایک تو اس کا ماں ہونا اور دوسری اس کی وہ دلیل جس نے کبھی میرے والد کو ہارنے پر مجبور کر دیا تھا اور آج مجھے شکست دے دی ہے۔ جب یہ کتاب مکمل ہوئی اور بھائی آصف[1]، اس کتاب کے پبلشر، نے مجھے کسی نامور دانشور سے دیباچہ لکھوانے کا حکم دیا اور میں نے بجا آوری کے لیے اپنے تمام بزرگوں اور دوستوں کی فہرست بنائی جن کی ذات کے سورج میری شخصیت کے میلے دھندلے آئینے میں چمکتے ہیں تو میری ماں نے میرا ہاتھ تھام کر کہا ''نہیں پتر نہیں، تم کسی بزرگ، کسی دوست کو تکلیف مت دو، تم اس کتاب کو اسی طرح زندگی کے دریا میں اتار دو جس طرح میں نے تمہیں دھکیل دیا تھا۔ اگر یہ کرماں والی ہوئی، اگر اس میں کچھ ہوا تو یہ لوگوں تک پہنچ جائے گی اور لوگ اس تک۔ اگر اس میں کچھ نہ ہوا تو پھر دنیا کے سارے دانشور اس کی تعریف میں اپنا سارا لہو، اپنا سارا ہنر صرف کر دیں تو بھی اسے زندہ نہیں رکھ سکتے۔''

مجھے اعتراف ہے یہ شاید میری زندگی کی انتہائی قیمتی خواہشوں میں سے ایک خواہش تھی کہ میری اس

---

[1] یہ اس کتاب کے پہلے پبلشرز ہے۔

کتاب کا دیباچہ جناب نسیم انور بیگ لکھتے۔ وہ نسیم انور بیگ جن کا ہر لفظ تعویز اور ہر فقرہ دعا ہوتی ہے۔ جناب ارشاد احمد حقانی لکھتے جن کے قلم کو اللہ تعالیٰ نے آنکھیں بھی دے رکھی ہیں اور دماغ بھی۔ جناب منو بھائی لکھتے جن کے تخلیق کیے گئے فقروں پر خود اُردو زبان فریفتہ ہو جاتی ہے۔ جناب مجیب الرحمٰن شامی لکھتے، لفظ جن کے حضور یوں سر جھکا کر بیٹھتے ہیں جیسے عقیدت میں بھیگے مرید مرشد کے سامنے۔ جناب عبدالقادر حسن لکھتے جن کی نثر پہاڑی ندی کی طرح ہے جب اس میں طغیانی آتی ہے تو پھر وہ بہتی چلی جاتی ہے، بہاتی چلی جاتی ہے۔ جناب نذیر ناجی لکھتے جن کے قلم نے لفظوں کو کہنے کا، بولنے کا سلیقہ سکھایا۔ جناب ضیا شاہد لکھتے جن کی انگلیوں میں پہنچ کر لفظ، لفظ نہیں رہتے، احساس بن جاتے ہیں، جذبہ ہو جاتے ہیں۔ کلام کے مسیح استاد ہارون الرشید لکھتے جو قبروں میں لیٹے ٹھنڈے، بے جان لفظوں کو چھو لیں تو وہ اُٹھ کر چلنے لگتے ہیں، پھرنے لگتے ہیں، بولنے لگتے ہیں۔ صحافت کے امام خمینی جناب حسن نثار لکھتے جنہوں نے ناں سے ہاں اور ہاں سے ناں کی آواز پیدا کر کے دکھائی۔ جو بانسری کے پیٹ سے تلوار نکالنا جانتے ہیں۔ جناب عطاء الحق قاسمی لکھتے جنہیں برف کو آگ لگانے اور آگ سے برف کی سلیں بنانے کا منتر آتا ہے اور جناب امجد اسلام امجد لکھتے جن کی نثر میں شعر کا ذائقہ اور شاعری میں نثر کا چسکا ہے لیکن افسوس میری ماں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے روک دیا اور یوں میری خواہش درخواست بننے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔

میں اپنی یہ کتاب وقت کے حوالے کر رہا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ اگر اس میں کوئی نئی بات، کوئی انوکھی واردات ہوئی تو یہ اپنا وجود خود منوالے گی بصورت دیگر جناب ارشاد حقانی سے امجد اسلام امجد تک میرے استادوں، میرے محسنوں اور میرے بزرگوں کے سارے لفظ، ساری نیک تمنائیں اس راکھ کے ڈھیر کو زندگی نہیں بخش سکتیں۔

میں خود کو آپ کی عدالت میں پیش کر رہا ہوں۔ مجرم حاضر ہے، اسے بے گناہ سمجھیں تو باعزت بری کر دیں، گناہگار جانیں تو معافی دے دیں۔

بری کرنا آپ کا انصاف ہوگا، اور معافی دینا آپ کی اعلیٰ ظرفی۔

جاوید چودھری
ہاؤس نمبر 491، سٹریٹ 17
شہزاد ٹاؤن (اسلام آباد)

ہم وکھری ٹائپ کے بھکاری ہیں

سعودی معاشرے میں بھی تبدیلی انگڑائیاں لے رہی ہے' تیل نے سعودی عرب میں چالیس برس قبل انڈسٹری کی شکل اختیار کی تھی جس کے بعد سعودی عرب میں ارب پتیوں کی کلاس نے جنم لیا' ان ارب پتیوں کو رئیس بنے ہوئے چالیس سال گزر چکے ہیں' اس عرصے میں ان کی تیسری نسل جوان ہو گئی' یہ بزرگوں کے مقابلے میں لبرل اور روشن خیال نسل ہے چنانچہ یہ بھی دنیا کی دوسری خوش حال اور ماڈرن نسلوں کی طرح لذتوں کی تلاش میں سرگرداں ہے' سعودی عرب ایک بند اور بڑی حد تک مذہبی معاشرہ ہے اور اس معاشرے میں ابھی تک ان لذتوں کی گنجائش پیدا نہیں ہوئی لہٰذا جب سعودی عرب کے ہمسایوں نے چند میل کے فاصلے پر گرد دیکھا تو ان ریاستوں نے معاشی مکھیاں بننے کا فیصلہ کر لیا' دوبئی نے پہلا قدم اٹھایا' دوبئی کے شیخوں نے سعودی عرب کی رئیس کلاس پر اپنے دروازے کھول دیئے' انہوں نے پب بنائے' ڈسکو کھولے اور عشرت کدے آباد کر دیئے چنانچہ سعودی عرب کی دولت دوبئی کے دروازے پر دستک دینے لگی' ہر ویک اینڈ پر شہزادے' رئیس اور شیخ دوبئی پہنچ جاتے اور لاکھوں کروڑوں ڈالر لٹا کر اتوار کی رات واپس آ جاتے' دوبئی کی دیکھا دیکھی دوسری ریاستیں بھی آگے بڑھیں اور یہ بھی بہتے دریا میں ہاتھ دھونے لگیں' بحرین روشن خیالی کا تازہ ترین چشمہ ہے' بحرین نے سعودی عرب کی مدد سے دونوں ممالک کے درمیان سڑک بنا دی' یہ کاز وے عرف عام میں ''وسکی پل'' کہلاتی ہے' بحرین یورپ اور امریکہ کی طرح روشن خیال اور اعتدال پسند ہو چکا ہے چنانچہ اب ویک اینڈ پر سعودی شہری بحرین کا رخ کرتے ہیں' سعودی عرب میں جمعہ کو چھٹی ہوتی ہے چنانچہ اس مناسبت سے بدھ کی شام ''ویک اینڈ'' بن جاتی ہے' اس روز یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سعودی عرب کی یہ سڑک بحرین کی طرف مڑ گئی ہے' ریاض میں سات ہزار کے قریب شہزادے اور شہزادیاں موجود ہیں' یہ لوگ ویک اینڈ پر جب شہر میں نکلتے ہیں تو نہ صرف ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ ریاض لندن کی ٹریفالگر سکوائر اور لاہور کی لبرٹی کا منظر پیش کرنے لگتا ہے' مجھے بے شمار پاکستانی فیملیز نے بتایا یہ لوگ بالخصوص ان کی خواتین ان دنوں باہر نہیں نکلتیں کیونکہ قانون کی مضبوطی اور ریاست کے آہنی ہاتھوں کے باوجود ابھی تک سعودی عرب کے شاہی خاندانوں کو بے شمار رعایتیں حاصل ہیں اور بعض اوقات غریب ممالک کے شہری ان رعایتوں کی زد میں آ جاتے ہیں'

ٹریفک پولیس بھی ویک اینڈ پر شہزادے اور شہزادیوں کی بدتمیزی پر آنکھیں بند کر لیتی ہے ہاں البتہ شاہی خاندان کا کوئی فرد اگر کسی سنگین جرم میں اندر ہو جائے یا عدالت کی نظر میں آ جائے تو شاہی خاندان اسے بچانے کی کوشش نہیں کرتا لہٰذا وہ شخص کیفر کردار تک ضرور پہنچتا ہے۔

سعودی عرب پاکستان کا بے انتہا مخلص دوست ہے اور اس نے ہر نازک موقع پر پاکستان کی مدد کی' میاں نواز شریف نے 1998ء میں ایٹمی دھماکے کئے تو سعودی عرب پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کو مبارک باد پیش کی تھی' پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو شاہ فہد اپنی نجی محفلوں میں ہمارا ایٹم بم اور اسلامی بم کہتے تھے' مجھے 15 اپریل کی رات ایک سعودی باشندے نے بتایا شاہ فہد جوڑوں کے امراض میں مبتلا تھے' وہ کئی برس تک اپنی ٹانگوں پر کھڑے نہیں ہو سکے لیکن ایٹمی دھماکوں کے بعد جب میاں نواز شریف ان سے ملاقات کیلئے شاہی محل پہنچے تو انہیں دیکھ کر شاہ فہد ویل چیئر سے کھڑے ہو گئے' سعودی عرب اور شاہی خاندان کو پاکستان سے اس قدر محبت ہے لیکن ہم لوگ بدقسمتی سے اس محبت سے استفادہ نہیں کر سکے' سعودی عرب ایک نو دولتی سٹیٹ ہے اور اسے ہر شعبے میں ہنرمندوں کی ضرورت ہے' گو سعودی عرب کے بے شمار شعبوں کے اعلیٰ عہدے پاکستانیوں کے پاس ہیں لیکن اس کے باوجود سعودی عرب میں ہمارے پانچ لاکھ کے قریب مزدور آباد ہیں' ہماری حکومت اگر ان پانچ لاکھ لوگوں کو ہنرمند بنا دے تو یہ لوگ سعودی عرب کی معیشت کا زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں' میں اس سلسلے میں بنگلہ دیش کی مثال دیتا ہوں بنگلہ دیش کے لوگ سعودی عرب میں تیسرے درجے کے شہری سمجھے جاتے تھے' یہ لوگ سعودی باشندوں کی گاڑیاں دھوتے تھے' بوٹ پالش کرتے تھے' لانوں کی صفائی کرتے اور گھروں میں کام کرتے تھے لیکن پھر گرامین بینک کے سربراہ ڈاکٹر یونس سعودی عرب آئے' انہوں نے پورے سعودی عرب میں بنگلہ دیشی باشندوں کے سیمینار کرائے اور انہیں سمجھایا تم لوگ کب تک کمی کمینوں کی طرح زندگی گزارتے رہو گے' تم ہنر سیکھو تا کہ تمہاری زندگی آسان ہو سکے' ڈاکٹر یونس نے بعد ازاں بنگلہ دیشی حکومت کے ساتھ مل کر بنگلہ دیش میں ٹریننگ کے ادارے بنائے' ان لوگوں کو سعودی عرب سے واپس بلایا' انہیں چھ چھ ماہ کے ٹیکنیکل کورسز کرائے اور انہیں دوبارہ سعودی عرب بھجوانا شروع کر دیا' ڈاکٹر یونس کی مہربانی سے بنگلہ دیشی کمیونٹی نے اب سعودی عرب میں سر اٹھانا شروع کر دیا ہے' ہماری حکومت بھی اگر اس ماڈل پر عمل کرے' سید خورشید شاہ اور ڈاکٹر فاروق ستار پاکستان میں ٹیکنیکل ادارے بنائیں اور سعودی عرب میں کام کرنے والے بے ہنر پاکستانیوں کو واپس بلا کر انہیں کوئی ہنر سکھا دیں تو پاکستانیوں کے حالات بدل سکتے ہیں' میں اس سلسلے میں تھائی لینڈ کی مثال بھی دیتا ہوں' سعودی عرب میں ہیلتھ کیئر باقاعدہ انڈسٹری کی شکل اختیار کر رہی ہے چنانچہ سعودی عرب کو ہسپتالوں' ڈسپنسریوں اور ایمبولینس سروسز کیلئے ٹیکنیکل سٹاف درکار تھا' تھائی لینڈ نے سعودی عرب کی اس ضرورت کو سمجھا' اس نے فوری طور پر چھوٹے چھوٹے میڈیکل انسٹیٹیوٹ بنائے' تھائی نوجوانوں کو ٹریننگ دی اور سعودی عرب بھجوا دیا' اس فیصلے کی وجہ سے آج سعودی عرب کی میڈیکل کیئر میں

تھائی لینڈ کی مناپلی قائم ہو چکی ہے' ڈاکٹر منصور میمن سعودی عرب کے مشہور پاکستانی ڈاکٹر ہیں' وہ سعودی عرب کے ایک بہت بڑے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں '' کی پوسٹ '' پر تعینات ہیں' انہوں نے چند برس پہلے سعودی گورنمنٹ کو قائل کیا کہ وہ پاکستان سے میڈیکل سٹاف منگوایا کرے' سعودی حکومت نے رضا مندی شو کر دی' اس کے بعد سعودی عرب کے دو اعلیٰ افسر پاکستان پہنچ گئے لیکن ہماری بیورو کریسی نے ان افسروں کی مت مار دی' وہ واپس گئے اور انہوں نے توبہ کر لی' اسی قسم کی ایک اور مثال کنگ سعود یونیورسٹی میں اردو چیئر ہے' کنگ سعود یونیورسٹی میں مختلف زبانوں کی چیئرز تھیں' پاکستانی کیمونٹی نے سعودی حکومت کو قائل کیا کہ وہ یونیورسٹی میں اردو چیئر بھی قائم کرے' حکومت نے اجازت دے دی لیکن پاکستان نے مطالبہ کر دیا اس کا نام اردو چیئر کی بجائے اقبال چیئر رکھا جائے' سعودی حکومت نے جواب دیا ہم نے صرف زبانوں کے نام پر چیئرز قائم کی ہیں شخصیات پر نہیں' سعودی عرب میں فرنچ' جاپانی' انگلش اور چائنیز چیئرز ہیں' مالؤ' شیکسپیئر یا سارتر چیئرز نہیں ہیں لہٰذا آپ اردو چیئر کیلئے اپنا کوئی سکالر نامزد کر دیں لیکن پاکستانی حکومت نے اس کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا' اس دوران یہ معاملہ بھارت کے نوٹس میں آ گیا چنانچہ بھارت نے اردو چیئر کے لئے اپنا نمائندہ بھجوا دیا' آپ اب ستم ملاحظہ کیجئے کنگ سعود یونیورسٹی کی اردو چیئر پر بھارتی سکالر تعینات ہے' اسی قسم کی ایک مثال بھارتی یونیورسٹیاں ہیں' نائن الیون کے بعد سعودی عرب کے طالب علموں کو یورپ اور امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مشکلات در پیش تھیں' حکومت نے اپنے طالب علموں کیلئے نئے راستے تلاش کرنا شروع کر دیئے' سعودی حکومت نے اس سلسلے میں جن یونیورسٹیوں کا انتخاب کیا ان میں علی گڑھ یونیورسٹی بھی شامل تھی' بھارت کو پتہ چلا تو بھارت کے وزیر تعلیم فوراً ریاض پہنچے اور انہوں نے سعودی حکومت سے بھارت کی بارہ یونیورسٹیوں کی منظوری لے لی یوں اب بھارت کی بارہ یونیورسٹیوں میں سعودی عرب کے طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں جبکہ پاکستان کی کوئی یونیورسٹی اس فہرست میں شامل نہیں' ہم اگر تھوڑی سی دانشمندی سے کام لیں تو میرا خیال ہے ہم سعودی عرب کی محبت کا کہیں زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مجھے سعودی عرب کے ایک اعلیٰ افسر نے بڑا دلچسپ واقعہ سنایا' اس نے بتایا پچھلے سال جب پاکستان نے سعودی عرب سے امداد کی اپیل کی تو پاکستان کا ایک نمائندہ شاہ عبداللہ سے ملاقات کیلئے ریاض آیا' یہ صاحب صدر آصف علی زرداری کے خصوصی طیارے پر ریاض آئے تھے' یہ بات جب شاہ کے نوٹس میں آئی تو وہ شدید ناراض ہوئے اور انہوں نے پاکستانی حکومت کو کہلا بھیجا '' ہم آپ کی مدد کیلئے تیار ہیں لیکن پہلے آپ لوگ کم از کم یہ عیاشی تو بند کریں'' سعودی افسر کا کہنا تھا '' یہ وہ حرکت تھی جس کی وجہ سے سعودی عرب نے پاکستان کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا'' میں نے یہ واقعہ سنا تو میں نے قہقہہ لگایا اور اس سے عرض کیا '' ہم ذرا وکھری ٹائپ کے بھکاری ہیں' ہم ہمیشہ کنالی کا سوٹ پہن کر کرسٹن ڈیور کے کشکول میں بھیک مانگتے ہیں''۔

ہم سب کوفی ہیں

سید الشہداء حضرت امام حسینؓ کی ذات کے ان گنت پہلو ہیں' آپ کی شخصیت میں ایسے ایسے رنگ موجود ہیں جن کا احاطہ مورخین چودہ سو سال سے کر رہے ہیں لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہیں ہو رہا۔ آپ دس محرم کے دن ہی کو لے لیجئے' یہ دن آپ کی شہادت سے قبل مختلف حوالوں سے پہچانا جاتا تھا مثلاً اللہ تعالیٰ نے عرش' زمین' کرسی' سورج' چاند' ستارے اور جنت دس محرم کو تخلیق کی تھی' حضرت آدمؑ اور بی بی حوا نے بھی دس محرم کو آنکھ کھولی تھی' دس محرم وہ دن تھا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور بی بی حوا کی توبہ قبول کی تھی' اس دن حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے' اس دن حضرت ابراہیمؑ کو آتش نمرود سے نجات ملی تھی' اسی دن فرعون کا لشکر پانی میں غرق ہوا تھا' اسی دن حضرت موسیٰؑ کو فتح نصیب ہوئی تھی' اسی دن حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ سے برآمد ہوئے تھے' اسی دن حضرت یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالا گیا تھا' اسی دن حضرت یعقوبؑ کو بینائی لوٹائی گئی تھی' اسی دن حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے اور اسی دن حضرت عیسیٰؑ دنیا سے زندہ اٹھائے گئے تھے۔ غرض کائنات کے بڑے فیصلے دس محرم کو ہوئے تھے لیکن پھر حضرت امام حسینؓ نے دس محرم کو شہادت قبول فرما کر اس دن کا حوالہ بدل دیا اور 10 اکتوبر 680ء اور دس محرم 61ھ کو آپ کی شہادت کے بعد دس محرم حضرت امام حسینؓ کا دن ہوگیا چنانچہ آج نیوزی لینڈ سے لے کر سائبیریا تک' کربلا سے لے کر آئس لینڈ تک اور نیپلز کے ساحلوں سے لے کر ایلس لینڈ اور انٹارکٹکا سے لے کر جیکا تک پوری دنیا دس محرم کو حضرت امام حسینؓ کا دن سمجھتی ہے۔ یہ انسانی کیلنڈر کا وہ واحد دن ہے جس روز دنیا کی ہوائیں' فضائیں' لہریں' خوشبوئیں اور کرنیں تک مغموم ہو جاتی ہیں' جس دن پانی کا ایک ایک قطرہ' خوشبو کی ایک ایک لہر' آسمان کی ایک ایک پرت اور ریت کا ایک ایک ذرہ اداس ہو جاتا ہے' جس دن ہوا کی آنکھوں میں آنسو' بادلوں کے دل میں ٹیس' زمین کے جگر میں خراش اور آسمان کے ضمیر پر درد جاگ اٹھتا ہے اور کائنات کے آخری سرے تک درد کی شام غریباں بچھ جاتی ہے۔ یہ دن کیلنڈر کے 360 دنوں کا نوحہ' چیخ اور سسکی ہے اور اس دن دنیا کی ہر تخلیق' سارے حیوانات' نباتات اور جمادات دکھ میں غرق ہو جاتے ہیں۔

یہ دن حقیقتاً حضرت امام حسینؓ کا دن ہے لیکن یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے حضرت امام حسینؓ کا وہ کون

سا کارنامہ تھا جس کے صدقے دس محرم کے سارے حوالے تبدیل ہو گئے' جس نے حضرت آدم، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یونسؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے دن کی وراثت بدل دی۔ کیا وہ کارنامہ حضرت امام حسینؓ اور ان کے اہل بیت کی قربانی تھا؟ کیا وہ کارنامہ آپ اور آپ کے صاحبزادوں' آپ کے خاندان اور کنبہ رسولؐ کی شہادت تھا؟ ہاں' یقیناً آپ کی شہادت نے تاریخ اسلام میں مرکزی کردار ادا کیا تھا مگر دس محرم کے پلو میں اس کے علاوہ بھی بے شمار زاویے پوشیدہ ہیں اور ان زاویوں میں ایک زاویہ اسلام کی سپرٹ ہے' اسلام دنیا کا پہلا اور واحد مذہب تھا (اور ہے) جس نے برائی کے خلاف جدوجہد کو جہاد کا نام دیا تھا' جس نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا تھا برائی کو ہاتھ سے روکو' نہ روک سکو تو اسے منہ سے برا بھلا کہو' نہ کہہ سکو تو دل میں اس کی مذمت کرو لیکن یہ ایمان کا کم ترین درجہ ہے۔ یہ دنیا کا واحد مذہب تھا جس نے تعداد کے بجائے جذبے کو فوقیت دی اور جس نے نیت کو وسیلہ پر اہمیت دی۔ یہ وہ مذہب تھا جس نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا کہ تمہارے پاس اگر تلواریں نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں' تمہارے پاس اگر ترکش نہیں ہیں' تیر بھالے اور نیزے نہیں ہیں' تمہارے پاس گھوڑے' اونٹ اور خچر نہیں ہیں' تم ننگے پاؤں' بھوکے پیٹ اور بے چھت ہو اور اگر تم تعداد میں بھی کم ہو تو بھی کوئی پرواہ نہیں بس تم اللہ کے نام پر بدر کے میدان میں پہنچو' اللہ کے حضور دعا کرو اور دین کے دشمنوں سے بھڑ جاؤ' اللہ کی نصرت تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہو گی اور یہ دنیا کا واحد مذہب تھا جس نے کہا تھا کلمہ پڑھنے سے لوگوں کا دل مسلمان نہیں ہوتا' نماز پڑھنے' روزہ رکھنے اور حج کرنے والے لوگ بھی فرعون' شداد اور نمرود ہو سکتے ہیں اور تم پر ان لوگوں کے خلاف بھی اتنا ہی جہاد فرض ہے جتنا کافروں' مشرکوں اور اللہ کے دشمنوں سے فرض ہے۔ جس نے کہا تھا تم صرف اس شخص کی امارت تسلیم کرو جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات سے روگردانی نہ کرے' جو اس کے دین میں ذاتی انا' ضد اور تکبر کی ملاوٹ نہ کرے اور جو اللہ کے احکامات میں نظریہ ضرورت کی آمیزش نہ کرے اور سید الشہداءؓ اسلام کے اس نظریے' اس فکر اور اس فلسفے کے امام تھے اور انہوں نے اسلام کی سپرٹ پر عمل کرتے ہوئے کلمہ گو آمریت کے خلاف علم بلند کر دیا' انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا اسلام میں تعداد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی' آپ نے یہ بھی ثابت کر دیا اسلام میں دنیاوی کامیابی اہمیت نہیں رکھتی اور آپ نے ثابت کر دیا اسلام قول اور اقرار کا مذہب ہے اور اس میں جب کسی سے وعدہ کر لیا جائے تو اس پر قائم رہتے ہیں خواہ کوفہ کے سارے شہری ''کوفی'' ثابت کیوں نہ ہو جائیں۔ آپ نے ثابت کر دیا اسلام میں کربلا میں داخل ہونے کے ہزاروں دروازے ہیں لیکن اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اور اسلام میں شہادت سب سے بڑا اعزاز ہوتی ہے۔

میں آج جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو اس وقت غزہ میں اکیسویں صدی کا کربلا برپا ہے' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام لینے والوں پر اسرائیل کے میزائل بارش کی طرح برس رہے ہیں' شہر کے اندر بم پھٹ رہے ہیں' گولیاں چل رہی ہیں اور اسرائیلی ٹینک زندہ انسانوں کا قیمہ بنا کر جا رہے ہیں اور امریکہ اور یورپ

اس ظلم پر نہ صرف تالیاں بجا رہے ہیں بلکہ وہ اسرائیلی جارحیت کو درست بھی قرار دے رہے ہیں اور پورا عالم اسلام اس ظلم پر کوفہ بن کر خاموش بیٹھا ہے۔ آپ یاد کیجئے دس محرم 61ھ کو جب کربلا میں نواسہ رسولؐ کا سر قلم کیا جا رہا تھا' جب آپ کا سر مبارک شمر نے نیزے پر ٹانک دیا تھا' جب شہدائے کربلا کی نعشوں پر گھوڑے دوڑائے جا رہے تھے اور جب اہل بیت کے خیموں کو آگ لگائی جا رہی تھی اور وہ بیبیاں جن کے چہروں تک پہنچ کر سورج کی کرنیں بھی پردہ کر لیتی تھیں اور ہوا انہیں چھونے سے پہلے ہزار بار آب زم زم سے غسل کرتی تھی' وہ بیبیاں جب ننگے سر' ننگے پاؤں خیموں سے باہر نکلیں تو اس وقت کوفہ کے لوگ کیا کر رہے تھے؟ یہ بد بخت لوگ اس وقت خلافت کا جشن منا رہے تھے' کوفیوں نے اس وقت اپنے گھروں میں چراغاں کیا ہوا تھا اور وہ دیگیں چڑھا کر بیٹھے تھے اور آج ساڑھے تیرہ سو سال بعد بھی وہی منظر ہے' غزہ کی گلیوں میں سینکڑوں فلسطینی بچوں کی نعشیں پڑی ہیں' اسرائیلی ٹینک عفت مآب بچیوں کی نعشوں کو کچل رہے ہیں اور فلسطینی مسلمان یا اللہ مدد' یا رسولؐ مدد کے نعرے لگا کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن 62 اسلامی ملک کوفہ بن کر بیٹھے ہیں۔ آپ بے حسی اور بے بسی ملاحظہ کیجئے' غزہ کی پٹی کے گرد 22 عرب ملک ہیں اور ان 22 عرب ملکوں کو اسرائیلی جارحیت کے خلاف احتجاج تک کی توفیق نہیں ہوئی' غزہ میں چوبیس گھنٹے موت اتر رہی ہے اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ ہماری اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو گی کہ ہم نے حضرت امام حسینؓ کے فلسفے' ان کی فکر اور ان کی جدوجہد کو فراموش کر دیا؟ کیا ہم فلسطینی مسلمانوں کی نعشیں دیکھ کر بھی فکر حسینؓ کے وارث کہلانے کے قابل ہیں۔

حضرت امام حسینؓ ایک جدوجہد کا نام ہیں' وہ ایمان' جرات اور جہاد کی عملی شکل ہیں' میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ سمجھتا ہوں اگر دنیا میں حضرت امام حسینؓ نہ ہوتے' اگر وہ کربلا میں اپنے خاندان کی قربانی نہ دیتے تو شائد دنیا میں کوئی شخص برائی کے خلاف اکیلا کھڑا ہونے کی جرات نہ کرتا' یہ حضرت امام حسینؓ کی قربانی تھی جس نے لوگوں کو لڑنے' ٹکرانے اور وقت کے فرعونوں کے سامنے کھڑا ہونے کا حوصلہ دیا' جس نے تاریخ عالم کو سمجھایا دنیا کی ہر شکست وقتی اور ہر فتح عارضی ہوتی ہے اور دنیا میں صرف سچ اور حق کو مستقل حیثیت حاصل ہے' جس نے اقوام عالم کو بتایا اے نا سمجھ لوگو حق کا ساتھ دو اور باطل سے ٹکرا جاؤ لیکن ہم نے حضرت امام حسینؓ کا یہ پیغام فراموش کر دیا چنانچہ آج فلسطین کے مسلمان ہماری آنکھوں کے سامنے مر رہے ہیں' ہم روزانہ ٹیلی ویژن سکرین پر انہیں جلتے اور مرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور کروٹ بدل کر سو جاتے ہیں۔ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجئے' کیا ہم دنیا کے ایک ارب 51 کروڑ مسلمان کوفی نہیں ہیں اور کیا ایران سے لے کر مصر تک 62 اسلامی ملک کوفہ نہیں ہیں۔ کیا ہماری خاموشی یہ ثابت نہیں کرتی ہم فکر حسینؓ کے وارث نہیں ہیں بلکہ ہم شمر کے نظریاتی بھائی ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا ''ظلم پر خاموشی ظالم کا ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہے'' اور ہم سب ظالموں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں چنانچہ ہم حضرت امام حسینؓ کا نام تک لینے کے حق دار نہیں ہیں۔

''ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں''

آج کل وزیراعظم یوسف رضا گیلانی بیانات دینے کے معاملے میں پاکستان کے تمام سابق اور موجودہ سیاستدانوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں' وزیراعظم کا ہر بیان معرکتہ الآراء ہوتا ہے اور کئی کئی دنوں تک زیر بحث رہتا ہے مثلاً وزیراعظم صاحب نے چند دن پہلے قومی اسمبلی میں کھڑے ہو کر فرما دیا تھا ''اگر کوئی دوسرا شخص ملک کے مسائل حل کر سکتا ہے تو وہ آگے آئے' میں اقتدار چھوڑ دیتا ہوں'' وزیراعظم صاحب کے اس بیان کو قاضی حسین احمد سے لے کر ڈاکٹر بابر اعوان تک ملک کے بے شمار رہنماؤں نے سنجیدہ آفر سمجھ لیا اور یہ احباب آج کل پاکستان کے بڑے بڑے مسائل کی فہرست بنا رہے ہیں۔ اسی طرح وزیراعظم صاحب نے گزشتہ روز فرما دیا ''میرا چیف جسٹس ملک کا آئین ہے'' وزیراعظم صاحب نے جب یہ فرمایا تب سے قوم اس وقت سے پریشان ہے کیونکہ یوسف رضا گیلانی کے آئین میں تو سترہویں ترمیم بھی شامل ہے اور اس ترمیم میں وہ 58 ٹو۔ بی بھی قائم ہے جس کی موجودگی میں صدر آصف علی زرداری اور صدر جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف میں کوئی فرق نہیں اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اس ترمیم کے باعث سابق وزیراعظم شوکت عزیز کا آئینی تسلسل محسوس ہوتے ہیں اور وہ کل تک افتخار محمد چوہدری کو اپنا چیف جسٹس کہا کرتے تھے' یہ تمام بیانات اپنی جگہ بہت شاندار ہیں لیکن وزیراعظم کا شاہکار بیان وہ تھا جس میں انہوں نے فرمایا تھا' ہم امریکہ کے غلام نہیں لہٰذا ہم کسی کو اپنی فضائی یا زمینی حدود کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دیں گے' میں نے جب وزیراعظم کے منہ سے یہ بیان سنا تھا تو پاکستان کی ساری حالیہ تاریخ میرے سامنے کھل گئی تھی اور یہ تاریخ چیخ چیخ کر قوم کی توجہ ان تمام واقعات کی طرف مبذول کرا رہی تھی جن سے غلامی کی باقاعدہ بو آتی تھی مثلاً آپ ابوالفراج کا واقعہ یاد کیجئے' ابوالفراج القاعدہ کا ایک سرگرم رکن تھا' پاکستان نے اسے 2 مئی 2005ء کو مردان سے گرفتار کیا اور امریکہ کے حوالے کر دیا جس کے بعد 6 مئی 2005ء کو امریکہ کے ایک اخبار میں ایک کارٹون شائع ہوا' کارٹون میں ایک امریکی فوجی دکھایا گیا' فوجی کے ہاتھ میں ایک کتا تھا' کتے کے اوپر پاکستان لکھا تھا' اس کے منہ میں ابوالفراج تھا اور امریکی فوجی کتے پر ہاتھ پھیر کر کہہ رہا تھا ''شاباش تم نے بہت اچھا کیا' چلو اب دونوں مل کر اسامہ بن لادن کو تلاش کرتے ہیں'' یہ کارٹون 8 اور 9 مئی کو پاکستانی اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا جس کے

بعد معاملہ قومی اسمبلی میں پہنچا اور قومی اسمبلی نے حکومت کو حکم دیا وہ امریکی اخبار کو معذرت کرنے پر مجبور کرے‘ حکومت نے دفتر خارجہ کی ذمہ داری لگائی‘ دفتر خارجہ نے امریکہ میں پاکستانی سفارتخانے کو لکھا اور پاکستانی سفارتخانے نے امریکی اخبار کو خط لکھ دیا لیکن امریکی اخبار نے معذرت کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد ہماری حکومت خاموش ہوگئی‘ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ اسی طرح صدر فاروق احمد لغاری کے دور میں حکومت نے رمزی یوسف کو امریکہ کے حوالے کیا تھا‘ اس وقت امریکہ اور پاکستان کے درمیان مجرموں کے تبادلے کا کوئی معاہدہ نہیں تھا‘ امریکی حکومت نے جب رمزی یوسف کو عدالت میں پیش کیا تو جج نے سرکاری وکیل سے پوچھا ’’پاکستان نے رمزی یوسف کو کس قانون کے تحت امریکہ کے حوالے کیا‘‘ وکیل نے قہقہہ لگایا اور شہادت کی انگلی پر انگوٹھا رگڑ کر بولا ’’پیسے کے قانون کے تحت‘ اگر پاکستانیوں کو پیسہ دے دیا جائے تو یہ اپنی ماں کو بھی بیچ دیتے ہیں‘‘ امریکی وکیل کی اس گستاخی پر بھی پوری قوم نے شدید احتجاج کیا‘ اس احتجاج سے مجبور ہو کر حکومت پاکستان نے امریکی وکیل سے معافی کا مطالبہ کیا لیکن اس وکیل نے آج تک ہم سے معافی نہیں مانگی لیکن ہم امریکی غلام نہیں ہیں۔ نائین الیون کے بعد رچرڈ آرمیٹج نے صدر پرویز مشرف کو دھمکی دی‘ تم لوگ ہمارا ساتھ دو ورنہ ہم پاکستان پر بمباری کر کے تمہیں پتھر کے زمانے میں دھکیل دیں گے‘ صدر مشرف نے فوراً رچرڈ آرمیٹج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ نائین الیون ہی کے بعد امریکہ نے ہم سے سات مطالبے کئے‘ امریکہ کا خیال تھا صدر پرویز مشرف ان میں سے تین یا چار مطالبے مان لیں گے مگر صدر مشرف نے فوراً امریکہ کے ساتوں مطالبات تسلیم کر لئے لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ نیٹو فورسز نے 29 جنوری 2008ء سے لے کر 14 نومبر 2008ء تک پاکستان کے قبائلی علاقوں پر میزائلوں کے 24 حملے کئے‘ ان حملوں میں 345 معصوم لوگ شہید ہوئے‘ ہم نے ہر حملے کی مذمت کی اور امریکہ نے ہماری ہر مذمت کا جواب حملے کی شکل میں دیا لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ 17 ستمبر کو امریکہ کے جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین ایڈمرل مائیک مولن نے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور آرمی چیف کو یقین دلایا ’’امریکہ پاکستان کی خودمختاری کا احترام کرے گا‘‘ مگر اسی شام امریکہ کے جاسوس طیاروں نے جنوبی وزیرستان میں میزائل داغ دیا لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ امریکی صدر جارج بش نے 29 جولائی کو وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور 24 ستمبر کو صدر آصف علی زرداری کو یقین دلایا ’’امریکہ پاکستان کی خودمختاری کا احترام کرے گا‘‘ مگر آج 17 نومبر تک کسی جگہ یہ احترام دکھائی نہیں دے رہا لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ 22 اکتوبر کو ہماری پارلیمنٹ نے امریکی حملوں کے خلاف مشترکہ قرارداد پاس کی‘ قرارداد کے تین گھنٹے بعد امریکہ نے شمالی وزیرستان میں میزائل داغ دیا لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ 29 اکتوبر کو ہم نے امریکی سفیر کو دفتر خارجہ میں طلب کر کے حملوں کے خلاف احتجاج کیا‘ امریکہ نے اس احتجاج کے دو گھنٹے بعد اپنے جاسوس طیارے پاکستانی فضائی حدود میں بھجوا دیئے لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ 2 نومبر کو

رچرڈ باؤچر اور ڈیوڈ پیٹریاس نے ہمیں تسلی دی' 4 نومبر کو وزیراعظم نے اعلان کیا ''امریکہ نے حملے روکنے کی ضمانت دے دی ہے'' مگر 5 نومبر کو واشنگٹن پوسٹ نے انکشاف کر دیا ''صدر زرداری اور امریکہ کے درمیان خفیہ انڈرسٹینڈنگ موجود ہے' پاکستان احتجاج کرتا رہے گا اور امریکہ حملے کرتا رہے گا'' لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ 11 نومبر کو وزیراعظم نے بیان دیا ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں مگر 12 نومبر کو لاہور میں امریکی قونصل جنرل نے انکشاف کر دیا ''امریکی حملے پاکستانی معلومات کے تحت ہو رہے ہیں'' لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ پاکستان اب تک اس جنگ میں 21 کھرب روپے کا نقصان کر چکا ہے' ہمارے قبائلی علاقوں میں 1562 فوجی شہید اور ساڑھے تین ہزار زخمی ہو چکے ہیں اور قبائلی علاقوں میں ہمارے ایک لاکھ 20 ہزار جوان لڑ رہے ہیں لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ ہم پچھلے چار ماہ سے امریکی حملوں کی مذمت کر رہے ہیں لیکن 14 نومبر تک پاکستان پر امریکی حملے ہو رہے ہیں اور ظاہر ہے ان حملوں کے باوجود بھی ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔

ہمارے وزیراعظم بہت سادہ ہیں' وہ یہ تک نہیں جانتے ہم جب امریکہ کی جنگ کو اپنی جنگ قرار دے رہے ہیں' ہم امریکہ سے جنگ کا بل وصول کر رہے ہیں' ہم امداد لینے کیلئے امریکہ کے دروازے پر بیٹھے ہیں' ہم پر امریکہ روزانہ حملے کرتا ہے' ہم ان حملوں پر احتجاج کرتے ہیں اور اس احتجاج کا نتیجہ مزید حملوں کی صورت میں نکلتا ہے' پاکستان میں امریکی ایمبیسی پارلیمنٹیرینز کو بریفنگ کیلئے دعوت نامے جاری کرتی ہے اور پاکستان کی وزارت خارجہ کو اطلاع تک نہیں دی جاتی' پاکستان آئی ایم ایف سے قرضہ لینے کیلئے امریکہ کی سفارش کراتا ہے اور پاکستان میں امریکی سفارتکاروں کو وائسرائے کا سٹیٹس حاصل ہوگا تو کیا وہ قوم امریکہ کی غلام نہیں ہوگی؟ ہم تسلیم کریں یا نہ کریں ہمارے حکمران امریکہ کو اپنا آقا مان چکے ہیں کیونکہ غلامی اور آزادی کا تعلق انسان کے ذہن' ضمیر اور دل سے ہوتا ہے اور جب کسی انسان اور کسی قوم کی سوچ' اس کا ضمیر اور اس کے دل کی دھڑکن آزاد ہو تو وہ نہ صرف آزاد ہوتی ہے بلکہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو غلام نہیں رکھ سکتی لیکن اگر آپ کی سوچ' آپ کا دل غلام ہے تو پھر آزادی محض رسی کا ایک ٹکڑا رہ جاتی ہے۔ آپ کی رسی جتنی لمبی ہو گی آپ بس اتنے ہی آزاد ہوں گے اور یہ حقیقت ہے ہم نے دو وقت کی روٹی اور چار دن کے اقتدار کیلئے اپنی سوچیں غلام کر دی ہیں چنانچہ امریکہ سے لے کر بھارت تک دنیا کا ہر ملک اب ہمارا آقا ہے' لوگ اب ہمیں ہمارے حصے کا پانی تک دینے کیلئے تیار نہیں ہیں اور دنیا میں بے بسی اور بے چارگی سے بڑی کوئی غلامی نہیں ہوتی اور ہم بے بس بھی ہو چکے ہیں اور بے چارے بھی لیکن اس بے چارگی اور بے بسی کے باوجود ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔

ہم ایٹم بم کھو دیں گے

ہم لوگ ابھی سعودی عرب ہی میں تھے کہ مولانا صوفی محمد کا بیان آ گیا۔ مولانا نے اپنے بیان میں جمہوریت کو غیر اسلامی' پاکستان کے عدالتی نظام کو غیر شرعی اور ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ میں اپیلوں کو حرام قرار دے دیا۔ مولانا نے نظام عدل ریگولیشن کو چاروں صوبوں میں پھیلانے کا اعلان بھی کیا۔ مولانا کے اس بیان کے بعد ایم کیو ایم کے خدشات درست ثابت ہو گئے۔ ایم کیو ایم پاکستان کی واحد سیاسی جماعت تھی جس نے 13 اپریل کو قومی اسمبلی میں نظام عدل ریگولیشن 2009ء کی مخالفت کی تھی' ایم کیو ایم کا کہنا تھا طالبان اب ملک کے دوسرے علاقوں کی طرف بھی بڑھیں گے' ہم لوگوں نے اس وقت ایم کیو ایم کے اس خیال کا مذاق اڑایا تھا' ہمارا خیال تھا ایم کیو ایم سیاسی ہوسے بازی کیلئے یہ ''اسٹنٹ'' کر رہی ہے لیکن ایک ہی ہفتے میں ایم کیو ایم کے خدشات درست ثابت ہو گئے۔ میں اس وقت مکہ معظمہ میں تھا جب مولانا صوفی محمد مینگورہ میں 50 ہزار لوگوں سے خطاب کر رہے تھے' مولانا کے خطاب کے مندرجات ہم تک پہنچے تو میں نے اپنے ایک ساتھی سے عرض کیا ''طویل جدوجہد کے بعد سوات میں قیام امن کی ایک صورت نکلی تھی' سوات میں شریعت کے نفاذ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا لیکن افسوس مولانا کے بیان کے بعد صورتحال دوبارہ ری ورس ہو جائے گی''۔ میرے ساتھی نے تائید میں سر ہلا دیا۔

ہمیں ماننا پڑے گا مولانا صوفی محمد کے بیان نے چاولوں کی پکی پکائی دیگ ریت پر الٹ دی ہے اور اگر مولانا اور ان کے ساتھی اس قسم کے بیانات کے بجائے نبی اکرم ﷺ کی سنت پر عمل کرتے' یہ لوگ نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کی سلطنت کی طرح سوات میں ایسی ریاست کی بنیاد رکھنے کی کوشش کرتے جس میں امن ہوتا' روزگار ہوتا' سکون ہوتا' مساوات ہوتی' عدل ہوتا' خوشحالی ہوتی' علم ہوتا اور دنیا کی تمام سہولتیں لوگوں میں مساوی تقسیم ہوتیں تو اس نظام کو کراچی تک پہنچتے دیر نہ لگتی' یہ لوگ اگر سوات کو ملک کا کرائم فری زون بنا دیتے' متمدن اور پر سکون علاقہ بنا دیتے تو اسلام کے تمام داعیوں کا سر بھی فخر سے بلند ہو جاتا اور یہ ماڈل بھی آگے بڑھتا لیکن ان لوگوں نے سوات پر توجہ دینے کی بجائے ملک کے دوسرے حصوں کو دھمکانا شروع کر دیا۔ انہوں نے مرکزی نظام کو للکارنا شروع کر دیا چنانچہ اس کے نتیجے میں وہ لوگ بھی ان سے دور ہو گئے جو 20 اپریل تک ان کے حامی تھے۔ میں اس سلسلے میں میاں نواز شریف' اے این پی اور میڈیا کی مثال دوں

گا۔ میاں نواز شریف نفاذ شریعت کے حامی تھے' یہ سوات اور فاٹا میں امن بھی چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں علاقے کے عوام کے جائز مطالبات ماننے کے بھی حامی تھے لیکن مولانا صوفی محمد کے بیان کے بعد میاں نواز شریف نے 20 اپریل کو انٹرویو دیتے ہوئے پہلی بار ان لوگوں سے الگ ہونے کا تاثر دیا۔ میاں صاحب کا کہنا تھا پاکستان کے تمام سیاستدانوں کو متحد ہو جانا چاہئے کیونکہ طالبان سوات کے بعد دوسرے علاقوں پر بھی کنٹرول چاہتے ہیں۔ اس قسم کی صورتحال کا شکار اے این پی بھی ہے' عوامی نیشنل پارٹی نے پاکستان پیپلز پارٹی سے بزور بازو یہ معاہدہ منوایا تھا' اے این پی نے یہ دھمکی تک دی تھی کہ اگر حکومت نے سوات معاہدے کی توثیق نہ کی تو ہم حکمران اتحاد سے الگ ہو جائیں گے لیکن مولانا صوفی محمد کے بیانات کے بعد اے این پی کے ارکان بھی شرمندہ شرمندہ پھر رہے ہیں اور ان کے لئے نظام عدل ریگولیشن کا دفاع مشکل ہو گیا ہے۔ ہم جیسے میڈیا پرسنز کیلئے بھی مولانا کا بیان حیران کن تھا' ہم لوگوں نے ہمیشہ شریعت کا مطالبہ کرنے والوں کا ساتھ دیا کیونکہ ہم یہ سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ مسلمان کی حیثیت سے شریعت کی پابندی اور اسلام کے نظام عدل کا نفاذ ہم پر فرض ہے اور جو لوگ اس کا مطالبہ کرتے ہیں وہ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں اور ہمیں ان لوگوں کا ساتھ دینا چاہئے۔ ہم لوگ مجاہدین اور طالبان کی بھی حمایت کرتے تھے کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں یہ لوگ مسلمان بھی ہیں' پاکستانی بھی ہیں اور انسان بھی ہیں چنانچہ ہمیں انہیں تمام حقوق بھی دینے چاہئیں' ان کے جائز مطالبات بھی ماننے چاہئیں۔ صدر پرویز مشرف جب ان لوگوں کی داڑھیوں' نمازوں اور امریکہ مخالف بیانات پر ان کا مذاق اڑاتے تھے تو ہم جنرل کی بھرپور مخالفت کرتے تھے۔ ہمارا کہنا تھا کسی شخص کو صرف نمازوں اور داڑھیوں کی بنیاد پر معاشرے کے ایک بہت بڑے طبقے کو دہشت گرد' شدت پسند یا ملکی سلامتی کے خلاف قرار دینے کا حق حاصل نہیں۔ یہ لوگ بھی اتنے ہی پاکستانی' مسلمان اور انسان ہیں جتنے صدر پرویز مشرف' شوکت عزیز اور چودھری شجاعت حسین ہیں چنانچہ ہمیں ان لوگوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہئے' وغیرہ وغیرہ۔ ہم لوگوں نے سوات معاہدے اور نظام عدل ریگولیشن کا بھی دفاع کیا۔ میرا ذاتی خیال تھا اگر ایمش کمیونٹی امریکہ کے اندر اپنی روایات' قوانین اور مذہبی طرز معاشرت کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں تو ہم سوات کے لوگوں کو سوات اور فاٹا کے لوگوں کو فاٹا میں اپنی طرز معاشرت' قوانین اور روایات کے مطابق رہنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ ہم لوگ یہ بھی کہتے تھے پشتونوں اور قبائلیوں کے ہتھیار دہشت گردی نہیں ہیں' یہ ان کی صدیوں پرانی روایت ہیں اور اس روایت سے ملکی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں مگر مولانا صوفی محمد کے بیانات اور طالبان کی بونیر کی طرف نقل مکانی کے بعد اب ہمارے لئے بھی ان لوگوں کا دفاع مشکل ہو گیا ہے۔

ہم لوگ سعودی عرب میں تھے تو ہم نے مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ کے صحن میں تمام فرقوں کے لوگوں کو اکٹھے نماز پڑھتے دیکھا' ایک ہی صف میں کھڑے لوگ مختلف انداز سے ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے' کسی نے پیٹ پر ہاتھ باندھ رکھے تھے' کسی کے ہاتھ ناف پر تھے' کسی نے ہاتھ چھوڑ رکھے تھے' کسی

کے ٹخنے ننگے تھے' کسی کی شلوار نے اس کی ایڑھیاں ڈھانپ رکھی تھیں' کسی کے پاؤں کے درمیان زیادہ فاصلہ تھا' کسی نے پاؤں جوڑ رکھے تھے' کسی نے احرام باندھ رکھا تھا' کوئی شلوار قمیص میں ملبوس تھا' کسی نے پتلون پہن رکھی تھی' کسی کے سر پر سبز پگڑی تھی' کسی نے سیاہ پگڑی باندھ رکھی تھی' کسی نے ٹوپی پہن رکھی تھی اور کسی کا سر ننگا تھا' کوئی اللہ اکبر کی آواز پر فوراً رکوع اور سجدے میں چلا جاتا تھا اور کوئی رکوع اور سجدے سے پہلے اپنے ہاتھ کانوں تک لے جاتا تھا' ایک ہی امام کی آواز پر خانہ کعبہ کے سامنے مرد جھکتے تھے اور اسی حرم شریف کی حدود میں عورتیں بھی اسی امام کی اللہ اکبر پر سجدہ کرتی تھیں۔ حرم شریف میں تمام عورتوں نے اپنے سر اور بدن ڈھانپ رکھے تھے لیکن ان کے چہرے اور ایڑھیوں تک پاؤں ننگے تھے۔ مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ کی طرف بڑھنے والی کسی خاتون کے ساتھ کوئی محرم نہیں تھا' عورتیں محرم کے بغیر حرم شریف اور مسجد نبوی ﷺ کے گرد آباد بازاروں میں بھی تنہا گھوم رہی تھیں' خانہ کعبہ اور مسجد نبوی ﷺ کے باہر عورتوں نے ٹھیلے بھی لگا رکھے تھے' یہ سوداگر عورتیں تھیں اور حرم شریف میں آنے والے مرد حضرات بھی ان سے چیزیں خرید رہے تھے اور اس سارے ماحول میں کسی کا اسلام خطرے میں نہیں تھا۔ سعودی عرب میں بازار بھی کھلے تھے' ٹیلی ویژن چینل بھی چل رہے تھے' ڈش انٹینا بھی لگا تھا' سی ڈیز کی دکانیں بھی تھیں' مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ کے بالکل سامنے حجام کی دکانیں بھی تھیں اور لوگ حجاموں سے شیو بھی کرا رہے تھے۔ مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ میں کوئی سنی شیعہ کی طرف مڑ کر دیکھ رہا تھا اور نہ ہی کوئی شیعہ کسی سنی کو گھور رہا تھا' کوئی کسی سے کسی کا مسلک نہیں پوچھ رہا تھا' وہاں سب مسلمان اپنی اپنی روایت' اپنے اپنے مسلک اور اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کر رہے تھے۔

میں نے جب یہ سارے منظر دیکھے تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا اصل اسلام کون سا ہے؟ یہ اسلام یا پھر وہ اسلام جس کا نمونہ ہم سوات اور قبائلی علاقوں میں دیکھ رہے ہیں! اگر جبر اور سختی اسلام کا حصہ ہے تو پھر یہ سختی اور یہ جبر مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ میں دکھائی کیوں نہیں دے رہا۔ اگر پردہ' چار دیواری تک محدود رہنے اور شٹل کاک برقعے کا نام ہے اور اسلام میں عورتوں کے باہر نکلنے' تجارت کرنے اور محرم کے بغیر سفر کرنے پر پابندی ہے تو پھر عورتیں مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کی گلیوں میں کیوں گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں' یہ عورتیں حدود حرم میں تجارت کیوں کر رہی ہیں اور ان سے مرد کیوں خریداری کر رہے ہیں' اگر اسلام میں حجام کی دکانوں اور سی ڈیز کی گنجائش نہیں تو پھر خانہ کعبہ کے بالکل سامنے حجام کی دکانیں کیوں ہیں اور یہ حجام لوگوں کی شیو کیوں کر رہے ہیں؟؟۔ مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملا۔

مجھے نہیں معلوم مولانا صوفی محمد کے بیانات سے اسلام اور پاکستان کو کوئی فائدہ ہوتا ہے یا نہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں اس قسم کے بیانوں اور رائفل بردار شریعت سے اسلامی دنیا اپنی واحد ایٹمی طاقت سے ضرور محروم ہو جائے گی۔ ہم اسلام پائیں یا نہ پائیں لیکن ہم اپنا ایٹم بم ضرور کھو دیں گے۔

عورت

پوپ نے چھوٹے پادری کا امتحان لینے کے لیے اسے حضرت مریم علیہ السلام کی تعریف کا حکم دیا، پادری پوپ کے سامنے کھڑا ہوا، گاؤن کی پیٹی کھول کر دوبارہ باندھی، سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور پھر آنکھیں بند کر کے مخاطب ہوا۔ ''فادر عیسیٰ علیہ السلام کی ماں ہونے کے بعد مریم علیہ السلام کو کسی دوسری تعریف کی ضرورت نہیں۔''

ایک مدت بعد جب ڈاکٹر علی شریعتی سے اس سے ملتا جلتا سوال پوچھا گیا تو مفکر ایران نے مسکرا کر کہا، ''حضرت فاطمہؓ کے مقام نے ایک مدت تک مجھے پریشان رکھا، میں نے سوچا فاطمہ محمد ﷺ کی بیٹی ہیں لیکن پھر سوچا نہیں آپ کا اس کے علاوہ بھی ایک مقام ہے، سوچا فاطمہ حضرت علی علیہ السلام کی بیوی ہیں لیکن پھر سوچا نہیں آپ کا اس کے علاوہ بھی ایک مقام ہے، سوچا فاطمہ حسین علیہ السلام کی والدہ ہیں لیکن پھر سوچا نہیں آپ کا اس کے علاوہ بھی ایک مقام ہے۔ سوچا فاطمہ خاتون جنت ہیں لیکن پھر سوچا نہیں آپ کا اس کے علاوہ بھی ایک مقام ہے، قصہ مختصر صاحبو! میں سوچتا چلا گیا، سوچتا چلا گیا، جب تھک گیا تو بات یہیں پر آ کر ختم ہوئی ''فاطمہؓ از فاطمہؓ۔''

اکثر ایسا ہوتا، جب سرور دو عالم ﷺ گھر سے نکلنے لگتے تو وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے آپ ﷺ کی انگلی پکڑ کر ساتھ چلنے کی ضد فرماتیں، آپ ﷺ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیر کر فرماتے۔ ''بیٹا یہ خواہش کیوں؟'' تو وہ بھری آنکھوں سے محبوب خدا ﷺ کو دیکھ کر کہتیں: ''بابا جان مجھے خطرہ ہے کہیں اکیلا جان کر کفار آپ (ﷺ) کو نقصان نہ پہنچا دیں۔'' یہ بھی ہوتا تھا جب پائے مبارک میں کافروں کے بچھائے کانٹے چبھ جاتے، آپ ﷺ ناخن مبارک سے کھینچتے اور نوکیلے سرے ٹوٹ کر گوشت ہی میں رہ جاتے، تو وہ آپ ﷺ کا جوتا اتار کر اپنی ننھی انگلیوں سے پائے مبارک کے کانٹے چنتی جاتیں اور سسکیاں بھرتی جاتیں، اور یہ بھی ہوتا تھا، جب کفر کے غرور میں جتلا کئی آپ ﷺ کے سر مبارک پر آلودگی پھینک دیتے تو آپؓ اپنے ہاتھوں سے صاف کرتیں، گرم پانی سے سر مبارک دھوتیں اور روتی جاتیں اور یہ بھی ہوتا تھا جب آپ ﷺ سارے شہر کی نفرت سمیٹ کر گھر واپس آتے تو آپ ﷺ کا دستار مبارک کھول کر بالوں میں تیل لگاتیں، کنگھی کرتیں اور اپنی بھیگی ہوئی آواز میں کہتیں: ''بابا جان فکر نہ کریں ہمارا رب ہمارے ساتھ ہے۔''

باپ بیٹی میں انسیت بھی تو بہت تھی، آپؐ کی رخصتی کے بعد بھی کوئی ایسا دن نہیں گزرا، جب آپ ﷺ نے بیٹی کا دیدار نہ کیا ہو، آپ ﷺ کوشش کر کے اس راستے سے گزرتے جس پر حضرت علی ؓ کا گھر تھا، جب حضرت فاطمہؓ کی طبیعت ناساز ہوتی تو محبوب خدا ﷺ بے چین ہو جاتے تھے اور آپؓ تھیں بھی تو انوکھی، حضرت علیؓ کے گھر میں قدم رکھتے ہی سارے گھر کا کام سنبھال لیا، گھر میں جھاڑو دیتی تھیں، کنوئیں سے پانی لاتیں تھیں، جانوروں کو چارہ ڈالتی تھیں، آٹا پیستی تھیں، برتن دھوتی تھیں، کپڑے سیتی تھیں، کھجوریں صاف کرتی تھیں اور حضرت علیؓ کے ہتھیار تیز کرتی تھیں، جب بہت غربت تھی تو اس وقت بھی حسنؓ اور حسینؓ کو اس شان سے بنا سنوار کر گھر سے باہر بھیجتیں کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ دونوں مدینہ کے سب سے بڑے رئیس کے بچے ہیں۔

میں جب مقام فاطمہؓ کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے حیات اقبال کا وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے، جب شاعر مشرق نے اپنے استاد میر حسن کا نام شمس العلماء کے خطاب کے لیے پیش کیا، کمیٹی کے ارکان نے پوچھا ان کی تصنیف کیا ہے؟ علامہ اقبال نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا: ''میں ہوں ان کی تصنیف۔'' آپ اس واقعے کی روشنی میں مقام فاطمہؓ کی جستجو کریں تو آپ کو کربلا کے میدان میں کھڑے حسینؓ حضرت فاطمہؓ کے مقام کا تعین کرتے نظر آئیں گے، جن کے وں دن آج تک چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں'' ہاں میں ہوں فاطمہؓ کی تصنیف۔

یہ اعزاز بھی صرف فاطمہؓ بنت محمد ﷺ ہی کو حاصل ہے کہ بڑے سے بڑا گناہ گار، فاسق اور فاجر بھی دو نفل پڑھ کر ''خاتون جنت'' سے بارگاہ رسالت ﷺ، بارگاہ خداوندی میں سفارش کی درخواست کرے تو اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔

محترم قارئین! آج 8 مارچ ہے، حقوق نسواں کا عالمی دن، مجھے یقین ہے آج بھی گزشتہ برسوں کی طرح پاکستان کے تمام بڑے چھوٹے شہروں میں غیر ملکی خوشبویات سے معطر، الٹرا ماڈرن خواتین آزادئ نسواں کے سیمینار کریں گی، جن میں ہر مقررہ ''مردوں'' کے اس معاشرے پر خوب کیچڑ اچھالیں گی۔ عورت کے حقوق، عورت کی آزادی اور عورت کی برابری کے لیے نعرے لگائے جائیں گے۔ پاکستانی عورت کی مظلومیت ثابت کرنے کے لیے امریکہ، یورپ، آسٹریلیا اور مشرق بعید کی رپورٹوں کے حوالے دیے جائیں گے، زچگیوں کے دوران مرنے والی خواتین، خاوندوں سے پٹنے والی عورتوں اور گھروں سے بھاگنے والی لڑکیوں کی داستانیں سنائی جائیں گی، اس ملک جو غربت کے 127 ویں نمبر پر ہے جس کے 6 کروڑ 63 لاکھ 66 ہزار لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، کی عورت کا تقابل ''مس یورپ'' سے کیا جائے گا لیکن ان بھرے بھرائے ہالوں میں کوئی ایک خاتون بھی فاطمہؓ بنت محمد ﷺ کا ذکر نہیں کرے گی، جو بچی تھیں تو نسل انسانی کے سب سے بڑے انسان کے زخم دھوتی تھیں، جو لڑکی تھیں تو اپنے دور کے سب سے بڑے شجاع

کو زرہ بکتر پہناتی تھیں اور جو خاتون تھیں تو تاریخ کے سب سے بڑے شہید کی پرورش کرتی تھیں، اور جس نے زندگی سے، وقت سے، معاشرے سے عمر بھر کچھ نہیں لیا، اسے صرف دیا ہی دیا۔

سچ ہے "مردوں کی برتری" کے معاشرے میں آج عورت کو وہ مقام حاصل نہیں جو حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت علیؓ تک کے ادوار میں حاصل تھا لیکن اس کے باوجود یہ بھی سچ کہ اس کو جو پروٹوکول یہاں دیا جاتا ہے وہ شاید یورپ کی عورت کو ایک ہزار سال بعد بھی نصیب نہ ہو۔ آج بھی لوگ پرائی عورت کو دیکھ کر نظریں نیچی کر لیتے ہیں، بسوں میں ان کے لیے نشست خالی کر دیتے ہیں، ان کی موجودگی میں سگریٹ نہیں پیتے، ان سے عزت و احترام سے مخاطب ہوتے ہیں، آج بھی لوگ گھر میں بیٹی پیدا ہونے پر شراب چھوڑ دیتے ہیں جوا اور بری صحبت ترک کر دیتے ہیں، آج بھی لفظ "بھائی" سن کر لوگوں کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ آج بھی لوگ عورت سے زیادتی پر باہر آ جاتے ہیں، آج بھی لوگ ایک زنانہ چیخ پر اپنے ہم جنس کو پیٹتے دیر نہیں لگاتے، آج بھی لوگ بیوی کو طلاق دینے اور ماں، بہن اور بیٹی سے تلخ کلامی کرنے والے مرد کو پاس نہیں بیٹھنے دیتے، آج بھی گھروں میں بوڑھی ماؤں، دادیوں اور نانیوں کو "نیوکلیس" کی حیثیت حاصل ہے، ہاں آج بھی اس "قدامت پسند" معاشرے میں عورت اتنی محفوظ ہے جتنی یورپ کے جنگلی معاشروں میں کبھی نہیں تھی۔

پھر سوچنے کی بات ہے، یہ عورتیں کون ہیں جو اسلام آباد میں بیٹھ کر ان "فاطماؤں" کے لیے اس یورپ جیسی آزادی طلب کر رہی ہیں، جہاں عورت، عورت نہیں انڈسٹری ہے، جہاں مرد وراثت میں حصہ داری، ٹیکس اور اخراجات کے ڈر سے پوری زندگی کی "صحبت" کے بعد بھی عورت کو بیوی کا درجہ نہیں دیتے، جہاں ایک ہی عورت کے تین بچوں کے رنگ اور ناک نقشے آپس میں نہیں ملتے، جہاں عورت بیٹی، بہن، بیوی اور ماں نہیں صرف "پارٹنر" ہے۔

جب فیروز خان نون نے کسی مسئلے پر انگریز سرکار کو چنگیز خان جیسے حملے کی دھمکی دی تو نہرو نے مجلس احرار کے ایک جلسے میں کہا تھا۔ "افسوس چنگیز خان کا ذکر کرنے والے بھول گئے ان کی تاریخ میں ایک عمر فاروقؓ بھی تھا۔"

ہاں آج جب یہ چند نا سمجھ خواتین اس مغرب جیسی آزادی طلب کرتی ہیں جس میں اب طلاق، جنس اور ناجائز بچوں کے سوا کچھ نہیں تو میں سوچتا ہوں، افسوس میڈونا اور الزبتھ ٹیلر جیسی زندگی کی خواہش مند عورتیں یہ بھول گئیں، ان کی تاریخ میں ایک فاطمہؓ بھی تھی اصلی اور سچی عورت۔

کچھ اپنے بارے میں

ظاہر ہے، جس شخص کو آپ ہفتے میں چار پانچ بار پڑھتے ہوں، جس کی تصویر (جیسی بھی ہے) دیکھتے ہوں اور جس کی سچی جھوٹی باتوں پر یقین کرتے ہوں، اس کے بارے میں جاننے کی خواہش بالکل فطری ہے، لہٰذا میں آپ لوگوں کے ان خطوط اور ٹیلی فون کالز سے پریشان نہیں ہوتا جن میں آپ میرے بارے میں ''ٹوہ'' لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل میں بھی آپ لوگوں سے مختلف ''چیز'' نہیں ہوں، میرے بھی لکھنے والوں کے بارے میں یہی احساسات تھے جو آپ کے ہیں۔ میں بھی ان لوگوں سے ملنے کی شدید خواہش رکھتا تھا (اب بھی ہے) جنہیں میں باقاعدگی سے پڑھتا تھا، مثلاً بچپن میں جب میں اشتیاق احمد کے جاسوسی ناول پڑھتا تھا تو گھر سے بھاگ کر ان کے پاس جانے کے منصوبے بناتا رہتا تھا اب یہ اشتیاق احمد صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ میرے پاس کبھی اتنے پیسے جمع نہ ہو سکے جن سے میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا، لہٰذا اشتیاق صاحب بھی بچ گئے اور میں بھی۔ اسی طرح میں مرحوم ممتاز مفتی سے اتنا متاثر تھا کہ میں نے ان کے بارے میں تمام ظاہری و باطنی تفصیلات جمع کرلیں۔ 93ء میں جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ آج اس وقت ان کی عمر اتنے سال، اتنے مہینے، اتنے دن اور اتنے گھنٹے ہے۔ آج تک انہوں نے اتنے افسانے لکھے، اتنے معاشقے کئے اور انہیں اتنی بیماریاں ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مجھے ہفتے میں سو سے زائد خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں 90 فیصد احباب کا ایک ہی مطالبہ ہوتا ہے کہ میں اپنی موجودہ تصویر شائع کروں، غالباً میرے یہ بہی خواہ مجھے ہر صورت گنجا دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری گردن میں رعشہ اور میری ٹھوڑی پر گوشت لٹکا دیکھنے کے متمنی ہیں، لیکن افسوس میں ان کی یہ خواہش پوری نہیں کرسکتا، کیونکہ میں اپنی بے شمار بد اعتدالیوں، فضول خرچیوں، اور پریشانیوں کے باوجود بڑی مشکل سے 30 برس کا ہوا ہوں، لہٰذا اگر انصاف کیا جائے تو میں اپنی تصویر سے بھی سال چھ مہینے چھوٹا ہی نکلوں گا۔ ویسے بعض اوقات میں اپنے ان احباب کا دل رکھنے کے لیے اپنی دس بیس برس پرانی تصویر شائع کرنے کے بارے میں سوچنے بھی لگتا ہوں لیکن پھر اس خدشے سے رہ جاتا ہوں کہ کہیں گھٹنوں کے بل چلتے بچے، نیکر پہن کر دھوپ میں کھڑے لڑکے یا ایک میلے کچیلے اور تیل میں چپڑے نوجوان کی تصویر پڑھنے والوں کی طبع سلیم پر گراں ہی نہ گزرے، لہٰذا جیسا ہوں جہاں ہوں کی صورت میں حاضر ہوں، لہٰذا اگلے دس پندرہ برس تک اسی تصویر سے

کام چلائیں۔
قارئین میرے بیک گراؤنڈ کے بارے میں متجسس ہیں، تعلیم کہاں تک پائی، نوکری کہاں کہاں کی، اب کہاں رہتے ہیں، کیا کیا پڑھتے ہیں اور بچے کتنے ہیں، اس قسم کے سوالات بھی پوچھتے ہیں، تو جناب "بیک گراؤنڈ" کچھ ایسی نہیں کہ اس پر فخر کیا جائے۔ خالصتاً دیہی پس منظر سے تعلق ہے، ضلع گجرات کے ایک چھوٹے سے قصبے لالہ موسیٰ کا رہنے والا ہوں، جس کی دو ہی چیزیں مشہور ہیں ایک ریلوے جنکشن اور دوسرا کاوش بٹ۔ تعلیم کا آغاز ماشاء اللہ ٹاٹ سکول سے کیا، سارا بچپن تھوک سے سلیٹیں صاف کرتے، قطار میں کھڑے ہو کر پہاڑے یاد کرتے، ماسٹروں کے ڈنڈے کھاتے، سکول سے بھاگتے، مرغا بنتے اور تختیاں سکھاتے گزرا، 84ء میں میٹرک کیا، والد صاحب کم پڑھے لکھے تھے، لہٰذا ان کا خیال تھا صرف ڈاکٹروں اور انجینئروں کو ہی پڑھا لکھا سمجھا جاتا ہے، چنانچہ ان کی خواہش (آپ ڈر بھی کہہ سکتے ہیں) کے احترام میں ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا لیکن خوش قسمتی سے فیل ہو گیا۔ یوں مجبوراً ایف اے کا پرائیویٹ امتحان دیا اور پاس ہو گیا۔ بورڈ میں چھوٹی موٹی پوزیشن بھی آ گئی۔ بی اے، ایف سی کالج لاہور سے کیا۔ ایم اے (ابلاغیات) اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے کیا۔ کچھ معیار تعلیم کی پستی کام آئی اور کچھ اس برس پرچے بھی آسان تھے، لہٰذا یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن آ گئی، گولڈ میڈل مل گیا واپس لاہور آ کر "چکر" چلایا اور پنجاب یونیورسٹی کے "لاء ڈیپارٹمنٹ" میں داخلہ لے لیا، لیکن نتیجہ ایف ایس سی سے مختلف نہ نکلا۔

نوکری کی پہلی درخواست "روزنامہ خبریں" میں دی (ابھی اخبار نہیں نکلا تھا) ٹیسٹ ہوا تو فیل ہو گیا، لہٰذا ضیاء شاہد صاحب کو پھر آئیں گے، کی "دھمکی" دے کر چلا آیا۔ انہی دنوں نوائے وقت لاہور میں ایک جگہ نکلی تو عباس اطہر صاحب کی مہربانی سے اونٹ کو خیمے میں سر چھپانے کا موقع مل گیا۔ اپنے توصیف احمد خان صاحب نیوز ایڈیٹر تھے ماشاء اللہ مجھ سے بہت ہی تنگ تھے لیکن نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے اصول کے باعث زیادہ بے عزتی نہیں کرتے تھے۔ دسمبر 92ء میں اسلام آباد سے روزنامہ پاکستان نکلا تو برادرم اسلم خان کی انگلی پکڑ کر اس بامراد شہر میں آ گیا۔ شروع شروع میں ہم دس لوگ دو کمرے کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ دن میں ایک بار کھانا کھاتے تھے چار چار روز بعد شیو کرتے تھے، ساری رات کام کرتے تھے اور دن بھر سوتے تھے، تقریباً پانچ برس اس اخبار میں مختلف حیثیتوں سے کام کیا، سب ایڈیٹر رہا، ڈیسک انچارج رہا، شفٹ انچارج رہا، نیوز ایڈیٹر بنا پھر آخری ایک سال میگزین ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا، اس ادارے میں اتنے برس گزارنے کی واحد وجہ جناب پرویز ذوالفقار (ایگزیکٹو ایڈیٹر) تھے، جن کی محبت پاؤں کی بیڑیاں بنی رہی۔ جون 97ء کو ایک قومی سطح کی خبر رساں ایجنسی سے بطور ایڈیٹر وابستہ ہو گیا۔ یکم جولائی 97ء کو روزنامہ "خبریں" میں کالم لکھنا شروع کیا، 7 اگست 98ء تک اس ادارے سے وابستہ رہا پھر وہی کچھ ہوا جو عموماً ایسے کاموں میں ہوتا ہے لہٰذا وہاں سے باعزت بری ہو گیا، 9 اگست 98ء کو روزنامہ "اساس" راولپنڈی اور "امت" کراچی میں سینڈیکیٹ

کالم شروع کیا، کوئی ایک کالم جناب میر شکیل الرحمٰن صاحب کی نظر سے گزرا انہیں پسند آیا تو انہوں نے اسی وقت اسلام آباد سے کراچی بلا لیا، آدھ گھنٹے کی ملاقات میں بہت کچھ طے ہو گیا جس کے بعد میں نے واپس اسلام آباد آ کر کام شروع کر دیا، آخری اطلاعات آنے تک میں روزنامہ ''جنگ'' ہی کا ملازم ہوں۔

اس مختصر تجرباتی زندگی میں کچھ لوگوں کے بہت احسان ہیں، جن کے بوجھ سے گردن سیدھی نہیں ہوتی۔ فیصلہ ہے اگر باقی زندگی یہ قرض اتارتے گزر جائے تو ضائع ہونے سے بچ جائے گی۔ ان میں بھائی رفیق افغان (امت کراچی کے چیف ایڈیٹر) ہیں انہوں نے اتنی محبت دی جتنی ایک بڑا بھائی ہی دے سکتا ہے۔ جناب چوہدری قدرت اللہ ہیں (روزنامہ پاکستان کے ایگزیکٹو ایڈیٹر) انہوں نے اولاد کی طرح محبت دی، ان کے سامنے آنکھ اٹھتی ہے اور نہ زبان کھلتی ہے۔ جناب ہارون الرشید ہیں ان کی انسپائریشن نہ ہوتی تو شاید مجھے پوری زندگی اپنی اس صلاحیت کا علم نہ ہوتا۔ جناب خلیل ملک ہیں انہوں نے ہی مجھے کالم نویس بنایا جو کچھ ہوں ان کی محبت اور رہنمائی سے ہوں۔ جناب خوشنود علی خان ہیں جب سارے دروازے بند تھے تو انہوں نے اپنے سارے دروازے کھول کر میرا استقبال کیا۔ جناب ضیاء شاہد ہیں جنہوں نے لوہے کے اس ٹکڑے کو سونا بنا دیا۔ جناب نسیم انور بیگ ہیں جن کے دماغ سے سوچتا ہوں، جن کی محبت سے دیکھتا ہوں اور جن کی جرأت کی تلوار سے لڑتا ہوں، جناب پروفیسر احمد رفیق ہیں، انہوں نے مجھ جیسے دہریے کو کان سے پکڑ کر خدا کے سامنے لا بٹھایا اور آخر میں آپ سب لوگ ہیں جن کے خطوط، جن کی دعائیں مجھے ہر پل احساس دلاتی ہیں کہ میں صحرا کے ٹیلوں سے مخاطب نہیں ہوں، جیتے جاگتے انسانوں سے گفتگو کر رہا ہوں اور سب سے بڑھ کر میرا وہ رب ہے، جس کے فیصلے اٹل ہیں جس کو سب خبر ہے کہ کس نے کب، کہاں اور کیا کرنا ہے۔

جب آپ میری تحریروں کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے بے اختیار مرحوم ممتاز مفتی یاد آ جاتے ہیں جو اکثر کہا کرتے تھے۔ ''لکھنا ایک کام ہے اسے دوسرے تک پہنچانا دوسرا کام ہے، میں لکھ سکتا ہوں لیکن دوسروں تک پہنچا نہیں سکتا، کیونکہ یہ کام خدا نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے وہ جس لفظ کو چاہے سینوں کے پار کر دے اور جس کتاب کو چاہے ردی کی دکانوں پر ذلیل و خوار کر دے۔''

ہاں، محترم قارئین اس ملک میں ہزاروں لوگ لکھ رہے ہیں لیکن ان کی تحریریں اثر سے خالی ہیں اس کی ہرگز یہ وجہ نہیں کہ وہ برا لکھتے ہیں، محنت نہیں کرتے یا ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں، ان میں اکثر ''کرافٹس مین شپ'' کی صلاحیت سے مالا مال ہیں، لیکن بدقسمتی سے ان کے لفظوں کو پہنچنے کی اجازت نہیں ملی، انہیں تیر بن کر سینوں میں اترنے کا حکم نہیں ملا......بس اتنی سی بات ہے باقی سب لفظوں کا گورکھ دھندہ ہے۔

(نوٹ: یہ کالم روزنامہ خبریں میں شائع ہوا، اسے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔)

فرسودہ لوگ

ابا جی کی آنکھ عموماً مدھانی کی "کھرر کھرر" یا چکی کی "گوں گوں" سے کھلتی تھی، جس کے بعد وہ ایک طویل جمائی اور طویل ترین انگڑائی کا ناشتہ کر کے ڈنگر کھولتے اور "باہر" چلے جاتے، اگر کبھی گھر کے حالات بہتر ہوتے تو "بے جی" منہ اندھیرے چولہا جلا کر بیٹھ جاتیں جونہی کچے اپلوں کا دھواں ابا جی کے نتھنوں سے ٹکراتا وہ دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ آنکھیں ملتے ہوئے آتے اور صحن کے ایک کونے میں بنے کچے چولہے کے گرد آ بیٹھتے، جہاں بے جی روٹی ڈالنے سے پہلے توے کے کنارے پر مکھن کی "ڈلی" رکھتیں جو حرارت سے تیرتی ہوئی عین درمیان آ کر ٹھہر جاتی تو "بے جی" توے پر روٹی بچھا دیتیں اور ایک شوں کے ساتھ تازہ مکھن کی مہک پورے صحن میں پھیل جاتی اور جب وہ یہ "پراٹھا" لسی کے پیالے کے ساتھ چباتے تھے تو ان کے منہ میں دیسی گھی کے ساتھ ساتھ کبھی گیلی لکڑی اور کبھی کچے اپلوں کا کڑوا دھواں بھی گھلنے لگتا تھا لیکن روٹی ملنے کی خوشی میں کڑوے دھوئیں کی کسے پروا ہوتی تھی اور ہاں اس "بریک فاسٹ" کے بعد وہ اپنے سنے ہوئے ہاتھ گندے کرتے سے صاف کرتے تھے یا کبھی کبھار خوشی زیادہ ہوتی تو انگلیاں بالوں میں بھی پھیر لیتے تھے۔

روز سکول جانے سے پہلے وہ دیسی صابن سے منہ دھوتے تھے اور باقی سارا دن خشکی دور کرنے کے لیے ہاتھوں سے چہرہ رگڑتے رہتے تھے۔ گرمیوں میں صرف دھوتی باندھ کر باقی جسم قدرت کے "ایئر کنڈیشنڈ سسٹم" کے حوالے کر دیتے تھے، جبکہ سردیوں میں بغلوں کو "ہیٹر" سمجھ کر سارا سارا دن اور ساری ساری رات ہاتھ ان میں دبائے پھرتے تھے۔ ان کا سکول پانچ میل دور تھا لہٰذا وہ پانچ میل جاتے اور پانچ میل پیدل واپس آتے۔ دس میل کی اس "ٹورازم" کے دوران اگر ان کے "لنچ" کا وقت ہو جاتا تو وہ راستے ہی میں کسی کھیت سے گنے توڑ کر چوس لیتے تھے، کبھی قسمت زیادہ مہربان ہوتی تو راستے میں مولیاں، شلجم اور گاجریں بھی ہاتھ لگ جاتی تھیں، جنہیں وہ بغیر دھوئے محض جھاڑ پونچھ کر کھا جاتے اور اس مولی گاجر کے ساتھ عموماً مٹی کا ایک مناسب حصہ بھی ان کے پیٹ میں چلا جاتا تھا لیکن کچھ فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ان دنوں مٹی پیٹ میں جا کر پتھری نہیں بنتی تھی اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کھیتوں کے والی وارث "موقع واردات" پر موجود ہوتے تو مجبوراً ابا جی کو اپنا لنچ بیروں تک محدود رکھنا پڑ جاتا۔

ابا جی کی تمام تر تعلیمی قابلیت تین کتابوں، ایک تختی اور ایک سلیٹ پر مشتمل تھی اگر کسی سال بد قسمتی

سے ابا جی پاس ہو جاتے تو مجبوراً کتابیں بدلنا پڑ جاتیں لیکن تختی اور سلیٹ نے دوسری جماعت تک ان کا ساتھ دیا۔ یہ محبت مزید آگے بھی چل سکتی تھی لیکن دوسری جماعت کے بعد بزرگوں نے تعلیم جیسا ''غیر پیداواری'' شغل جاری رکھنے کی اجازت نہ دی۔ ابا جی بتاتے ہیں ان دنوں ماسٹر کاغذ اور قلم کے بجائے ڈنڈوں اور چھتروں سے پڑھایا کرتے تھے، اس لیے باہمت طالب علم ہاؤ کے بجاؤ طالب حسین بننا زیادہ پسند کرتے اور جو ایک آدھ کمزور اور بزدل نوجوان بھاگنے کی جرأت نہ کرتا اسے مجبوراً پڑھنا پڑ جاتا..... زندگی کے ایک طویل عرصے تک انہوں نے نصاب کی چند کتابوں کے سوا کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی۔ جب وہ بیس برس کی عمر میں پہلی بار شہر آئے تو ایک بک سٹال پر رنگین کاغذوں پر چھپی سینکڑوں کتابیں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

ابا جی کو جوتوں اور کپڑوں کا جوڑا سال میں ایک بار ملتا تھا لہٰذا وہ جوتوں کو عموماً حفاظت خود اختیاری کے تحت پاؤں میں کم اور بغل میں زیادہ رکھتے تھے۔ رہے کپڑے تو وہ چند ہی ہفتوں میں درختوں پر چڑھنے اور ڈنگروں کے پیچھے بھاگنے سے ''لیرو لیر'' ہو جاتے، جنہیں ''بے جی'' بڑی مہارت سے سی کر دوبارہ قابل استعمال بنا دیتیں۔ سکول سے واپسی پر چارہ کاٹنا، جوہڑ پر بھینسوں کے ''غسل'' کا اہتمام کرنا ''کچن'' کے لیے لکڑیاں چننا اور کٹائی کے موسم میں سکول سے طویل چھٹیاں کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ کبھی کسی غفلت کے باعث ان سے یہ ذمہ داری نبھانے میں کوتاہی ہو جاتی تو ان کے ابا جی، جنہیں سب ''چاچا'' کہتے تھے فوری انصاف کی سرسری عدالت لگا کر موقع پر ہی انصاف فراہم کر دیتے تھے، جس کا احساس ابا جی کو ایک طویل عرصے تک اٹھتے بیٹھتے ہوتا رہتا تھا۔

ابا جی کا ''ڈنر'' بھی بڑا شاندار ہوتا تھا اکثر سب بہن بھائیوں کو لکڑی کی طرح سخت روٹی، کچے دودھ کے ساتھ نگلنا پڑتی تھی۔ کبھی کبھار انہیں ساگ، مولی، کدو اور بینگن کا سالن بھی مل جاتا تھا، لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ ابا جی مرغی نہیں کھاتے تھے، لیکن یہ الگ بات کہ ایسا موقع عموماً گاؤں میں ''رانی کھیت'' کی وبا پھیلنے پر ہی آتا تھا۔ تاہم اس ''تھری کورس ڈنر'' سے ہٹ کر ان کی متوازن اور مسلسل خوراک کا ذریعہ چوری کے وہ انڈے ہوتے تھے، جنہیں وہ مرغی کے نیچے سے اٹھا کر کچے ہی ''پی'' جاتے تھے۔

ابا جی نے 14 سال کی عمر میں پہلی بار ''روپیہ'' دیکھا انہیں کبھی روپے پیسے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کیونکہ جب بھی ''عیاشی'' کا پروگرام بنا گاؤں کے واحد دکاندار کو دانوں کا ''ٹوپہ'' دے کر بتاشے، گڑ، مکھانے یا مرونڈا لے لیا اور دنوں تک انہیں چھپا چھپا کر کھاتے رہے۔ 20 برس کی عمر میں جب تاپ چڑھا تو پہلی بار ڈاکٹر کے روبرو حاضر ہوئے لیکن پکے مسلمان ہونے کے باعث ''کافروں'' کی دوائیں کھانے سے انکار کر دیا اور اگلے ہی روز تندرست ہو گئے۔ بھینسیں اور گدھے ابا جی کی ''انٹرسٹی ٹرانسپورٹ'' ہوتی تھی اور کبھی کبھار اگر دوسرے گاؤں یا شہر جانا پڑتا تو گھوڑے یا اونٹ سے وہی کام لیا جاتا جو آج کل ٹرکوں سے لیا جاتا ہے۔ گاؤں میں ایک نائی بھی تھا جو پورے گاؤں کی شیو بناتا، بچوں کی ''مسلمانیاں'' کرتا، رشتے کراتا، شادی اور مرگ پر کھانا پکاتا، ایک گھر سے دوسرے گھر اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پیغام رسانی کرتا اور فارغ وقت

میں چودھریوں کے سکینڈل گھڑتا گویا یہ نانی اباجی کا ''سی این این'' تھا۔ تاہم اباجی کا خیال ہے اس محرومی اور تمام تر غریبانہ پس منظر کے باوجود اس دور میں کوئی ''کمپلیکس'' نہیں تھا کبھی کسی کو کسی سے شکایت نہیں ہوئی کبھی کسی کو حالات سے شکوہ نہیں ہوا، دکھ آیا تو ''یا اللہ خیر'' کا نعرہ لگا کر اسے ایک طرف جھٹک دیا، خوشی آئی تو ''شکر الحمدللہ'' کہہ کر اسے بھی بھول گئے، نہ ماتم ہوتا تھا اور نہ ہی بتاشے چلتے تھے۔

آج کل اباجی میرے پاس اسلام آباد ہیں۔ رات دیر گئے جب سارا شہر سو جاتا ہے تو میں واپس آتا ہوں لیکن گاڑی کا ہارن بجنے سے پہلے ہی انہیں دروازے پر پاتا ہوں، صبح جب ناشتے کے لیے کمرے سے باہر نکلتا ہوں تو انہیں ٹیبل پر بیٹھا پاتا ہوں۔ ان دونوں موقعوں پر ان کا بس ایک ہی کام ہوتا ہے مجھے گھورتے رہنا، میں جب ان سے اس توجہ خاص کی وجہ سے پوچھتا ہوں تو قہقہہ لگا کر کہتے ہیں۔

''یار جہاں تک میرا خیال ہے تمہاری عمر 29،28 سال ہے لیکن تمہارے چہرے پر 60 برس کی سنجیدگی ہے، تم نے کبھی شیشے میں اپنی شکل دیکھی، ابھی سے تمہارے چہرے پر جھریاں پڑنا شروع ہوگئیں، تمہارے سر میں سفید بال ہیں، تمہاری گردن پنڈولم بنتی جا رہی ہے، تمہاری ٹانگیں ہر وقت ہلتی رہتی ہیں، غصہ تمہاری ناک پر دھرا رہتا ہے، چڑچڑے اتنے ہو چکے ہو کہ بچوں کی باتیں تک تمہارے اعصاب پر بوجھ بن جاتی ہیں، گھر میں ہوتے ہو تو سب سہمے رہتے ہیں، چلے جاتے ہو تو سب دعائیں کرنے لگتے ہیں ''یا اللہ خیر'' یار تم کیا بنتے جا رہے ہو۔''

میں سنتا ہوں تو احترام سے کہتا ہوں ''اباجی زندگی بڑی مشکل ہے، زندہ رہنے کے لیے بڑی کوشش کرنی پڑتی ہے آپ کے سامنے ہوں گھر چلانے کے لیے دو دو نوکریاں کرتا ہوں، سارا دن دوڑ دھوپ میں گزر جاتا ہے، اس محنت کے بعد مزاج میں گرمی، سردی نہ آئے تو کیا ہو۔''

وہ دوبارہ قہقہہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں ''تم پر اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم ہے، گاڑی ہے، رہنے کے لیے اپنا گھر ہے، دو پیارے بچے ہیں، لوگ تمہاری عزت کرتے ہیں، آمدنی بھی اچھی ہے، گھر میں کوئی بیماری نہیں، کوئی مشکل کوئی مصیبت نہیں لیکن اس کے باوجود تم چوبیس گھنٹے پریشان رہتے ہو، افراتفری اور انتشار میں رہتے ہو، اِدھر سے اُدھر اور اِدھر سے اُدھر بھاگتے رہتے ہو کیوں؟ کیونکہ تم ناشکرے ہو، اللہ کی نعمتوں کے منکر ہو، دولت کی ہوس میں، آگے بڑھنے کی کوشش میں خدا کو بھول چکے ہو، تم میں اور ہم میں یہی فرق ہے، ہمیں مشکل ہوتی یا آسانی اس کو نہیں بھولتے تھے لہٰذا زندگی میں ہمارے لیے امن ہی امن اور سکون ہی سکون تھا، لیکن تم مشکل ہو یا آسانی کبھی اس کو یاد نہیں کرتے لہٰذا زندگی تمہارے لیے مشکل ہی مشکل ہے، بے آرامی ہی بے آرامی، بے چینی ہی بے چینی ہے۔''

یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب میں ''ہوں'' کر کے اٹھ جاتا ہوں کیونکہ میں ایک مصروف آدمی ہوں اتنا مصروف آدمی جس کے پاس پرانے اور فرسودہ لوگوں کی ''پرانی اور فرسودہ'' فلاسفی کا جواب دینے کے لیے کوئی وقت نہیں۔

نجات دہندہ

(جب ایک اتفاق ملک معراج خالد کو وزیر اعظم ہاؤس لے گیا تو میں نے اس ''سانحے'' پر یہ کالم لکھا جو اسلام آباد کے ایک روزنامے میں شائع ہوا لیکن محدود سرکولیشن کے باعث پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے قارئین اس سے ''لطف اندوز'' نہ ہو سکے جس کی ''تلافی'' میں آج کر رہا ہوں۔ تاہم ان نازک مزاج قارئین سے، جو عموماً پرانی اور باسی چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں، میری درخواست ہے اگر وہ بعض مقامات پر ملک معراج خالد کی جگہ نواز شریف کو رکھ کر دیکھیں تو انہیں یہ کالم پرانا محسوس نہیں ہوگا۔)

یہ کوئی بڑی بات نہیں۔

آپ نے کلرکی سے آغاز کیا، آدھی سے زیادہ زندگی سائیکل چلاتے گزاری، کرائے کے مکانوں میں رہتے رہے، ناکام وکیل ثابت ہوئے سگریٹ کا عوامی برانڈ پیتے رہے، افریقہ اور ایشیا کو قریب لانے کا خواب دیکھتے رہے، بھٹو کے قریب ترین ساتھی رہے، سرکاری تقریبات میں سب سے پہلے پہنچتے رہے، لاہور پریس کلب کی پرانی عمارت کے نیچے تھڑے پر بیٹھ کر تمباکو نوشی کرتے رہے، پنجابی میں لطیفہ گوئی کرتے رہے اور ریڑھیوں سے چنے خرید کر کھاتے رہے۔

یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔

آپ نے وزیر اعلیٰ پنجاب بننے کے بعد اپنا وہ پرانا گھر نہیں چھوڑا جس میں کال بیل تک نہیں تھی لوگ جس کی کنڈی بجا کر اپنی آمد کی اطلاع دیتے تھے اور جو ایک ایسی تنگ و تاریک گلی میں تھا جہاں سے لوگ روز وزیر اعلیٰ پنجاب کو فائلیں بغل میں دبائے پیدل آتے اور جاتے دیکھتے تھے اور جس مکان میں کوئی نوکر، کوئی باورچی اور کوئی آیا نہیں تھی اور جس کے سارے کام ''خاتون اول'' کو اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑتے تھے اور اور اور...... لیکن ٹھہریئے، وزیر اعلیٰ پنجاب کی اہلیہ کو روز رکشے پر سکول پڑھانے بھی تو جانا پڑتا تھا۔

اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔

آپ ہجوم میں ممتاز ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ آپ کی ذات میں عجز بھرا ہے، آپ دھیمے لہجے کے، بردبار، متین اور ''کمپلیکس فری'' شخص ہیں۔ آپ کسی مالیاتی سکینڈل میں ملوث نہیں، چھوٹی سی گلی میں رہنے کے باوجود آپ کے دامن پر کوئی چھینٹا نہیں، آپ پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی، آپ کو کسی نے برا نہیں کہا اور آپ پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہاں یہ کوئی بڑی بات نہیں یہ سب عام انسان کی خوبیاں ہیں، ان سینکڑوں، ہزاروں عام انسانوں کی خوبیاں ہیں۔ جنہیں اگر اتفاق وزیر اعلیٰ، سپیکر یا وزیر اعظم بنا دے تو شاید ان کا رد عمل بھی ایسا ہی ہو۔

ہاں ملک صاحب! تاریخ بڑی سنگدل ہے کہ اسے حکمرانوں کی ذاتی ایمانداری اور انفرادی اخلاق سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ یہ صرف بڑے لوگوں کے کارنامے دیکھتی ہے۔ حضرت عمرؓ کی دوپہریں صحرا میں گزریں اور راتیں مدینہ کی چوکیداری میں تو تاریخ اسے ایک صفحے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی لیکن امیر المومنین حضرت عمرؓ کے کارناموں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ خالد بن ولیدؓ کیا کھاتے تھے، کیا پیتے تھے کس گھر میں رہتے تھے، ان کی اولاد کتنی تھی ان کی سواریوں کے نام کیا تھے، تاریخ بالکل خاموش ہے لیکن سیف اللہ کی عسکری حکمت عملی دنیا کی تمام فوجی اکیڈیموں میں پڑھائی جاتی ہے۔ کتنے لوگ جانتے ہیں کارل مارکس نے اپنے بچے کو اخبار میں لپیٹ کر دفن کیا تھا لیکن کمیونزم کے خالق کو پوری دنیا جانتی ہے۔ ماؤزے تنگ سائیکل پر دفتر جاتا تھا، دو کمرے کے مکان میں رہتا تھا، دو سلائس سے لنچ کرتا تھا، اس کے پاس کپڑوں کے صرف دو جوڑے اور جوتوں کی ایک جوڑی تھی۔ کون جانتا ہے؟ لیکن عوامی جمہوریہ چین کے ''بانی'' ماؤزے تنگ کو کون نہیں جانتا، وہ شخص کہاں پیدا ہوا، کہاں رہا اور کہاں دفن ہوا۔ دنیا میں کتنے لوگ جانتے ہیں لیکن ترکی کے معمار اعظم ''اتاترک'' کسی دماغ سے محو نہیں ہوا۔

اور وہ بھی تو چمڑا بیچنے والوں کا کمزور اور دھان پان سا بچہ تھا، جو گورنر جنرل بنا تو صرف ایک روپیہ تنخواہ لی، پرانے بوسیدہ سوٹ پہنے، ایک وقت کھانا کھایا۔ اپنے سٹاف کو ذاتی جیب سے تنخواہ دی اسے کون جانتا ہے؟ لیکن پاکستان جیسے معجزے کے خالق محمد علی جناح کو کون نہیں جانتا......

ہاں جناب عالی اگر تاریخ کے نزدیک حکمرانوں کی انفرادی ایمانداری اور شخصی شرافت کی کوئی اہمیت ہوتی تو اس ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے، اس ملک کا ایک وزیر اعظم تھا جس کی شیروانی کے نیچے کرتا نہیں ہوتا تھا، اسی ملک میں ایک وزیر اعظم بھی گزرا ہے، کچن میں برتن مانجھتے مانجھتے جس کی اہلیہ کے ہاتھ پھٹ گئے تھے، وہ شخص بھی اس ملک کا وزیر اعظم تھا جس کا پوری دنیا میں مکان نہیں تھا، وہ بھی اس ملک کا صدر تھا جس کی آخری زندگی لندن میں کرائے کے فلیٹ میں گزری اور اس کی بیوی کو ایک پی آر او کی تنخواہ میں گزارہ کرنا پڑا، وہ بھی اسی ملک کا لیڈر تھا جو فلائنگ کوچ کے حادثے میں مرا تو جیب سے برآمد ہونے والی رقم سے اس کی تدفین تک ممکن نہیں تھی اور اسی ملک میں ایک ایسا مطلق العنان حکمران بھی گزرا ہے جو امریکہ کے دورے پر پی آئی اے کی

عام فلائٹ پر عام مسافروں کے ساتھ گیا لیکن اب کوئی ان کا ذکر تک نہیں کرتا، کیونکہ ان کے کھاتے میں ذاتی ایمانداری کے سوا کوئی کارنامہ نہیں۔ انہوں نے کوئی قوم تعمیر نہیں کی، انہوں نے کوئی نیا نظام نہیں دیا۔ انہوں نے کسی سسٹم کی اصلاح نہیں کی، نہ انصاف دلایا، نہ تعلیم، نہ صحت، نہ عزت، نہ طبقاتی تفریق ختم کی اور نہ معاشی عدل قائم کیا، لہٰذا تاریخ نے بھلا دیا اور انسانی حافظے نے انہیں فراموش کر دیا۔

ہاں جناب عالی اگر آپ چاہتے ہیں ایک قوم صدیوں تک آپ کی تصویر کو سیلوٹ کرتی رہے، شاعر آپ پر نغمے لکھیں اور گلوکار اسے مذہبی فریضے کی طرح گاتے رہیں، نوٹوں پر آپ کی تصویریں چھپیں اور ہر سال آپ کی یاد میں دن منائے جائیں تو خدا کے لیے اس قوم سے انصاف کر جائیں۔ پچاس برس سے اقتدار کے دروازے پر کھڑے اس ہجوم کو قوم بنا دیں، لیکن اگر آپ نے بھی صرف اپنا دامن چھینٹوں سے بچانے کے لیے انہیں مایوس کر دیا تو آپ بھی وزرائے اعظم کے قبرستان میں ایک قبر ہوں گے، ایسے بے چہرہ وزیراعظم جسے ایک اتفاق ایوان اقتدار تک لے آیا اور دوسرا اتفاق بہا لے گیا اور تاریخ میں آپ کا ذکر تک نہیں ہوگا کہ اللہ کے بندوں کو مایوس کرنے والے لوگ تاریخ کے بجائے کوئز بکس میں زندہ رہتے ہیں جنہیں بچے پہیلیوں کی طرح پوچھتے اور کہانیوں کی طرح کہتے ہیں۔

ہاں جناب ملک معراج خالد! تاریخ کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ برکی کے ایک ایسے ناکام وکیل کی ایمانداری کا تذکرہ کرتی رہے، جسے قدرت نے لوگوں کا مقدر بدلنے کا موقع دیا لیکن اس نے صرف اپنا دامن بچانے کے لیے اسے ضائع کر دیا۔

ہاں ملک صاحب تاریخ صرف اور صرف ان قبروں پر رکتی ہے جہاں انسانوں کے نجات دہندہ سوئے ہوتے ہیں۔

ایک زندہ شخص

ایک بار ڈاکٹر اشفاق حسین مجھ سے کہنے لگے:

"یار میں نے مرنا نہیں، ہجرت کرنی ہے، اس شہر سے اس شہر جانا ہے اور جب یہ بیوقوف لوگ مجھے اٹھا کر لے جا رہے ہوں تو کم از کم تو میرے جنازے میں نہ آنا کیونکہ تمہیں تو خبر ہو گی میں اس وقت بھی زندہ ہوں۔"

اور جب وہ ایک بار موت سے لڑ کر واپس آئے تو میں نے ان کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیوں جی کیا ہوا؟"

وہ عمرو عیار کی طرح آنکھیں گھما کر بولے۔

"یار وہ آیا تھا موت کا فرشتہ لیکن اس سے پہلے کہ وہ میری گٹھڑی اپنے سر پر رکھتا میں نے اس سے کہا یار تمہارا جو جی چاہے کرو، بس مجھے ذرا اللہ تعالیٰ سے اتنا پوچھ دو، میری اوپر زیادہ ضرورت ہے یا نیچے؟" اس نے کہا "اچھا تم یہیں رکو میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں" اور غائب ہو گیا اور اس کے بعد ابھی تک واپس نہیں آیا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے اسے کسی اور کام لگا دیا ہے۔

ہم جب بھی موت، کفن یا قبرستان کا ذکر کرتے ڈاکٹر اشفاق حسین ہمیں روک کر کہتے۔ "نہیں دوستو! بری بات، تم لوگ زندہ ہو صرف زندگی کی بات کرو۔" لیکن ہم میں سے کوئی انہیں ٹوک کر کہتا۔ "ڈاکٹر صاحب موت سب سے بڑی حقیقت ہے، وہ کھانستے پھر ہنستے اور پھر کہتے: "پر دوستو! زندگی اس سے بھی بڑی حقیقت ہے وہ لوگ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں جو چمکتی دوپہر میں رات کے اندیشے سے کانپتے رہتے ہیں۔"

مجھے شوگر ہو گئی تو میں سخت پریشانی میں ان کے پاس گیا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے: "یہ تم چہرے کی جگہ تربوز لگا کر کیوں آ گئے؟" میں نے خون کی رپورٹ ان کے سامنے رکھ دی۔ انہوں نے دیکھی، قہقہہ لگایا اور اسے پرزے پرزے کر کے ٹوکری میں ڈال کر بولے۔ "یار تم نے زندگی میں کبھی بیماری دیکھی ہی نہیں، ورنہ اس معمولی مسئلے پر اتنے پریشان نہ ہوتے۔ مجھے دیکھو۔ میں چار سال سے چارپائی پر پڑا ہوں، میرا جگر درد بھرا پھوڑا بن چکا ہے، گردے اپنا کام بند کر چکے ہیں، پیٹ سے ہفتے میں چھ بوتلیں پانی نکلواتا ہوں، بغیر سہارے کے کروٹ نہیں بدل سکتا، کھل کر سانس نہیں لے سکتا، جی بھر کر کھا نہیں سکتا اور ستم یہ کہ ستار تک نہیں بجا سکتا،

لیکن ان چار سالوں میں تم نے ایک بار بھی مایوس دیکھا؟ کبھی ''مجھے بھی بلا لو یا رسول اللہ ﷺ'' کا نعرہ لگاتے سنا، لوگوں سے بیزار اور تنہائی کا شکار دیکھا؟''

میں نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم نے کبھی سوچا میں اتنا خوش کیوں ہوں، میرے اطمینان کے پیچھے کیا فارمولا ہے؟''

میں نے پھر گردن نفی میں ہلا دی۔

''وہ یہ میری جان کہ میں نے اپنے اندر زندگی کی خواہش کو مرنے نہیں دیا، اس کی ایسے حفاظت کی، جیسے ماں اپنے پیٹ کے بچے کی کرتی ہے چنانچہ تمہارے سامنے ہوں، خوش ہوں، مسرور ہوں، قہقہے لگاتا ہوں، لطیفے سنتا اور سناتا ہوں .... اور تم بیوقوف شخص صرف ''شوگر'' سے پریشان ہو، جو روزانہ ایک گھنٹہ واک سے ٹھیک ہو سکتی ہے۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکے اور پھر گویا ہوئے۔

''اور ہاں تمہیں ایک اور بات بتا دوں، اسے تحفۂ درویش جانو، جب تک انسان کے اندر زندہ رہنے کی خواہش زندہ رہتی ہے وہ مر نہیں سکتا۔ یہ میرا ایمان بھی ہے اور تجربہ بھی۔ مجھے دیکھو جس بندے کا جگر ختم ہو چکا ہو، کیا وہ زندہ رہتا ہے پر میں چار برس سے زندہ ہوں کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔'' ڈاکٹر اشفاق خاموش ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب میں زندگی تھی بھی بہت ان کے انگ انگ سے کشر ہوتی تھی، ایک ایک لفظ سے جھلکتی تھی۔

جب بے نظیر بھٹو ان کی چند پڑیوں سے دوبارہ زندہ ہو گئی تو اس نے ڈاکٹر اشفاق حسین سے پوچھا: ''ڈاکٹر صاحب میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'' ڈاکٹر صاحب نے سن کر قہقہہ لگایا اور بولے: ''بی بی آپ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتیں کیونکہ میری کوئی ایسی ضرورت نہیں جو پوری نہ ہوتی ہو، کوئی ایسی خواہش نہیں جس سے میں نے لطف نہ اٹھایا ہو۔''

''میں آپ کے لیے پھر بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں۔'' بینظیر نے زور دیا۔

''اچھا'' ڈاکٹر اشفاق نے تھوڑی دیر تک سوچا اور پھر بولے: ''پرائم منسٹر آپ نے کبھی مردوں کو اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلائی؟''

بینظیر نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا اور گردن نفی میں ہلا دی۔

''پھر آپ میرا ایک کام کر سکتی ہیں۔'' ڈاکٹر نے اس لہجے میں کہا، جیسے سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا ہو۔

''وہ کیا'' بینظیر نے پوچھا۔

''میں جب بھی آپ کے پاس آؤں آپ مجھے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلا دیا کریں۔'' ڈاکٹر نے بچوں کی سی سادگی سے کہا اور بینظیر نے قہقہہ لگا دیا۔

اتنا اونچا بلند اور بے باک قہقہہ جو ''دختر مشرق'' کی محفل میں بیٹھنے والے کسی شخص نے کبھی نہیں

سنا ہوگا۔

ادھر جب نواز شریف نے ڈاکٹر اشفاق سے پوچھا: ''ڈاکٹر صاحب آپ کی کوئی ایسی خواہش جو میں پوری کر سکوں۔'' ''ہاں ہے۔'' بوڑھے نحیف ڈاکٹر نے گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

نواز شریف چونک گئے۔

''میں چاہتا ہوں آپ اور میں ایک ہی پیالے میں پائے کھائیں۔'' ڈاکٹر نے نہایت معصومیت سے کہا اور نواز شریف نے بھی ایک بلند بانگ قہقہہ لگا کر حاضرین کو حیران کر دیا۔

شفا انٹرنیشنل کے'' آئی سی یو'' میں جب میں ان سے آخری ملاقات کے لیے گیا تو وہ نلکیوں میں لپٹے پڑے تھے میں خاموشی سے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے پوری آنکھیں کھول کر مجھے پہچانا اور پھر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن آواز اتنی مدھم تھی کہ میں الفاظ سمجھ نہ سکا اور پھر آدھ گھنٹہ بعد جب میں ہسپتال کی لفٹ سے باہر آ رہا تھا تو میں نے سوچا اس بار جب جان قبض کرنے والا فرشتہ آئے گا اور ڈاکٹر اشفاق شوخی سے پوچھیں گے۔ ''یار تم نے ابھی تک بتایا نہیں میری اوپر زیادہ ضرورت ہے یا نیچے؟'' تو شاید وہ کہے۔

''میں پوچھ آیا ہوں، آپ کی اوپر زیادہ ضرورت ہے۔''

''پر کیوں؟'' وہ اپنے روایتی لہجے میں پوچھیں گے۔

فرشتہ بولے گا'' وہ کہہ رہے ہیں ہم ایک زندہ شخص کو مردوں میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔''

دوسرے روز جب مجھے ڈاکٹر اشفاق حسین کے انتقال کی خبر ملی تو میں گھر آ کر سو گیا۔ اس شام یار احباب نے پوچھا ''تم جنازے میں کیوں نہیں آئے'' تو میں نے کہا'' اس لیے کہ میں جانتا ہوں ڈاکٹر اشفاق مرے نہیں، انہوں نے بس ہجرت کی ہے، اس شہر سے نکل کر دوسرے شہر چلے گئے یہاں مردوں کو ہنسایا کرتے تھے، اب وہاں زندوں کو رلایا کریں گے۔''

ہاں، دوستو! میں مردوں کے جنازے پڑھنے کا عادی ہوں میں کسی زندہ شخص کو کندھا نہیں دے سکتا۔

سردیوں کی شاموں میں گرم دوپہر کی یاد

سردیوں کی شاموں میں ہیٹر کے بالکل قریب بیٹھ کر، پاؤں پر جاپانی کمبل گرا کر اور ہاتھ میں بھاپ اڑاتی چائے کا کپ پکڑ کر، جون کی کسی تپتی دوپہر، جلتے ہوئے سایوں اور سڑکوں پر پگھلی ہوئی تارکول یاد کرنا آسان کام نہیں۔

نیم تاریک کمرے میں ہم چار افراد بیٹھے تھے۔ میرے ساتھ راشد حجازی تھے، سامنے ہمارے میزبان افضل تارڑ تھے اور ساتھ کونے میں ایک معزز باریش شخص بیٹھا تھا۔ ہمارے سامنے ایلومینیم کا درمیانے درجے کا دیگچہ پڑا تھا، جس میں گدلا سا پانی، برف کے پگھلتے ہوئے ٹکڑے اور بے شمار آم تھے۔ باریش شخص دیگچے میں ہاتھ ڈالتا، آموں کو ٹٹول کر دیکھتا اور پھر ان میں سے قدرے صحت مند "دانے" کا انتخاب کر کے باہر لاتا، ٹشو پیپر سے صاف کرتا اور پھر اسے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں گوندھنا شروع کر دیتا۔ جب آم کے سرے پر رس کے قطرے چمکنے لگتے تو ذرا سا جھک کر اس پر ہونٹ رکھ دیتا۔ دونوں ہاتھوں میں جکڑے دانے کو معمولی سا دباتا، بالکل ایسے جیسے بچے غبارے کو دباتے ہیں یا باجے کی ربڑ کی تھیلی دبائی جاتی ہے اور پھر کمرے میں پوچ پوچ کی آوازیں گونجنے لگتیں لیکن پھر اچانک ہی آوازیں تھم جاتیں اور معزز شخص چہرہ اوپر اٹھا کر مجھے مخاطب کرتا:

"جاوید تم یقین کرو پاکستان کا کرپٹ ترین ادارہ "عدالتیں" ہیں، تم عام سے عام سول جج کا "لیونگ سٹینڈرڈ" دیکھو، پاکستان کے بڑے بڑے کاروباری لوگ اس کا تصور نہیں کر سکتے، تم ججوں کے بچوں کے تعلیمی ادارے دیکھو، کوئی ایماندار افسر اتنی فیسیں ادا نہیں کر سکتا، تم عدالتی اہلکاروں کی بیویاں دیکھو، بڑے بڑے امیر لوگوں کی بیویاں اتنے قیمتی زیورات نہیں پہن سکتیں، تم ان لوگوں کے گھر دیکھو، یوں لگے گا جیسے کسی عرب شہزادے کے محل میں آ گئے ہیں، یہ رزق کی فراوانی کہاں سے آتی ہے؟ یہ وسیع تر وسائل کس جگہ سے آتے ہیں؟ یہ من و سلویٰ کیونکر اترتا ہے، اس ملک میں کوئی سوچتا ہے؟ کسی نے بھی کبھی تحقیق کی؟ کسی نے اس پر غور و فکر کی زحمت گوارا کی؟ نہیں کی، لیکن ایک بات لکھ لو، لکھو، لکھو تمہارے پاس قلم بھی ہے اور کاغذ بھی۔ جب تک پاکستان کا عدالتی نظام درست نہیں ہوتا، احتساب کا آغاز ججوں سے نہیں ہوتا، یہ ملک نہیں چل سکتا، نظام

درست نہیں ہوسکتا۔" ساتھ ہی باریش معزز شخص نیچے جھکتے اور ہاتھ میں پکڑے چرمرائے آم پر ہونٹ رکھ دیتا۔

"لیکن آپ بھی تو اسی عدالتی نظام کا حصہ رہے ہیں۔" راشد حجازی نے اپنے روایتی انداز سے ہوا میں ہاتھ چلائے۔

"ہوں، ہوں" معزز شخص نے ہونٹ آم سے الگ کیے، دائیں ہاتھ سے ٹشو پیپر کے ڈبے سے ایک نرم اور ملائم کاغذ کھینچا اسے ہونٹوں پر پھیرا اور پھر مسکرا کر بولا: "میں تھا راشد صاحب لیکن اپنے "ضدی پن" کی وجہ سے میری کیا حالت تھی آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں سیشن جج تھا، جی او آر لاہور میں میری سرکاری رہائش تھی، گاڑی تھی نہیں لہٰذا ویگن پر دھکے کھاتا ہوا کورٹ آتا اور اسی طرح دھکے کھاتا ہوا واپس جاتا اور اکثر ایسے بھی ہوتا کہ دو دو گھنٹے ویگن کے انتظار کے بعد میں واپس گھر آجاتا جبکہ تیز بارشوں میں بھیگتے ہوئے کمرہ عدالت تک پہنچنے کے تو کئی واقعات ہیں۔ اسے بھی چھوڑیں، پوری زندگی میں اکٹھے دو جوڑے کپڑے نہیں بنا سکا۔ ایک آدھ جوڑے سے زائد کبھی جوتے نہیں خریدے۔ ڈائننگ ٹیبل پر بھی ساگ پات کے سوا کچھ نہ ملا اور آج میں سینئر ہوں تو یقین کریں میرے پاس اب بھی گورنمنٹ ہاسٹل کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پیسے نہیں۔"

"بڑی بات ہے۔" میرے منہ سے بے اختیاری میں نکل گیا "نہیں نہیں" معزز شخص نے چرمرایا ہوا آم ٹوکری میں پھینک کر اپنی عمیق نظریں مجھ پر جمائیں اور بولا "نہیں جاوید، اس بات کا قطعاً یہ مطلب نہیں تھا میں خود کو پارسا، ایماندار اور درویش ثابت کرنا چاہتا ہوں، میں تو صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں اگر ایک شخص ان تمام دکھوں، اذیتوں اور مسائل کے باوجود زندگی بھر خوش و خرم، مطمئن اور مسرور رہ سکتا ہے تو دوسرے جج کیوں نہیں رہ سکتے۔ آخر ان لوگوں کو بھی تو سمجھایا جا سکتا ہے رزق حلال کی برکات سے متعارف کرایا جا سکتا ہے۔"

"پر یہ کون کرے گا؟" میں نے آہستہ سے پوچھا: "کوئی ایسا بندہ خدا، جس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو، جس کے عمل اور گفتار میں تضاد نہ ہو، جو اندر اور باہر سے دو رنگا نہ ہو" باریش شخص نے پھر آہستہ سے کہا۔

"اگر کبھی زندگی میں آپ کو ایسا اختیار مل گیا تو" میں نے شوخی سے پوچھا، باریش معزز شخص نے قہقہہ لگایا پھر دیگچے میں ہاتھ ڈال کر برف کی ایک پگھلتی ہوئی ڈلی اٹھائی، اسے ہتھیلی پر جمایا اور پھر اس پر نظریں جما کر بولا "جاوید اگر مجھے زندگی میں کبھی ایسا موقع ملا تو میں پاکستان کا عدالتی نظام درست کر دوں گا، انصاف کے راستے میں کھڑی رکاوٹیں دور کر دوں گا، ججوں کو رزق حلال تک محدود رہنے پر مجبور کر دوں گا، سائلوں کو جگہ جگہ ذلیل ہونے سے بچاؤں گا، لیکن میرا نہیں خیال مجھے کبھی ایسا کوئی اختیار ملے گا۔"

اور کل صبح جب ٹھیک چھ ماہ بعد میرے بچے نے تازہ اخبار اٹھا کر میرے سامنے پھیلا دیے تو میں تمام اخبارات کی "لیڈ سٹوری" میں اس باریش معزز شخص کی تصویر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جی ہاں ایلومینیم کے دیگچے میں صحت مند دانوں کی تلاش میں سرگرداں ہاتھ جناب رفیق تارڑ ہی کے تھے اور میں نے سوچا جون 97، کی وہ تپتی ہوئی دوپہر جب سایوں کے بدن آگ سے جھلس رہے تھے اور سڑکوں کی پگھلی تارکول تارڑوں

سے چیک رہی تھی، تو قبولیت کی ایک گھڑی لوح محفوظ سے ٹوٹ کر فیڈرل لاجز کے اس نیم تاریک کمرے میں اتری اور ایک نہایت ہی سادہ شخص جس کے ماتھے پر محراب کا نشان اور جس کے پاؤں میں قینچی چپل تھی، کی زبان پر دعا بن کر گھل گئی، اسی لمحے جب ہم مولانا ظفر علی خان اور آغا شورش کشمیری کی تحریروں کا تقابل کر رہے تھے، ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم چار لوگوں میں سے ایک شخص چھ ماہ بعد اس ملک کا صدر ہوگا۔ افواج پاکستان کا سپریم کمانڈر ہوگا۔ ہر قانون، آئین کی ہر ترمیم اس کے دستخطوں سے جاری ہوگی، چیف آف آرمی سٹاف اور چیف جسٹس اس کی مرضی سے مقرر ہوں گے۔

جی ہاں، جناب رفیق تارڑ آپ نے فیڈرل لاجز تھری کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا تھا: ''جس معاشرے میں انصاف نہیں ہوتا، وہاں کوئی قانون نہیں ہوتا اور جہاں قانون نہیں ہوتا، وہاں انسان نہیں درندے بستے ہیں اور اس ملک کے 13 کروڑ لوگ شہروں نہیں، جنگلوں میں زندگی گزار رہے ہیں، جہاں خونخوار درندے کمزور دانتوں اور چھوٹے ناخنوں والے جانوروں کو کچا چبا رہے ہیں۔'' اور آپ نے کہا تھا ''قانون پانی کی طرح ہوتا ہے، اگر وہی زہریلا ہو تو فصلیں کیسے صحت مند ہو سکتی ہیں، پھلوں میں توانائی کیسے آسکتی ہے۔'' اور آپ نے کہا تھا ''تاریخ میں حکمران وہی زندہ رہتے ہیں جو قانون بناتے ہیں، جو مظلوموں کے آنسو پونچھتے ہیں، جو ظالم کا راستہ روکتے ہیں'' اور آپ نے کہا تھا ''جس ملک کا سیاستدان بددیانت ہو، حکمران لالچی ہو، مولوی منافق ہو، دانشور چور ہو اور جج کرپٹ ہو اس ملک کے قائم رہنے کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔'' اور آپ نے کہا تھا ''قدرت ہمیں اصلاح کا ایک موقع ضرور دے گی۔ ہم سنبھل گئے تو ہماری اولادیں ایک خوشحال پاکستان دیکھیں گی لیکن ہم نے یہ موقع بھی کھو دیا تو......؟'' اور آپ نے اوپر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا تھا ''یار آج گرمی بہت ہے، اگر میں مزید کچھ دیر یہاں ٹھہرا رہا تو مجھے سن سٹروک ہو جائے گا، اجازت دو جلد ملیں گے۔''

ہاں جناب رفیق تارڑ شاید فیڈرل لاجز تھری کا وہ نیم تاریک کمرہ، وہ ٹھنڈے آم اور لوح محفوظ سے ٹوٹا ہوا وہ لمحہ آج بھی آپ کے حافظے کے کسی کونے میں ڈرا سہا بیٹھا ہو، جب آپ نے بڑی حسرت سے کہا تھا ''اگر کبھی مجھے اختیار مل گیا تو میں عدالتی نظام درست کر دوں گا اور کوئی ایسا بندہ خدا چاہئے جس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو، جس کے عمل اور گفتار میں بُعد نہ ہو اور جو اندر اور باہر سے دو رنگا نہ ہو...... '' لیکن نہیں سردیوں کی شاموں میں، ہیٹر کے بالکل قریب بیٹھ کر، پاؤں پر جاپانی کمبل گرا کر اور ہاتھ میں بھاپ اڑاتی چائے کا کپ پکڑ کر جون کی کسی تپتی دوپہر، جلتے سایوں اور سڑکوں کی پگھلی ہوئی تارکول یاد کرنا آسان کام نہیں؟

دی لبرل پریذیڈنٹ

ہاں تو جناب رفیق تارڑ صاحب آپ بھی لبرل نکلے۔

آپ کہ جو اپنی شلوار ٹخنوں سے اوپر رکھتے تھے، جیب میں پاکٹ سائز قرآن مجید رکھتے تھے، جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے، چٹنی کے ساتھ روزہ رکھتے اور نمک کے ساتھ افطار کرتے تھے، روضہ رسول ﷺ کی تصویر دیکھ کر آپ کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں، درود شریف کے بغیر نبی اکرم ﷺ کا نام نہیں لیتے تھے، حج آپ کی بڑی خواہشوں میں سے ایک خواہش تھا، نفاذ نظام مصطفیٰ کے لیے ہر قربانی دینے کا عزم رکھتے تھے۔ صبح صادق کے ساتھ بیدار ہوتے، ایک پارہ روز تلاوت کرتے، احادیث کی کتب اور اسلامی تاریخ آپ کی لائبریری کا حصہ ہوتی اور نجی محفلوں میں مغربی فلاسفروں کی جگہ حضور ﷺ نے فرمایا، آپ ﷺ نے ارشاد کیا، کہتے کہتے آپ کی زبان نہیں تھکتی تھی۔

آپ کہ جو حقوق نسواں کی حامی خواتین کو دیکھ کر تین بار لاحول پڑھتے اور پھر بڑی نفرت سے کہتے یہ ننگی اور گندی آوارہ ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو عورتیں بنانا چاہتی ہیں، قحبہ خانہ کھولنا چاہتی ہیں، ڈسکو بار اور مخلوط کلب قائم کرنا چاہتی ہیں، اگر ان عورتوں کو روکا نہ گیا تو پاکستان، پاکستان نہیں رہے گا، یورپ بن جائے گا۔ آپ ننگے سر، تنگ لباس اور سرخ پاؤڈر کے ساتھ باہر نکلنے والی عورتوں کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے، انگریزی بولنے والی خاتون کو پنجابی میں جواب دیتے تھے، جینز پہننے والی بچیوں کو حضرت فاطمہؓ کی زندگی کی مثالیں دے کر "مسلمان" بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ جہیز کو لعنت شادی بیاہ پر بے جا اسراف کو خلاف اسلام سمجھتے تھے۔ بہشتی زیور کو خواتین کے سلیبس کا حصہ بنانا چاہتے تھے اور مشرق کی سادہ باحیاء سلجھی اور ان پڑھ عورت آپ کی آئیڈیل تھی۔

آپ کہ جو قادیانیوں کو سب سے بڑا فتنہ سمجھتے تھے، یورپ میں ان کے وسیع نیٹ ورک پر کڑھتے تھے، تحریک ختم نبوت میں چندہ دیتے تھے، قادیانیوں کے خلاف چھپنے والی کتابیں اپنی جیب سے خرید کر تقسیم کرتے تھے، ختم نبوت ﷺ پر ہونے والے ہر جلسے میں شریک ہوتے تھے، سکول کے بچوں کو "فتنہ قادیانیت" پر تقریریں لکھ کر دیتے تھے، شورش کاشمیری کو قادیانی دشمنی میں پاکستان کا سب سے بڑا لیڈر سمجھتے تھے، سید عطاء

اللہ شاہ بخاری کو دنیا کا سب سے بڑا مقرر قرار دیتے تھے، قادیانیوں کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں ڈنڈے کھاتے تھے، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے والے دن کو قومی تہوار کی طرح منانا چاہتے تھے، قادیانیوں کے قائم کردہ مقدموں میں ماخوذ ''مجرموں'' کا مفت کیس لڑتے تھے اور آپ لندن جا کر مرزا طاہر کو مناظرے کی دعوت دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔

آپ کہ جو توہین رسالت ﷺ ایکٹ کے سب سے بڑے حامی تھے، توہین رسالت ﷺ کے مجرموں کی کھالیں کھینچ لینے کے قائل تھے، غازی علم دین شہید جیسی موت کے خواہاں تھے، کسی شخص کے منہ سے ﷺ کے بغیر نبی اکرم ﷺ کا نام سن کر کھول اٹھتے تھے، آپ کی آواز بھرا جاتی تھی، ماتھے پر پسینہ آ جاتا تھا اور ہاتھ کانپنے لگتے تھے۔ آپ جہاد کو بیت المقدس کے حصول کا واحد ذریعہ قرار دیتے تھے۔ پاکستان میں آباد عیسائیوں، ہندوؤں اور سکھوں پر کڑی نظر رکھنے کی ہدایت کرتے تھے، خلفائے راشدین کو تنقید سے مبرا سمجھتے تھے اور آپ نبی اکرم ﷺ سے عشق کو حلف کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔

آپ کہ جو سادگی، شرافت اور ایمانداری کے پیکر تھے، شکل و صورت، قول و فعل، نشست و برخاست، چال ڈھال اور خیالات و احساسات سے ''چھٹے خلیفہ راشد'' دکھائی دیتے تھے۔ آپ کہ جو رشوت نہیں لیتے تھے، زمین پر سوتے تھے، سادہ خوراک کھاتے تھے، پیدل چلتے تھے، پنجابی بولتے تھے، قینچی چپل پہنتے تھے، کندھے پر ''پرنا'' رکھتے تھے، شلوار کرتا پہنتے تھے، سر ننگا نہیں ہونے دیتے تھے۔ آپ کہ، جو مہینے کی پہلی تاریخوں کو رکشے اور آخری تاریخوں کو پیدل کورٹ جاتے تھے، دو وقت کھانا کھاتے تھے، اپنی جیب سے چائے پیتے تھے، تحفے کو رشوت سمجھتے تھے، تعریف کو خوشامد اور تنقید کو حرارت کہتے تھے، مخلوط تعلیم کو ہدف تنقید بناتے تھے، بازاروں میں کھانے پینے کو شیطانی فعل گردانتے تھے، بسنت کو خلاف قانون کہتے تھے، موسیقی پر پابندی لگانا چاہتے تھے اور ڈاڑھی کو قانون بنانا چاہتے تھے۔

ہاں، آپ کہ جو پوری زندگی ایک ایسے حکمران کا راستہ دیکھتے رہے جو اسلام کے بنیادی موقف پر ڈٹ جائے، جو معاشرے کو سدھارنے کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے، جو گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کے ایک دروازے سے داخل ہو اور مارتا دھاڑتا دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے، جو پردے کو قانون بنا دے، تھانے کے ذریعے نمازیں قائم کرائے، کوڑے سے زکوٰۃ وصول کرے، تلوار سے شریعت نافذ کرے اور تھپڑ سے قرآن مجید پڑھائے، جو معاشرے سے عدم مساوات کھرچ کر الگ کر دے، جو دولت مساوی تقسیم کرے، غربت، بے روزگاری اور بیماری کے خلاف جہاد کرے، جو بھیس بدل کر شہر شہر پھرے، جو تانگے والے سے لے کر کار والے تک اور پرچون فروش سے صنعت کار تک سب کے مسئلے مسائل سمجھتا ہو۔

ہاں، ہاں آپ ایک سچے، کھرے اور پابند مسلمان تھے، آپ کو اپنی بنیاد پرستی پر فخر تھا، اپنی تاریخ، اپنے ارتقاء اور اپنے فلسفے پر ناز تھا، آپ مسلمان ہونے کی بناء پر اللہ کی زمین پر پورے قد کے ساتھ چلنا چاہتے

تھے، لیکن افسوس آپ بھی لبرل نکل آئے۔

ہاں، جناب رفیق تارڑ صاحب یہی المیہ ہے، اس ملک کا کہ ہم لوگ صرف اس وقت تک مسلمان رہتے ہیں، جب تک صدر نہیں بنتے، اس وقت تک پاکستانی رہتے ہیں، تک پارلیمنٹ ہاؤس کے ٹھنڈے، گرم ہالوں میں گھومنے والی گداز کرسیوں پر نہیں بیٹھتے، ہمارے کان اور ہماری آنکھیں صرف اس وقت تک کام کرتی ہیں جب تک ہم ہوٹر کی آواز نہیں سنتے، جب تک ہم سلیوٹ وصول نہیں کرتے۔

افسوس، ایک شخص گھر سے نکلا تو سچا عاشق رسول ﷺ تھا، منزل پر پہنچا تو لبرل ہو گیا، صد افسوس ایک دیہاتی میلا دیکھنے نکلا تو سچا، شہر پہنچا تو اپنی سادگی، اپنی سچائی اور اپنے کھرے پن پر شرمندہ ہو گیا۔

اکیسویں صدی کا ولی

جب میں پروفیسر احمد رفیق سے پہلی بار ملا تو دل اسے بزرگ ماننے پر تیار نہ ہوا۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں، مثلاً اس کا کلین شیو ہونا، مسلسل سگریٹ پئے جانا، ان موضوعات پر بلا تکان گفتگو کرنا، جن کے ذکر پر ہی کمزور دل حضرات کے کان سرخ ہو جاتے ہیں اور اپنی بے عزتی پر قہقہہ لگا کر مخاطب کو داد دینا وغیرہ وغیرہ لیکن جب میں مایوس ہو کر اٹھنے لگا تو اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ مجھ سے کہنے لگا۔ ''اپنا نام تو بتاتے جاؤ'' میں نے فوراً بتا دیا (یہی میری غلطی تھی) تو ہنس کر بولا: ''تمہارے اندر ''انگزائٹی'' بھری ہے، غصہ اور نفرت ابل رہی ہے، اگر یہ باہر نہ نکلی تو تم پھٹ جاؤ گے، بالکل اس طرح جیسے غبارہ دھماکے سے پھٹتا ہے۔'' میں نے کہا: ''تمہیں کیا غرض'' تو بولا ''مجھے تم سے بڑی غرض ہے، ذرا بیٹھو میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' اور میری حماقت دیکھئے میں شغل ہی شغل میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے بعد پتہ نہیں اس نے مجھ پر کیا پھونکا کہ آج آٹھ برس ہو چکے ہیں میں اسی کے پاس بیٹھا ہوں، کہیں بھی بھاگ جاؤں، کہیں بھی چھپ جاؤں کہیں بھی غائب ہو جاؤں، خود کو اسی کے قریب پاتا ہوں۔ اسی صوفے، اسی کمرے اور اسی نیم تاریک ماحول میں رہتا ہوں اور اب تو یقین ہو چکا ہے کہ شاید پچاس برس بعد بھی جب کوئی مجھ سے پوچھے گا تمہاری زندگی کا حیرت انگیز واقعہ کیا ہے؟

تو میں بلا سوچے سمجھے کہہ دوں گا۔ ''پروفیسر احمد رفیق۔''

اور اگر کوئی پوچھے گا۔

''تمہاری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کیا ہے؟''

تو میں بلاکم و کاست کہہ دوں گا۔ ''پروفیسر احمد رفیق۔''

اور گر کوئی پوچھے گا۔

''تمہاری زندگی کی سب سے بڑی محرومی کیا ہے؟''

تو بھی میں بلا خوف تردید کہہ دوں گا ''وہ وقت جو میں نے پروفیسر احمد رفیق سے دور رہ کر گزارا۔''

اور اگر پوچھنے والا پوچھے گا۔

''کیوں؟''

تو میں فوراً کہوں گا ''اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو شاید میں باقی زندگی بھی جھوٹے خداؤں کی پرستش میں گزار دیتا۔ اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو شاید میں باقی زندگی بھی اندھیرے میں بھٹکتے بھٹکتے گزار دیتا، اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو میں شاید باقی زندگی بھی کسی صاحب کشف، صاحب دعا اور صاحب نظر بزرگ سے ملاقات کی خواہش لیے ہی گزار دیتا۔ اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو شاید میں باقی زندگی بھی باعمل عالم کی تلاش میں گزار دیتا۔''

لیکن ایسا نہیں ہوا کہ اگر موج، موج ہے تو کناروں سے ضرور ٹکراتی ہے۔ اگر ہوا، ہوا ہے تو قطرہ خون میں ضرور اترتی ہے اور اگر روشنی، روشنی ہے تو وہ اندھیروں کا سینہ ضرور چیرتی ہے۔

میں نے پروفیسر احمد رفیق سے پوچھا۔ ''پروفیسر صاحب آپ ایک نظر میں لوگوں کو کیسے جان لیتے ہیں؟'' پروفیسر نے قہقہہ لگایا اور بولا ''جب اللہ سے دوستی کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے تو وہ اپنے دوستوں کو بہت سی کنجیاں دے دیتا ہے۔ ان کنجیوں میں ایک کنجی دلوں کے قفل کھولنے کی بھی ہوتی ہے۔''

''یہ کیا کنجی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

یہ علم اسماء ہے۔ قرآنی اسماء جو قدرت کی ہارڈ ڈسکس ہیں، یہ ہارڈ ڈسکس چودہ (حروف مقطعات) ہیں، ہر ڈسک میں مختلف لوگوں کے ذہنی اور روحانی حالات درج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان حروف کے علم سے نوازا ہے لہٰذا جونہی کوئی نام میرے کانوں سے ٹکراتا ہے، اس کی پوری شخصیت میرے دماغ میں اتر آتی ہے۔''

میں نے پروفیسر سے پوچھا: ''پروفیسر صاحب آپ کو خدا کیسے ملا؟''

اس نے اسی اطمینان سے جواب دیا: ''صرف خلوص سے، جب میں نے خدا کو پہچان لیا تو میں نے دیکھا کسی بزرگ نے اسے پانے کے لیے چالیس برس جنگلوں میں ننگے پاؤں گزار دیے، کوئی کنوئیں میں الٹا لٹک کر وظیفہ کرتا رہا، کوئی دریا میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر اسے یاد کرتا رہا......... تو میں نے اپنے رب سے دعا کی یا اللہ اگر صرف جسمانی طور پر مضبوط لوگ ہی تمہیں یاد کر سکتے ہیں تو شاید میں پوری عمر تمہیں نہ پا سکوں لیکن اگر کمزوروں کا بھی تم پر اتنا ہی حق ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میں زندگی میں کبھی تم سے رُخ نہیں بدلوں گا، تم سے اپنی ''کمٹمنٹ'' نبھاؤں گا'' تو مجھے خدا مل گیا۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا ''پروفیسر صاحب آج کل خدا کی کیا پوزیشن ہے؟''

پروفیسر نے قہقہہ لگایا اور بولا ''آج کل خدا کی پوزیشن کو بڑا خطرہ ہے، ادھر دنیا میں اطلاعات اور علوم کا ایٹم بم پھٹ چکا ہے، ذہنوں میں نئے سوال پیدا ہو چکے ہیں لیکن ادھر ہمارے مولوی ابھی تک اونٹ پر سواری کے دور سے گزر رہے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں سوال دنیا کے بہترین اداروں کے پڑھے لکھے اعلیٰ ترین دماغ کرتے ہیں لیکن جواب وہ ان پڑھ اور گنوار مولوی دیتا ہے، جسے ابھی تک چاند کی تسخیر کا دعویٰ ہضم نہیں

ہوا۔ لہٰذا انہیں ہماری سمجھ آتی ہے اور نہ ہم ان کی سمجھ سکتے ہیں۔ اس ''کمیونیکیشن گیپ'' میں اللہ تعالیٰ کا تصور تیزی سے ''ڈی شیپ'' ہو رہا ہے، نعوذ باللہ اہل یورپ کی نظر میں اس کی ایک متعصب، تنگ نظر اور وحشی قوم کے ''لیڈر'' جیسی شکل بن رہی ہے۔ چنانچہ جب تک پڑھے لکھے اور جدید علوم وفنون سے آراستہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ''ایڈوائزر'' بن کر سامنے نہیں آئیں گے، خدا کا تصور وسیع نہیں ہو گا۔''

پروفیسر کی کہانی بڑی عجیب ہے۔ ایم اے انگریزی کیا، لاہور کے ایک کالج میں پروفیسری کی، شاعری کی، ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کیا، لیکن اس دوران جب اللہ تعالیٰ سے ڈائریکٹ ڈائلنگ شروع ہوئی تو گوجر خان آ بیٹھا، جہاں اب دن رات ذہنوں کی پیاس بجھاتا ہے، گمراہوں کو راہ دکھاتا ہے، پریشان حال لوگوں کے دکھ سنتا ہے اور آخر میں ہر آنے والے کو کاغذ کی ایک چٹ پر چند اسماء الٰہی لکھ دیتا ہے، اب پتا نہیں ان اسماء الٰہی میں کیا ''جادو'' ہے۔ جو انہیں پڑھتا ہے وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور خدا اس کا ہو جاتا ہے اور جب خدا اور بندہ باہم مل کر ایک ہو جائیں تو دنیا کا کوئی مسئلہ، مسئلہ رہ جاتا ہے؟

اگر پروفیسر کی ذات سے ''روحانی بلوغت'' نکال بھی دی جائے تو بھی اللہ تعالیٰ نے اسے دلوں پر اثر کرنے والی شخصیت، جاذب طرز تکلم اور بے پایاں علم سے نوازا ہے۔ جس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین کے لیے کسی دوسرے معجزے کی ضرورت نہیں رہتی۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا: ''پروفیسر صاحب آپ نے اتنا علم کہاں سے حاصل کیا؟''

وہ گہرے اطمینان سے بولا: ''خدا سے کہ سارے علوم کے دھارے اسی کی ذات سے نکلتے ہیں۔ جو اس کا ہو گیا وہ گویا علم کے سمندر میں ڈوب گیا۔''

اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا کیا آج کا کوئی انسان پروفیسر کے بغیر خدا کے جدید تصور کو چھو سکتا ہے تو جواب ملا نہیں کہ اکیسویں صدی کے لوگوں کو صرف پروفیسر احمد رفیق سے ہی روشنی مل سکتی ہے کیونکہ صرف یہی شخص ہے، جو نہ صرف اکیسویں صدی کے دماغ کو سمجھتا ہے بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ خدا کی بات کو کس لہجے اور کس فریکوئنسی میں کہا جائے تو وہ دلوں کے قفل توڑ کر ذات میں رچ جاتی ہے، بس جاتی ہے۔

ٹھنڈے سائے والا

مجھ سے اگر کوئی پوچھے تم نے کبھی وہ خضرِ حیات دیکھا ہے، جو بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتا ہے، مایوسوں کو امید دلاتا ہے اور ہارے ہوؤں کو زندگی دیتا ہے تو میں فوراً کہوں گا "ہاں" وہ میانے قد کا گورا چٹا شخص ہے، اس کی ناک تیکھی اور ہونٹ پتلے ہیں، اس کی آواز باریک اور چھید کر دینے والی ہے، اس کی آنکھوں میں دلوں تک پہنچنے والی روشنی ہے، اس کے مصافحے میں قرونِ اولیٰ کے مجاہدوں کی گرمی اور معانقے میں پرانی، سینکڑوں برس پرانی خانقاہوں کی ٹھنڈک ہے، تو پوچھنے والا کہے گا...... یہ تو اپنے نسیم انور بیگ ہیں، تو میں کہوں گا ہاں آج کے خضرِ حیات انکل نسیم انور بیگ ہی ہیں۔

شام ہوتے ہی اسلام آباد کے تمام "بڑے دماغ" دفتروں سے نکلتے ہیں، اپنے اپنے موبائل بند کرتے ہیں، پروٹوکول سکواڈ کو چھٹی دیتے ہیں، ٹائی ڈھیلی کرتے ہیں، کوٹ اتار کر پچھلی سیٹوں پر اچھالتے ہیں اپنی ذات سے آپ جناب سرکار کی تختیاں اکھاڑ کر پرے پھینکتے ہیں اور اپنی اپنی گاڑیاں خود ڈرائیو کرتے ہوئے "آستانے" پر آجاتے ہیں، جہاں انہیں سینڈوچز ملتے ہیں، سموسے ملتے ہیں، جلیبیاں اور کیک ملتے ہیں، ابلتی ہوئی گرم چائے ملتی ہے اور اس حد سے اس حد تک پھیلی محبت ملتی ہے، پھر وہ ڈائننگ ٹیبل "ہاؤس آف کامنز" بن جاتی ہے، سب کھل کر باتیں کرتے ہیں، پنجابی، سندھی اور پشتو بولتے ہیں، اپنی ریاکاریوں، اپنی سیاسی، سفارتی اور سرکاری مجبوریوں کا ذکر کرتے ہیں، کیا ہو رہا ہے، کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے پر بلاخوف و تردید بولتے جاتے ہیں بولتے جاتے ہیں، اس دوران انکل کے چہرے پر ایک شفیق سی مسکراہٹ ہوتی ہے، وہ سب کو دیکھ کر اس طرح خوش ہوتے ہیں، جس طرح ماں اپنے شریر بچوں کو دیکھ دیکھ کر زیرِ لب مسکراتی ہے۔ اس لمحے اگر کسی کا ہاتھ رک جائے یا کسی کی پلیٹ خالی ہو جائے تو وہ فوراً ٹرے اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور پھر اصرار اور انکار کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہدف لاکھ انکار کرے، بس جی انکل بس، نسیم بھائی پیٹ بھر چکا ہے، بیگ صاحب میرا کوٹہ پورا ہو چکا ہے لیکن انکل اپنی منوائے بغیر نہیں ٹلتے، لہٰذا مجبوراً پلیٹیں پھر آباد ہو جاتی ہیں، چمچ اور کانٹے دوبارہ بولنے لگتے ہیں، چائے کی گرمی ایک بار پھر رگیں نرم کرنے لگتی ہے، گفتگو کا دریا ایک بار پھر رواں ہو جاتا ہے۔

انکل نسیم کی ساری عادتیں عجیب ہیں۔ وہ جب کسی سے اختلاف کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے اس سے اتفاق کر رہے ہیں، جب کوئی اچھی بات کرتے ہیں تو فوراً "یہ تمہاری انسپائریشن ہے، یہ تم نے مجھے دیا" کہہ کر اسے دوسرے کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ اپنے کسی کارنامے کا ذکر کرتے ہیں تو اسے "کرم خاک پائے رسول ﷺ" کے غلاف میں اس طرح لپیٹ دیتے ہیں کہ سننے والا فوراً روضہ رسول ﷺ کا تصور کر کے سرد آہیں بھرنے لگتا ہے۔ جب کسی کو مشورہ دینے لگتے ہیں تو اپنی آواز اتنی نیچی، مدھم اور میٹھی بنا لیتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے مشورہ نہیں دے رہے، چندے کی درخواست کر رہے ہیں۔ ہر شخص سے اتنے والہانہ انداز سے ملتے ہیں کہ وہ سوچنے لگتا ہے "بابا جی" کسی دوسرے کی غلط فہمی میں مجھ سے بغل گیر ہیں، کسی کو مخاطب کرتے ہوئے اس محبت اور گرم جوشی سے پکارتے ہیں کہ وہ سمجھتا ہے بزرگ مجھ سے نہیں کسی دوسرے سے مخاطب ہیں۔

انکل نسیم کی ساری زندگی فارن سروس میں گزری، تیس برس تک یونیسکو میں افسر رہے، کم و بیش اتنے ہی برس پیرس میں گزارے لیکن یہ سب "دکھ" مل کر ان کا ایک بال بھی بیکا نہ کر سکے، لہٰذا دیکھنے والے دیکھتے ہیں انکل کی ساری زندگی میں سفارتی منافقت کا شائبہ تک نہیں، دور دور تک افسرانہ "ٹھسہ ٹھسا" نہیں، گوروں کی احتیاط اور نخوت نہیں، بس ایک دیسی سا "بابا" ہے، جو روز گاؤں سے باہر بیری کے نیچے لسی کا پیالہ اور تندور کی سوکھی روٹی لے کر بیٹھ جاتا ہے، کوئی آ جائے تو جیسے اس کے سارے بھاگ جاگ اٹھے اور اگر کوئی مہمان نہ آئے تو وہ اسے اپنے رب کی طرف سے اظہار ناراضی سمجھ کر ساری رات مصلے پر گریہ زاری کرتے گزار دیتا ہے۔ یہاں تک کہ صبح اس کی پیشانی پر دستک دیتی ہے اور وہ اٹھ کر دوبارہ بیری کے نیچے آ بیٹھتا ہے۔

میں پچھلے دو تین برسوں میں جب بھی ان سے ملا، نہ جانے کیوں نبی رسالت ﷺ کی حیات طیبہ کے دو واقعات فوراً آنکھوں میں اتر آئے:

صحابیؓ نے فرمایا جب بھی ہم رسول اللہ ﷺ کی محفل میں بیٹھتے ہیں، ہم میں سے ہر شخص کو محسوس ہوتا جیسے رسول اللہ ﷺ کی تمام تر توجہ مجھ ہی پر مرکوز ہے، وہ اس ہجوم میں صرف اور صرف مجھے ہی چاہتے ہیں۔

دوسرے صحابیؓ نے فرمایا جب جنگ کی شدت بڑھ جاتی، تلوار چلاتے چلاتے ہمارے بازو شل ہو جاتے، دھوپ سوئیوں کی طرح چبھنے لگتی اور موت کا خوف ہماری روحوں کو چھو کر گزرنے لگتا تو ہم فوراً نبی اکرم ﷺ کے سایہ اقدس میں پناہ لیتے، ان کے پاس کھڑے ہو جاتے وہ ہمیں مسکرا کر دیکھتے اور پھر سارے خوف ختم ہو جاتے، ساری تھکن دور ہو جاتی، سارے حوصلے پلٹ کر واپس آ جاتے، ہم نعرہ تکبیر بلند کرتے اور دوبارہ رزم گاہ میں کود پڑتے۔"

اور میں نے دیکھا اور میں نے سنا انکل کی محفل میں آنے والا ہر شخص یہی دعویٰ کر رہا تھا، وہ صرف مجھے چاہتے ہیں، وہ صرف مجھ سے محبت کرتے ہیں، وہ صرف مجھ پر توجہ دیتے ہیں...... اور کہنے والوں نے تو یہ بھی کہا، جب ہم روزگار کی تلوار چلا چلا کر تھک جاتے ہیں، اختیار کی چکی میں پس کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں،

مکروفریب کے صحرا میں چل چل کر جاں بلب ہو جاتے ہیں تو ہم آ کر انکل کے سائے میں پناہ لیتے ہیں...... کہ رسول ﷺ کے سچے عاشقوں کے سائے بھی بڑے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

اور مجھ سے اگر کوئی پوچھے، تم نے کبھی خضر دیکھا ہے تو میں فوراً کہوں گا، ہاں میانے قد کا یہ گورا چٹا شخص اگر خضر نہیں ہے تو خضر جیسا ضرور ہے کہ اس کی مجلس میں بیٹھنے والا کوئی شخص گمراہ نہیں ہو سکتا، حالات کے سمندر میں ڈوب نہیں سکتا برائی کے صحرا میں بھٹک نہیں سکتا۔

اور مجھے یہ بھی یقین ہے روز قیامت جب ہم انکل نسیم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے تو نبی رسالت ﷺ صرف اس بات پر ہماری شفاعت فرما دیں گے کہ ہم سب انکل نسیم کے بیٹے ہیں، ان کے چاہنے والے ہیں۔

باغی

چکوال سے ذرا دور، کلر کہار سے ذرا باہر اور جنارہ سے ذرا پیچھے لوہے کا ایک پھاٹک، کچی پکی اینٹوں کی چند کوٹھڑیاں، کھانے کا ایک طویل ہال اور ایک سادہ سا ملاقاتی کمرہ ہے، اس پھاٹک، ان کوٹھڑیوں، اس ہال اور اس ملاقاتی کمرے میں چند باریش مسلح نوجوان ٹہل رہے ہیں، ان نوجوان مجاہدین کے سینے کشادہ، ہاتھ چوڑے اور پیشانیاں فراخ ہیں، ان کی آواز میں نرمی، آنکھوں میں حلیمی اور بشرے پر یقین کی سرخی ہے، یہ مولانا اکرم اعوان کے ان ہزاروں "باغیوں" میں سے چند ہیں جو وفاقی اور صوبائی دارالحکومتوں سے سینکڑوں میل دور کھڑے ہو کر انقلاب کی چاپ سن رہے ہیں، یہ لوگ بیک وقت ٹرینڈ فوجی، بہترین ایڈمنسٹریٹر، شاندار معلم اور کائنات کی وسعتوں میں اترنے اور انسانی باطن میں جھانکنے والے اکمل صوفی ہیں، آپ ان سے ہاتھ ملائیں آپ کو ان میں مجاہد کی گرمی اور فوجی کی سختی ملے گی، آپ ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں آپ کو وہاں میزبان کی حلیمی اور شاعر کی نرمی ملے گی، آپ ان کی باتیں سنیں آپ کو ان میں صوفی کے لہجے کی مٹھاس اور مغنی کے گلے کی نزاکت ملے گی۔

میں نے ان کے "کمانڈر" مولانا اکرم اعوان سے پوچھا، ساڑھے چھ فٹ اونچے، سرخ سپید رنگت اور چیتے جیسی آنکھوں والے اکرم اعوان سے پوچھا ان حضرت جی سے جن کی ذات میں ایک شوکت، مخاطب کو مبہوت کر دینے والا دبدبہ اور گردنیں جھکا دینے والا رعب ہے اور جو جب بولتے ہیں تو منہ سے لفظ نہیں ریشم کے نازک تار نکلتے ہیں، میں نے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں؟" اطمینان سے لبریز لہجے میں بولے۔ "یہ کل کے حکمران ہیں، ان میں کچھ گورنر ہیں، کچھ چیئرمین، کچھ سیکرٹری اور کچھ کمانڈر" میں نے حیران ہو کر پوچھا "کون سا کل؟" اسی سکون سے بولے "وہ کل جب پاکستان دنیا کی واحد اسلامی سپر پاور ہوگا۔" میں نے انہیں مزید کریدنے کی کوشش کی "موجودہ نظام کا کیا بنے گا؟" بلند قامت صوفی نے اتنا ہی بلند و بالا قہقہہ لگایا "یہ سوال مجھ سے گورنر صاحب نے بھی پوچھا تھا، میں نے انہیں جواب دیا تھا، جناب یہ نظام اب گیا تو آپ لوگوں کو ساتھ لے کر جائے گا، گورنر نے کہا، مولانا بات سیدھی اور واضح کریں، میں نے عرض کیا جناب منافقت اور ظلم پر ایستادہ نظام جب جاتے ہیں تو پیروکاروں کو بھی ساتھ لے کر جاتے ہیں، کہنے لگے نہیں، اب بھی نہیں سمجھا تو میں نے عرض کیا، گورنر صاحب آپ کی حکومت، آپ کا احتساب بیورو، آپ کی عدالتیں اور آپ کی پولیس جس آصف علی زرداری کو کرپٹ، چور اور ڈاکو قرار دے رہی ہے وہی آصف علی زرداری نہ صرف ملک کے معزز

ترین ایوان کا رکن ہے بلکہ ملک کی تقدیر کے فیصلوں کے لیے بلائے جانے والے ہر اجلاس میں اپنا ووٹ بھی ڈالتا ہے، یہ منافقت نہیں تو کیا ہے، یہ ظلم نہیں تو کیا ہے کہ ایک نظام ایک شخص کو چور بنا کر کٹہرے میں بھی کھڑا کر رہا ہے اور اسی وقت اسے سینیٹر کے حقوق بھی دے رہا ہے۔''

میں نے پوچھا ''کیا اس نظام کے خاتمے کی واحد وجہ یہی ہوگی۔'' ان کے لہجے میں صوفیانہ مٹھاس بڑھ گئی۔ ''جنہیں بچے گا یہ نظام صلاحیت کا قاتل ہے، انسانی صلاحیتوں کی بربادی کا مجرم ہے، ہمارے علاقے میں ایک ڈاکو تھا، محمد خان ڈاکو، یہ شخص تن تنہا ایوب خان جیسے مضبوط حکمران سے لڑتا رہا، پورے ملک کی پولیس، ساری انتظامیہ اس کا حوصلہ نہ توڑ سکی، جب گرفتار ہوا تو اسے 62 بار پھانسی کی سزا سنائی گئی یہ 26 برس تک قید میں رہا لیکن یہ قید، کال کوٹھڑی اور عدالتیں اس کے اعصاب نہ توڑ سکیں وہ تروتازہ رہا اس نے 72 برس کی طویل عمر پائی، ذرا سوچو یہ شخص اگر فوج میں ہوتا تو کیا اس جیسا کوئی دوسرا کمانڈر ہوتا، وہ کسی نپولین، ٹیٹو، ہٹلر یا ڈیگال سے کم ہوتا لیکن افسوس اس نظام نے اسے جرنیل کی بجائے ڈاکو بنا دیا، یہ نظام صلاحیت کا قاتل ہے یہ عمرؓ کو عمر ابن خطابؓ بناتا ہے اسے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نہیں بناتا، ہم نے اپنے اس ادارے میں ایسے لوگ ہی جمع کر رکھے ہیں جنہیں یہ نظام ''عام شخص'' کہتا تھا ہم نے ثابت کیا یہ عام لوگ نہیں ہیں یہ سب محمد خان ہیں، ہم نے انہیں ٹریننگ دی، اب یہ لوگ ویل ٹرینڈ سولجر ہیں، بیدار مغز جرنیل ہیں، کامیاب منصوبے ساز، اعلیٰ پائے کے معلم اور بہترین منتظم ہیں، شریعت کو سمجھتے ہیں، تصوف کے راہی ہیں، معاشرتی بگاڑ کی اصلاح کے خواہش مند ہیں۔''

''تبدیلی کب آئے گی؟'' میرا سوال سن کر مجاہد صوفی مسکرایا، اس کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک ٹمٹمائی اور لہجے میں برساتوں کی مہک پھڑ پھڑائی۔ ''انشاء اللہ ایک آدھ برس میں کیونکہ فصلیں پک چکی ہیں، کٹائی کا موسم آ چکا ہے اب بس ایک اعلان کی دیر ہے اور جوش عمل سے لبریز دہقان درانتیاں لے کر کھیتوں میں اتر جائیں گے'' ''کیا عام شہری آپ کا ساتھ دیں گے؟'' وہ مسکرائے ''ہاں سو فیصد کیونکہ تبدیلی کی خواہش چند لوگوں کی بات نہیں ہر زبان کی دعا اور ہر نظر کی تمنا ہے۔''

باہر، اس سادہ سے ملاقاتی کمرے سے باہر لوہے کا ایک پھاٹک، کچی پکی اینٹوں کی چند کوٹھڑیاں اور کھانے کا ایک طویل ہال تھا جہاں چند باریش نوجوان ٹہل رہے تھے، جن کے سینے فراخ، ہاتھ چوڑے اور پیشانیاں فراخ تھیں جن کی آواز میں نرمی، آنکھوں میں حلیمی اور بشرے پر یقین کی سرخی تھی جن کے قدموں کی ہر آہٹ اور جن کے بدن کی ہر حرکت پکار پکار کر کہہ رہی تھی ہم سب محمد خان تھے لیکن خدا کے اس بندے نے ہمیں ڈاکو بننے سے بچا لیا اب ہم میں سے کوئی نپولین، ٹیٹو، ہٹلر اور ڈیگال سے کم نہیں کیونکہ ہم جمال اور جلال، علم اور حلم کا حسین امتزاج ہیں، ہم صوفی بھی ہیں اور مجاہد بھی، ہم سپاہی بھی ہیں اور عالم بھی اور جب یہ سارے عناصر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو پھر ایسے باغی جنم لیتے ہیں انقلاب جن کی منزل کا پہلا سنگ میل اور تبدیلی جن کی کتاب کا پہلا ورق ہوتی ہے۔

مقناطیس کا پہاڑ

سچ پوچھیں تو پہلی ملاقات پر ایک میٹھی مسکراہٹ، ایک نیم گرم مصافحے اور بھاپ اڑاتے خوشبو دار قہوے کے ایک پیالے کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ آیا لیکن اس کے باوجود میں نے باہر کھلی ہوا میں آکر اعلان کر دیا ''بندہ دلچسپ ہے اس کے ساتھ خوب وقت گزرے گا۔''

یاد نہیں بری امام کے اس درویش کے پاس جسے زیادہ تر لوگ راجہ صاحب اور خال خال راجہ اکرم کہتے ہیں مجھے پہلی بار کون لے کر گیا، انکل نسیم انور بیگ، شاید قاضی ہمایوں یا پھر بھائی ڈاکٹر رفیق لیکن اتنا ضرور یاد ہے پہلی ملاقات تھی بڑی ہوش رہا، میں ڈرا ڈرا، سہما سہما سا اندر داخل ہوا لیکن ایک فاتح کی طرح سینہ پھلا کر نکلا، میرے خوف کی ایک وجہ تھی، میں دراصل وہاں ۲۰ ویں صدی کی آخری ساعتوں کے ایک ایسے روشن ضمیر درویش سے ملنے گیا تھا جس کے بارے میں میرا گمان تھا وہ مقناطیس کا ایک ایسا پہاڑ ہے جو اپنے پاؤں سے اکھڑنے والے لوہے کے ہر ذرے کو اپنے جسم کا حصہ بنا لیتا ہے بس اس ذرے میں چھوٹی حقیقت سے بڑی حقیقت کی طرف جانے کا جذبہ ہونا چاہیے، رہا میرا سینہ پھلا کر باہر نکلنا تو اس کی بھی ایک وجہ تھی، مجھے دراصل وہاں کوئی درویش ہی نہیں ملا، وہاں کوئی مقناطیس کا پہاڑ تھا اور نہ ہی سرے سے کوئی بڑی حقیقت، وہاں تو ایک عام، سادہ، دیہاتی شخص بیٹھا تھا، ہاں البتہ اس کے چہرے پر دو بڑی حیران کن چیزیں تھیں، ایک چاندنی جیسی نرم میٹھی مسکراہٹ اور دوسری آدھ کھلی گہری عمیق آنکھیں۔

میں نے سوچا ''یار یہ کیسا شخص ہے، بولتا ہی نہیں، یہ کیسا درویش ہے، ڈانٹتا ہی نہیں، یہ کیسا ولی ہے جو سامنے بیٹھے شخص کو گنہگار ہونے کا احساس ہی نہیں دلاتا، بھلا صوفی ایسے ہوتے ہیں، اسے تو کامل ولی کی ٹریننگ دینا پڑے گی۔'' لیکن افسوس انہیں میں اس نشست میں اہل تصوف کی گوناگوں خوبیوں سے بہرہ مند نہ کر سکا کیونکہ راجہ صاحب نے اپنے ''طریقہ واردات'' کے مطابق مجھے ''اپنی نبڑ تو'' قسم کے چکر میں ڈال دیا اور میں اس غیر اہم شخص کی طرح جسے کبھی گھر والوں نے بھی قابل توجہ نہ سمجھا ہو آدھ گھنٹہ تک مسلسل یا وہ گوئی کرتا رہا اور مجھ سے راجہ صاحب بڑے مزے سے، میں نے میٹرک کیسے پاس کیا، میں نے ایف اے میں کتنے نمبر لیے، میں نے پنجاب کی بجائے بہاولپور یونیورسٹی سے ایم اے کیوں کیا، میں نے فلاں نوکری کیوں

چھوڑی، مجھے زرافوں کی بجائے زیبرے کیوں پسند ہیں، سن ۲۰۰۲ء خربوزوں کی فصل پر کیوں بھاری ہوگا اور دل کے مرض میں ڈسپرین کی آدھی گولی کیوں لینی چاہیے وغیرہ وغیرہ قسم کا عارفانہ کلام سنتے رہے۔ یہاں تک کہ رات بھیگ گئی اور میں اپنے وعدہ معاف گواہ کے ساتھ واپس لوٹ آیا تاہم میں نے رخصت ہونے سے پہلے اپنے آپ سے یہ وعدہ ضرور لے لیا کہ اس بار تو یہ بچ نکلے ہیں لیکن اگلی ملاقات پر میں انہیں ایک ''کمپی ٹینٹ'' صوفی کی خوبیوں سے ضرور آراستہ کروں گا۔''

پھر ان سے ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا، میں ان سے کئی بار ملا، انہیں لطیفے سنا کر ہنسانے کی کوشش کی، جھوٹے سچے سیکنڈلز بتا کر متاثر کرنے کی سعی کی، گستاخانہ قہقہوں سے ان کی توجہ حاصل کرنے کا جتن کیا لیکن ان کا ایک ہی ردعمل تھا چاندنی کی طرح ایک نرم میٹھی مسکراہٹ، ان ملاقاتوں میں میں نے انہیں صرف ایک بار کچھ کہتے سنا، پورے دس منٹ کا طویل خطاب جس میں انہوں نے پاکستان کے مستقبل پر اپنا تھسیس پیش کیا، کس طرح اللہ کا ایک بندہ ظہور پذیر ہوگا، وہ کس طرح ساری طاقت اپنے ہاتھ میں لے لے گا، کس طرح سب کو کڑے احتساب کے بیلنے سے گزرنا ہوگا، کس طرح گلیوں، بازاروں اور چوراہوں پر ٹکٹکیاں لگائی جائیں گی، کس کو کون کتنے کوڑے مارے گا اور پھر کس طرح پورے ملک میں امن ہی امن ہوگا، خوشحالی ہی خوشحالی ہوگی، انصاف ہی انصاف ہوگا اور امریکہ...... '' وہ چونک کر رکے، گھبرا کر آگے پیچھے دیکھا اور پھر ''خاموش'' کی بات ''عام'' میں کرنے پر شرمندہ سے ہو کر چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ کا ماسک چڑھا لیا اور پھر اس کے بعد میں انہیں جب بھی ملا وہاں مجھے ایک عام سادہ سا دیہاتی ہی ملا، راجہ اکرم صاحب نہیں ملے۔

کل رات میں اپنے اور ان کے مشترکہ استاد جناب چوہدری فضل حسین کے ساتھ ان سے ملاقات کے بعد واپس لوٹا تو سارے راستے اپنے آپ سے الجھتا رہا، ہر بار ایک ہی سوال اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ''اس شخص میں کیا خوبی ہے؟ یہ بولتا ہے، واعظ کرتا ہے، اور نہ ہی کسی کو متاثر کرنے کے لیے پھونکیں مارتا ہے پھر اس کے پاس اتنا مجمع کیوں رہتا ہے، لوگ اس کے پاس کیوں آتے ہیں اور لوگ بھی وہ کہ ان میں ہر شخص اپنی ذات میں ارسطو بھی ہے اور فرعون بھی۔'' میں سوچتا چلا گیا، جواب تراشتا چلا گیا، تاویل پر تاویل کھڑی کرتا چلا گیا لیکن اپنے سوال کے مرتبے کے مطابق مجھے کوئی جواب نہ ملا لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا میں جوں ہی شاہراہ دستور کے اس مقام پر پہنچا جہاں سے ایک سڑک مری روڈ کی طرف جاتی ہے اور دوسری بری امام کے مزار کی طرف مڑتی ہے تو میرے ذہن میں روشنی کا ایک کوندا سا لپکا، میں رک گیا، میں نے دیکھا میرے سوال کا جواب میرے سامنے دھرا تھا بالکل اس طرح جس طرح چائے کا گرم کپ میرے سامنے میز پر رکھا ہے اور میں اس کی گرمائش محسوس کر رہا ہوں۔

جواب نے کہا'' بے وقوف اس خوبی کے بعد بھی کسی خوبی کی گنجائش رہتی ہے کہ کسی شخص کے پاس بیٹھ کر چھوٹے سے چھوٹے شخص کو اپنے چھوٹے ہونے کا احساس نہ ہو۔'' جواب نے کہا'' بے وقوف دنیا کہنے

والوں سے بھری پڑی ہے لیکن راجہ صاحب کی طرح سننے والے چند ایک ہی ہیں۔'' جواب نے کہا۔'' بے وقوف جسے اللہ تعالیٰ نے مسکراہٹ کی کرامت دے رکھی ہو اس سے بڑا ولی کون ہوگا۔'' جواب نے کہا'' بے وقوف جس شخص میں اتنی پذیرائی کے باوجود میں نہ ہو اس سے بڑا صوفی کون ہوگا۔'' جواب نے کہا'' دنیا جس شخص کے دروازے پر پڑی رہتی ہو لیکن وہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا ہو اس سے بڑا پیر کون ہوگا۔'' جواب نے کہا'' جس شخص میں مرعوبیت نہ رہی ہو جس کی حیرت ختم ہوگئی ہو، اس سے بڑا بزرگ کون ہوگا۔'' یہاں پہنچ کر میں پسینے میں بھیگ گیا مجھے یوں محسوس ہوا میں لوہے کا ایک چھوٹا سا ذرہ ہوں اگر میرے قدم اکھڑ گئے، ایک لمحے کے لیے اکھڑ گئے تو میں اُڑ کر مقناطیس کے پہاڑ کا حصہ بن جاؤں گا، چھوٹی حقیقت سے نکل کر بڑی حقیقت میں گم ہو جاؤں گا۔

میں نے فوراً اپنے قدم مضبوطی سے زمین پر جما لیے۔

دو لائنیں

چوہدری فضل حسین صاحب کا اداس ہونا بالکل ایسے ہے جیسے گلاب کی ٹہنیوں پر آک کی "امیاں" اگ آئیں یا موتیے کے پھولوں سے سڑے ہوئے چمڑے کی بو آنے لگے۔

آج سے بارہ تیرہ برس پہلے جب میں زمیندار کالج گجرات میں ایف اے کا طالب علم تھا تو چوہدری صاحب پرنسپل تھے، میں نے انہیں سننے سے پہلے اور انہیں سننے کے بعد کوئی ایسا استاد نہیں دیکھا جو طالب علموں میں اتنا پاپولر ہو بلکہ اگر آپ تھوڑی سی جسارت کی اجازت دیں تو میں عرض کروں گا شاید ہی ملک میں ان جیسا صاحب علم، عمیق مدبر اور جوش عمل سے بھرپور کوئی دوسرا استاد ہو، آپ انہیں سنیں آپ کو یوں محسوس ہوگا آپ کے سامنے جو دھان پان سا شخص کھڑا ہے، جس نے سفید براق لباس پہن رکھا ہے اور جس کے سر پر جناح کیپ ہے، ذرا سی ترچھی جناح کیپ، اس کے حلق میں اللہ تعالیٰ نے زبان نہیں گراریاں لگا رکھی ہیں وہ بولتا نہیں، کہتا ہے اور کہتا بھی ایسا کہ سننے والے کی طبیعت میں بشاشت آ جائے، اس کے وجود میں سینکڑوں ذائقے جاگ اٹھیں۔

کسی شخص کا پر مزاح ہونا کوئی بڑی بات نہیں، قہقہہ تو بھانڈ بھی لگوا لیتے ہیں تالی تو جوکر بھی بجوا لیتے ہیں لیکن چوہدری صاحب جیسی حس مزاح کا مالک ہونا واقع بڑی بات ہے کیونکہ چوہدری صاحب کی بات، طنز اور پھبتی میں کاٹ کی بجائے مٹھاس ہوتی ہے، آپ نے شاید ہی ایسا شخص دیکھا ہو جو کسی پر تنقید کی چاند ماری کر رہا ہو اور ہدف بھی اسی خروش سے قہقہے لگا رہا ہو جس اہتمام سے سامعین پیٹ پکڑے بیٹھے ہوں، بس چوہدری صاحب کی یہی خوبی ہے وہ بڑی سے بڑی علمی، گھمبیر سے گھمبیر فکری اور تیز سے تیز تر بات اس ہلکے پھلکے انداز میں کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے کو عرصے بعد پتہ چلتا ہے جس بات پر وہ قہقہے لگا رہا تھا وہ دراصل لطیفہ نہیں مرثیہ تھا، رہی ان کی تنقید تو وہ اس تیر انداز کی طرح ہیں جو کمان پر تیر چڑھانے سے پہلے اسے شہد میں بھگو لیتا تھا یا اس ماں کی طرح ہیں جو غصے میں اپنے بچے کو مارتی ہے تو جسم کے ایسے حصوں کا انتخاب کرتی ہے جہاں سے ٹیسیں نہیں اٹھتیں۔

گزشتہ روز جناب شعیب شاہ کے گھر چوہدری صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے بجھے بجھے سے نظر

آئے، میں نے انہیں غور سے دیکھا، ان کا ستر برس ''پرانا'' چہرہ بدستور بے شکن تھا، سر پر جناح کیپ بھی تھی، بے داغ براق لباس بھی زیب تن تھا، باتوں میں شوخی اور آنکھوں میں جوانی کی چمک بھی اسی طرح قائم تھی، علم اور فکر کا دریا بھی ابھی تک جوہڑ نہیں بنا تھا لیکن اس کے باوجود ان میں کسی چیز کی کمی تھی، کوئی ایسا ملال، کوئی غیر محسوس تاسف، کوئی ہلکی ہلکی خلش ضرور تھی جو چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی نہیں یہ وہ چوہدری فضل حسین نہیں ہیں جو کبھی ہوا کرتے تھے، ان پانیوں میں ریت آ چکی ہے، اب ان باتوں سے رنگ اڑتے جا رہے ہیں، لالہ موسیٰ سے جہلم کی طرف بڑھتے ہوئے، جب شام افق سے اُتر کر دلوں پر دستک دے رہی تھی تو میں نے ان سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی وہ خلاف معمول ایک طویل اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ ''جاوید میاں پچھلے کچھ عرصے سے ایک کہانی تنگ کر رہی ہے۔'' ایک لمحے کے لیے رکے، پھر سانس لیا۔ ''نہیں پوری کہانی نہیں صرف دو لائینیں، جب بھی تنہا ہوتا ہوں جب بھی سوچتا ہوں، یہ دو لائینیں تلوے میں چھپے کانٹے کی طرح دماغ میں چبھنے لگتی ہیں، زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے۔'' سورج اندھیرے کی چادر میں چھپ چکا تھا، اب وہاں اُفق سے سڑک تک ایک ملگجا سا اندھیرا تھا، میں نے پوچھا۔ ''یا استاد وہ کون سی ایسی بھاری لائینیں ہیں جنہوں نے آپ جیسے آہنی شخص کا حوصلہ توڑ دیا۔'' چوہدری صاحب شیشے سے باہر جھانک کر بولے۔ ''میں نے کہیں بہت پہلے منٹو کا ایک افسانہ پڑھا تھا، اتنا پہلے کہ مجھے اس کا عنوان، اس کی کہانی، اس کے سارے کردار تک بھول گئے، بس یاد رہیں تو دو چیزیں، ایک یہ کہ وہ کہانی تقسیم ہند کے فسادات پر لکھی گئی تھی اور دوسری یہ کہ اس میں دو ایسی لائینیں تھیں جو بذات خود ایک مکمل کہانی ہیں۔'' وہ پھر خاموش ہو گئے۔

باہر اندھیرا گہرا ہو رہا تھا، سڑک کے کنارے کھڑے درخت مکروہ دیوزادوں کی طرح ڈرا رہے تھے، میرا تجسس آخری حدوں کو چھو رہا تھا، انہوں نے شہادت کی انگلی سے پیشانی پر دستک دی۔ ''وہ لائینیں کچھ یوں ہیں، دو شخص جا رہے تھے، ایک نے دوسرے سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے، اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کچھ کہا، اتنا مدہم کہ اس کی آواز خود اس کے کانوں تک نہیں پہنچ پائی، دوسرے نے فوراً نعرہ لگایا اور اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔'' میں نے کچھ نا سمجھنے کے باوجود گردن ہلا دی، چوہدری صاحب بھی آخر پورے استاد تھے۔ فوراً میری جہالت تک پہنچ گئے۔ لہٰذا آہستہ سے بولے ''بیٹا میں محسوس کر رہا ہوں، ہمارے شہروں، ہمارے قصبوں میں لوگ اب اپنے ناموں کے وہ حصے کاٹ رہے ہیں جن سے ان کے شیعہ یا سنی ہونے کا گمان ہوتا ہے، مجھے ڈر ہے اگر فوری طور پر فرقہ پرستی کی یہ آگ بجھائی نہ گئی تو شاید آنے والے چند برسوں میں ایسا وقت آ جائے جب ایک راہ گیر دوسرے سے اس کا نام پوچھے، دوسرا بتانے سے پہلے اس کا نام پوچھے، دونوں جیب سے ریوالور نکالیں، دونوں گولیاں چلائیں اور دونوں ڈھیر ہو جائیں۔''

رات گہری ہو چکی تھی، ہم جہلم سے باہر آ چکے تھے، ابھی چند لمحوں میں کالا گوجراں آئے گا جہاں میری زندگی کے حیران کن شخص نے اُتر جانا تھا اور اس کے بعد میں نے اسلام آباد تک ان دو چبھتی، آگ لگاتی اور

سلگتے ریز کی طرح دھوں چھوڑتی لائینوں کے ساتھ سفر کرتا تھا، میں نے ہلکی ٹھنڈی ہوا کا گھونٹ بھرا اور اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''ایک ستر برس کا بوڑھا جس نے پوری زندگی امید بوئی اور امید ہی کاٹی ہو، زندگی کی آخری ساعتوں میں، ایک ایسے بدترین دور میں خود کو مایوس ہونے سے کیسے بچا سکتا ہے جب لوگ موت کے خوف سے اپنے نام تک بدلنے لگیں؟'' مجھے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔

چوہدری صاحب کالا گوجراں میں اتر گئے لیکن چبھتی ہوئی آگ لگاتی ہوئی اور دھواں چھوڑتی ہوئی دو لائینیں مجھے تحفے میں دے گئے اور اب یہ میرے تلوے میں چبھے کانٹے کی طرح ہر قدم پر ٹیس بن کر اٹھتی ہیں اور چیخ بن کر نکلتی ہیں۔

لارنس آف عریبیہ

تقریباً ایک صدی پرانا قصہ ہے۔

برٹش آرمی میں ایک کرنل تھا، کرنل نیڈو، وہ کسی اہم سرکاری ذمہ داری پر لندن سے ہندوستان آیا تو اس نے واپسی سے قبل ''میجک آف انڈیا'' کے مشاہدے کا فیصلہ کیا، مزاج درویشانہ تھا چنانچہ ایک عام سیاح کی حیثیت سے سیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا، ہندوستان کے مختلف شہر، قصبے اور تاریخی مقامات سے ہوتا ہوا آخر میں گلمرگ جا پہنچا۔ اس وادی کے حسن نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ لوگ بتاتے ہیں کرنل نیڈ کو وہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہ ہفتوں وہیں پڑا رہا۔ سارا دن کچے پکے راستوں، پہاڑی جھرنوں، آبشاروں اور دھند میں لپٹے درختوں کی تلاش میں گھومتا رہتا، ایک روز عجیب واقعہ پیش آیا جب وہ گلمرگ سے باہر کی کچی پگڈنڈی پر حیران پھر رہا تھا تو ایک گنوار گوجر لڑکی اس سے آ ٹکرائی، اس ٹکراؤ نے وہی کام کر دکھایا جو پٹرول کے ڈرم میں ماچس کا شعلہ دکھاتا ہے یا تپتے توے پر گھی کی بوند دکھاتی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کرنل نیڈو اس معمولی سی لڑکی کے لیے پاگل ہو گیا، نوکری سے استعفیٰ دے دیا، لندن کے مضافات میں اپنی وسیع جاگیر سے دستبردار ہو گیا اور سارے پرانے یار احباب چھوڑ دیئے۔

عشق آگے بڑھا تو لڑکا لڑکی نے شادی کا فیصلہ کر لیا لیکن گوجر قبیلے کی شرطیں بڑی کڑی تھیں پر نیڈو بھی اس لڑکی کے لیے ہر عذاب جھیلنے کو تیار تھا چنانچہ اس نے سوٹ کی جگہ پسینے میں بھیگا بدبودار فرن پہنا، گوجری زبان سیکھی، کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا۔ بھیڑ بکریاں چرائیں، لکڑیاں کاٹیں، چارے کے گٹھے اُٹھائے، جنگلی ریچھوں سے کشتی کی، مقامی نوجوان سے ''گتکا'' کھیلا اور سیاہ اندھیری راتیں جنگلوں میں گزاریں تب جا کر کہیں قبیلے کی ریت رسموں میں اس اجنبی کی گنجائش پیدا ہوئی۔ یوں نیڈو اور وہ گوجر لڑکی ایک طویل آزمائش کے بعد یک جان ہو گئے، شادی ہوئی، دو سال بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

کرنل بندہ سمجھدار تھا، لہٰذا اس نے پوری زندگی بھیڑ بکریاں پالنے کی بجائے بھیڑ بکریوں کا کاروبار شروع کر دیا، نیک نیت بھی تھا اور پڑھا لکھا بھی، چنانچہ کاروبار چمک اٹھا تو بستی سے گلمرگ اٹھ آیا، وہاں بکریاں بیچ کر ریسٹورنٹ بنایا، پھر ہوٹل اور پھر بڑے بڑے ہوٹل۔ الغرض بیس برسوں میں اس کا شمار ہندوستان

کے بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا۔

ہم کچھ دیر کے لیے اس کہانی کو یہیں روکتے ہیں۔

برٹش آرمی کا بین الاقوامی شہرت یافتہ کردار کرنل لارنس (جسے عرف عام میں لارنس آف عریبیہ کہا جاتا تھا) عجیب سخت جان شخص تھا۔ وہ بغیر کچھ کھائے پیے ہفتوں صحرا میں زندہ رہ سکتا تھا، صفر درجے سے نیچے جہاں پانی برف بن جاتا ہے، وہ ننگ دھڑنگ گھنٹوں کھڑا رہ سکتا تھا، تیز بہاؤ کے اُلٹ گھنٹوں تیر سکتا تھا، وہ بھوکے شیروں کے غاروں میں داخل ہوتے چند سیکنڈ لگاتا تھا بل میں ہاتھ ڈال کر سانپ کو پھن سے پکڑ کر باہر کھینچ لیتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ چاروں آسمانی کتابوں کا حافظ تھا عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی اس روانی سے بولتا تھا کہ بڑے سے بڑا اصاحب زبان بھی دھوکہ کھا جائے، اتنا سحر البیان تھا کہ مخاطب کی سانس تک کھینچ لیتا تھا۔ شاید انہی خوبیوں کے باعث اسے ''درندے کی چمڑی میں دانشور کا دماغ'' کہا جاتا تھا۔

کرنل لارنس جب ''ترک سلطنت'' کی ''بغاوت'' کچل کر ''ڈیزرٹ آف ڈ۔تھ'' سے واپس لوٹا تو اسے کمانڈر کی طرف سے فوراً ہندوستان پہنچنے کا حکم ملا وہ اگلے ہی روز دہلی روانہ ہو گیا، جہاں نیا حکم اس کا منتظر تھا۔ قصہ مختصر جب وہ وائسرائے کے ''محل'' میں داخل ہوا تو وائسرائے نے اس کا اس طرح استقبال کیا، جس طرح بڑی قومیں اپنے ہیرو کا کیا کرتی ہیں، دن بھر کے جشن کے بعد جب رات نے دستک دی تو نشے میں چور وائسرائے نے اسے وہ حکم نامہ تھما دیا جس میں لارنس کی نئی ذمہ داری درج تھی۔ لارنس نے حکم نامہ پڑھا اور کچھ دیر سوچ کر بولا ''ہزایکسی لینسی! مجھے داڑھی بڑھانے کے لیے چند دن لگیں گے۔ آپ کسی ایسے مسلمان کا بندوبست کر دیں جو مجھے اسلامی شعائر سکھا دے۔'' وائسرائے نے سینے پر ہاتھ رکھا اور بولا ''آپ سمجھیں آپ کا کام ہو گیا۔''

کرنل لارنس کی ہندوستان آمد کے چھ ماہ بعد لاہور میں مدینہ شریف سے آنے والے ایک بزرگ کا غلغلہ مچا، ''شاہ جی'' پرانی انارکلی کے ایک تنگ و تاریک گھر میں رہتے تھے، بڑے قرآن فہم تھے، اللہ تعالیٰ نے گلا بھی اچھا دیا تھا لہٰذا جب سورہ فتح کی تلاوت فرماتے تو چلتے قدم رک جاتے اور پرندے پرواز بھول جاتے، دعاؤں میں اس قدر اثر تھا کہ جو کہہ دیتے دوسرے ہی روز پورا ہو جاتا، مہمان نواز اتنے کہ سارا دن لنگر جاری رہتا چنانچہ ہر وقت زائرین کا تانتا بندھا رہتا، ادھر ان کی شہرت تھی کہ پھیلتی ہی جا رہی تھی، یہاں تک کہ چند ماہ میں ان کے مریدین پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔

اب ہم پہلی اور دوسری کہانی کو ملاتے ہیں۔

جب یہ شہرت پھیلتے پھیلتے گلمرگ پہنچی تو نیڈو جسے اب بزرگوں کی تلاش کا خبط ہو چکا تھا، شاہ جی سے ملاقات کے لیے لاہور آ پہنچا، آستانے پر حاضری دی تو شاہ جی نے نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نیڈو ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔'' کرنل نیڈو کے لیے شاہ جی کا فرمانا بڑا حیران کن تھا کیونکہ پچھلے ۲۲ برسوں سے لوگ

اسے عبداللہ کے نام سے جانتے تھے، بہر حال چند منٹوں کی اس ملاقات کے دوران عبداللہ (نیڈو) ''شاہ جی'' کے ہاتھ بیعت ہوگیا جس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، سال چھ ماہ میں شاہ جی گلمرگ کا چکر لگا لیتے جبکہ ہر دوسرے تیسرے ماہ عبداللہ (نیڈو) ہفتہ دس دن کے لیے لاہور آ جاتا، انہی ملاقاتوں کے دوران کسی کمزور لمحے میں عبداللہ (نیڈو) نے اپنی پابند صوم وصلوٰۃ بیٹی شاہ جی کے عقد میں دینے کا فیصلہ کرلیا۔ شاہ جی سے عرض کی گئی تو شاہ جی نے اس نیک کام کے لیے فوراً حامی بھرلی یوں چند ہی روز میں عبداللہ نے اپنی بیٹی عین سنت کے مطابق دو کپڑوں میں شاہ جی سے بیاہ دی۔

شادی کے دو ہفتے بعد جب عبداللہ لاہور آیا تو بیٹی نے اس کے پاؤں میں گر کر رونا شروع کردیا۔ عبداللہ پریشان ہوگیا۔ بہر حال قصہ مختصر بیٹی نے باپ کو بتایا کہ شاہ جی کے بھیس میں یہ شخص ''لارنس آف عریبیہ'' ہے جو مسلمان نہیں، یہودی ہے اور مسلمانوں میں فرقہ واریت کا زہر پھیلانے کے لیے ہندوستان آیا ہے۔

عبداللہ (نیڈو) فوراً شاہ جی کے ''حضور'' حاضر ہوا جہاں دونوں کے مابین طویل تکرار ہوئی، جس میں ''لارنس آف عریبیہ'' نے نہایت ڈھٹائی سے نہ صرف سارے الزامات تسلیم کرلیے بلکہ ''کرلو جو کرتا ہے'' قسم کی دھمکیاں بھی دے ڈالیں، قصہ مزید مختصر لڑکی کو اندر بند کردیا گیا۔ عبداللہ کو دھکے دے کر بھگا دیا گیا اور شہر میں مشہور کردیا گیا عبداللہ ملحد ہے۔ جو شخص اس کو جہاں دیکھے فوراً قتل کردے۔ قصے کو مزید مختصر کرتے ہیں۔ یہ عبداللہ رستم زماں گاماں پہلوان کے پاس گیا اور اسے ساری کہانی سنائی۔ ''گاماں'' پہلوان ہونے کے ساتھ ساتھ سچا عاشق رسول ﷺ بھی تھا وہ فوراً اپنے پٹھوں کے ساتھ اسی وقت پرانی انارکلی پہنچا۔ ''شاہ جی'' کو گریبان سے پکڑ کر باہر لایا اور تھڑے پر کھڑے ہوکر لارنس آف عریبیہ کو پاؤں سے پکڑ کر الٹا لٹکا دیا اور اعلان کیا جب تک یہ شخص عبداللہ کی بیٹی کو طلاق نہیں دیتا یہیں لٹکا رہے گا۔ الغرض چند گھنٹوں کی کوشش کے بعد شاہ جی نے سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں نہ صرف اپنے سارے گناہوں کا اعتراف کیا بلکہ عبداللہ کی بیٹی کو بھی آزاد کردیا۔

بعد ازاں یہ لڑکی شیخ برادری کے ایک گورے چٹے نوجوان عبداللہ سے بیاہی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے بعد ازاں اس شیخ لڑکے کو بڑی عالمگیر شہرت اور عزت سے نوازا۔ جی ہاں اس لڑکے کا نام شیخ عبداللہ تھا اور یہ خاتون مقبوضہ کشمیر کے موجود کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی والدہ ہیں۔

جب مجھے دنیا کے نامور دست شناس اور عبداللہ خاندان کے قریبی دوست شمیم قریشی نے یہ قصہ سنایا تو میں نے بے اختیار کہا۔ ''قریشی صاحب اس عفت مآب خاتون کا مقدر ہی خراب تھا۔ ''شاہ جی'' کے ہاتھ سے نکلی تو ''شیخ جی'' کے ہاتھ جا لگی، ایک لارنس سے بچی تو دوسرے لارنس آف عریبیہ کے جال میں جا پھنسی۔''

قلاش

روز ٹھیک چھ بجے ایک جہاز میرے گھر کے اوپر سے گزرتا ہے، اس کی آواز جوں ہی میرے کانوں سے ٹکراتی ہے، میں بھاگ کر چھت پر جاتا ہوں اور پھر اس وقت تک پاگلوں کی طرح آسمان پر نظریں لگائے کھڑا رہتا ہوں، جب تک جہاز باریک نقطہ بن کر میری نظروں سے معدوم نہیں ہو جاتا۔

یہ جہاز جب بھی گزرتا ہے، مجھے یہی محسوس ہوتا ہے، ڈاکٹر شفقت فاروق ملک چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ اب سیم زدہ زمینوں پر کوئی کونپل نہیں پھوٹے گی، اب زمین کا تھور کبھی نہیں ٹوٹے گا، اب اس ملک کے باسی کبھی اپنی مٹی کی گندم نہیں کھا سکیں گے، اب یہ ملک کبھی خوراک میں خود کفالت کی منزل نہیں پا سکے گا۔

وہ ۱۹۷۸ء میں جب نایاب (نیوکلیئر انسٹیٹیوٹ فار ایگریکلچر اینڈ بائیالوجی، فیصل آباد) میں ملازم ہوئیں، تو ان کی زندگی کی ایک ہی خواہش تھی۔ "میں پاکستان کی ایک ایک انچ پر گندم اگاؤں گی۔" لوگ ان کی باتیں سن کر ہنستے تھے، انہیں ہنسنا بھی چاہیے تھا، کیونکہ ان کے سامنے ایک ایسے محروم اور بنجر ملک کی ایک کمزور "تیلا" سی لڑکی تھی جو ہمالیہ جتنے اونچے دعوے کر رہی تھی، ایک ایسے ملک کی لڑکی جو ہر سال لاکھوں ڈالر کی گندم درآمد کرتا ہے، جس کی زمینوں پر اگنے والی گندم کی ۵۰ قسمیں میکسیکو سے درآمد بیج کا اعجاز ہیں اور جس کی ۴۰ فیصد زرعی زمین سیم اور تھور کا شکار ہے۔ "آپ یہ معجزہ کیسے دکھائیں گی؟" پوچھنے والوں کی آنکھوں میں طنز اور ہونٹوں پر شرارت ہوتی تھی۔ "میں سیم اور تھور کی شکار زمینوں پر گندم اگاؤں گی۔" شفقت فاروق کی آواز میں لوہے جیسا عزم اور آنکھوں میں ہیرے جیسی چمک ہوتی تھی۔ سننے والوں کے لیے یہ الفاظ فقرہ کم اور گدگدی زیادہ ہوتے تھے، لہٰذا وہ دیر تک ہنستے رہتے، لیکن وہ تضحیک نفرت اور طنز کی اس فضا میں، ہر دوسرے شخص کے قہقہوں اور جگتوں سے لاتعلق اپنے کام میں منہمک رہیں۔

ڈاکٹر شفقت نے سیم اور تھور کے علاقوں میں گندم اگانے کے لیے ایک تحقیقاتی ادارہ بنایا، پوری دنیا کے دورے کیے، گندم پر ریسرچ کرنے والے اداروں میں گئیں، انہیں اپنا منصوبہ سمجھایا، گھنٹوں میزوں پر بیٹھ کر میکسیکو کے شاطر سائنس دانوں سے گفتگو کی، آخر میں جب ساری دنیا قائل ہو گئی تو انہیں امداد ملی، لیبارٹری کے آلات اور نوجوان سائنس دانوں کی ٹریننگ کے لیے وظائف ملے اور انہوں نے ایک مکمل اطمینان کے

ساتھ کام شروع کر دیا۔

جب وہ سیم اور تھور کا شکار زمینوں کا معائنہ کر رہی تھیں تو ان کے مشاہدے میں آیا ایسی زمینوں پر جہاں مضبوط ترین بیج بھی مٹی ہو جاتا ہے ایک خاص قسم کی گھاس بغیر کسی محنت کے اُگ آتی ہے، ڈاکٹر شفقت نے پوری دنیا سے اس گھاس کے نمونے اکٹھے کیے، انہیں سیم و تھور کی شکار زمینوں پر بویا، زیادہ تیزی سے پروان چڑھنے والی گھاس کے "بیج" حاصل کیے، ان میں وہ "کریکٹر" تلاش کیا جو ناموافق زمین پر پودے کو زندہ رکھتا ہے، پھر اس کریکٹر کو "ڈویلپ" کیا، جب وہ ایک مخصوص سطح پر پہنچ گیا تو اسے گندم کے پودے میں منتقل کیا، اس کے بیج لیے، انہیں بویا، پھر بیج لیے، انہیں بویا، سٹہ آیا، وہ بیج بوتی رہیں، سٹے آتے رہے، گھاس کا کریکٹر گندم کے بطن میں پروان چڑھتا رہا، یہاں تک کہ جب ڈاکٹر شفقت نے یہ بیج سیم زدہ زمین پر پھینکا تو چند ہی روز بعد کونپل نکل آئی۔ اس وقت ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، وہ بچوں کی طرح تالیاں پیٹتیں اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھیں...... پھر اس وقت "نایاب" کے ابوجہلوں نے انگلیاں دانتوں میں دبا لیں۔

ڈاکٹر شفقت کا تجربہ کامیاب ہو گیا۔ سیم اور تھور کی شکار زمین پر اُگنے والی گندم نے عام زرخیز زمین سے زیادہ پیداوار دی جب کہ اس کو کھاد، پانی اور دوسرے لوازمات کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ اپنی "دریافت" ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر شفقت نے بیجوں کی کھیپ پوری دنیا میں بھجوائی، میکسیکو، برطانیہ، مراکش، ایران، عراق، چین اور افغانستان کے علاقوں قندھار، ہرات اور جلال آباد میں یہ بیج بو کر دیکھا گیا، ہر جگہ اس نے سو فیصد نتائج دیئے، ہر ملک کے سیم زدہ علاقوں نے یہ بیج قبول کر لیا۔

ڈاکٹر شفقت کامیاب تو ہو گئیں لیکن یہ کامیابی ان کی زندگی کے ۲۰ سال کھا گئی، جب انہوں نے تجربے کا آغاز کیا تھا تو وہ ایک پتلی پتنگ سی لڑکی تھیں، لیکن جب ٹیسٹ ٹیوب سے سر اٹھایا، دستانے اتارے، ایپرن کھولا تو ان کا نصف سر سفید ہو چکا تھا، چہرے پر چربی آ چکی تھی، گردن کی جلد ڈھیلی پڑ چکی تھی، ہاتھوں کی ملائمت اور پیروں کی نسوانیت دم توڑ چکی تھی، اب سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ان کا دم پھولتا تھا اور جھکتے ہوئے ان کی کمر دکھتی تھی، لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے پر گزرے وقتوں کا ملال نہیں تھا، ان کی باتوں میں شکوے اور ان کی آنکھوں میں بڑھاپے کی بے چارگی نہیں تھی اور یہ ہونی بھی نہیں چاہیے تھی کہ وہ ایک کامیاب خاتون تھیں، ایک ایسی کامیاب سائنس دان جس کے چرچے دنیا بھر کے سائنس میگزینوں اور جدید آلات سے مزین لیبارٹریوں میں ہوتے تھے۔

اور اکثر ایسا ہوتا، جب ان کا سارا سٹاف چلا جاتا اور وہ بھوک سے نڈھال ہو جاتیں تو گھر جانے سے پہلے وہ لیبارٹری کا چکر ضرور لگاتیں۔ ٹیوبوں میں لگے پودے دیکھتیں، ٹرے میں نئی کونپلوں پر انگلیاں پھیرتیں اور فریزر میں جمی "زندگی" سے حرارت لیتیں اور سوچتیں چند ہی دنوں کی بات ہے، یہ بیج اس لیبارٹری سے نکلے گا اور پاکستان کے سارے سیم زدہ علاقوں میں ہریالی آ جائے گی، پاکستان آزاد ہو جائے گا، پھر گندم

کی درآمد پر لاکھوں ڈالر ضائع نہیں ہوں گے، بڑی طاقتیں ہمیں بلیک میل نہیں کر سکیں گی..... لیکن یہ خواب تھا اور خواب ہی رہا۔

آنے والے دنوں میں دو حادثے ہوئے۔ ''نایاب'' کی انتظامیہ بدل گئی، نیا ڈائریکٹر جنرل آ گیا، ایگری کلچر کے بجائے فوڈ سائنسز کا بندہ ان کا افسر بن گیا اور افسر بھی وہ جسے پرانی نوکری سے کرپشن کے الزامات میں ٹرانسفر کیا گیا تھا، دوسرا حادثہ پنجاب کی سیاسی قیادت تھی، جس نے اپنے ایک دوست سائنس دان کو نوازنے کا فیصلہ کر رکھا تھا، حکم آیا ''دوست'' کو ڈائریکٹر لگا دیا جائے۔ ''نایاب'' کی انتظامیہ نے سوچا ڈائریکٹر کیسے بنایا جائے۔ ''دوست'' نے جواب دیا ایک نیا سنٹر بنایا جائے، جہاں اسے ڈائریکٹر لگا دیا جائے، چنانچہ اسے ڈائریکٹر بنانے کے لیے ''کاٹن سنٹر'' بنایا گیا، اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا، نئے ڈائریکٹر کے لیے سٹاف کی ضرورت تھی۔ لیبارٹری، آلات اور فریجوں کی ضرورت تھی، چنانچہ ایک روز نیا آرڈر آیا اور ڈاکٹر شفقت کو نیب جی (N.I.B.G.E) ٹرانسفر کر دیا گیا، ان کے سارے لفافے فریجوں سے نکال کر کوڑے دانوں میں پھینک دیئے گئے، سارے ٹرے، ساری ٹیوبیں خالی کر دی گئیں، سارے آلات ''کاٹن سنٹر'' کے ڈائریکٹر کے حوالے کر دیئے گئے اور سارا سٹاف مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اس روز ڈاکٹر شفقت پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ بالکل ان ماؤں کی طرح جو اپنے جوان بچوں کی مرگ پر روتی ہیں یا اس چڑیا کی طرح جو اپنا بچہ گھونسلے سے گرنے پر گریہ زاری کرتی ہے۔

اس واقعے کو پورا سال گزر چکا ہے۔ ڈاکٹر شفقت کے پاس اب کوئی کام نہیں، بس ہر ماہ انہیں تنخواہ مل جاتی ہے، لیکن وہ اس بے چینی کا کیا کریں، جو ۲۰ برس تک مسلسل اٹھارہ گھنٹے کام کرنے سے ان کی ہڈیوں کا حصہ بن چکی ہے، جو انہیں دس منٹ تک فارغ نہیں بیٹھنے دیتی، اس ایک سال میں وہ مزید ۲۰ برس بوڑھی ہو گئیں۔

انہیں باہر کی دنیا بلا رہی ہے، میکسیکو کے تحقیقاتی ادارے، فلپائن کی زرعی یونیورسٹیاں، لندن اور اسپین کے انسٹی ٹیوٹ، پوری دنیا ان کے لیے کھلی ہے، ایسی دنیا جہاں کام کرنے والے شخص اور ٹیلنٹ کی قدر ہے، وہ خود بھی پاگل پن سے بچنے کے لیے ملک سے فرار ہونا چاہتی ہیں (شاید اب تک ہو بھی چکی ہوں)

میں ڈاکٹر شفقت فاروق سے کبھی نہیں ملا، میں ان سے ملنا بھی نہیں چاہتا، اس قسم کے لوگوں سے ملاقات مجھے باغی کر دیتی ہے، میرے معدے کی تیزابیت بڑھ جاتی ہے میرے ذہنی خلجان میں اضافہ ہو جاتا ہے، ہاں البتہ میرے ایک دوست نے طویل عرصے تک ڈاکٹر شفقت کے ساتھ کام کیا، جب وہ مجھے یہ کہانی سنا رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ ملک سے محبت کرنے والے باصلاحیت لوگوں کے بغیر بھی کوئی ملک خود انحصاری کے راستے پر چل سکتا ہے؟

ہاں محترم قارئین، قوموں کا سرمایہ کھیت، فیکٹریاں، گاڑیاں، ادارے اور نوٹوں سے لبالب بھری

تجوریاں نہیں ہوتا، لوگ ہوتے ہیں، اپنے ملک سے محبت کرنے والے ہنر مند لوگ۔

کسی قوم کا ایک دانشور، عالم یا سائنس دان حالات سے پریشان ہو کر نقل مکانی کر جائے تو اس قوم سے بڑی قلاش قوم کوئی اور نہیں ہوتی، خواہ اس کے سارے پہاڑ سونا بن جائیں، ساری ندیوں، سارے دریاؤں اور سارے بیراجوں میں تیل بہنے لگے اور اس کے سارے درختوں سے اشرفیاں اُترنے لگیں۔

طیفا بدمعاش

طیفے بدمعاش نے چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی اور ناک آسمان کی طرف اٹھا کر نتھنوں سے دھواں اگلنے لگا۔

''تو تمہارا خیال ہے معاشرے میں ساری خرابی ہم نے پھیلا رکھی ہے۔'' اس کے منہ کے کناروں سے، جہاں سے ہونٹوں کی کمانیں الگ ہوتی ہیں، دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر اٹھی اور سارے کمرے میں کڑوے تمباکو کی بو پھیل گئی۔ وہ کچھ دیر تک دھوئیں کی لکیر پر نظریں جمائے بیٹھا رہا، جب سرمئی لکیریں فضا میں تحلیل ہو گئیں تو وہ بولا۔

''لیکن میں سمجھتا ہوں اس ملک میں جو تھوڑا بہت امن، غیرت، شرم، حیا، ایمانداری اور خوف خدا بچا ہے، وہ صرف ہم بدمعاشوں کی وجہ سے ہے۔''

''تم یقین کرو میرے محلے کی بچیاں رات گئے تک گلی میں پھرتی رہتی ہیں لیکن کسی کی مجال نہیں ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے۔ میرے محلے کی لڑکیاں شہر کے دوسرے کونے میں پڑھنے جاتی ہیں لیکن آج تک کسی اوباش نے ان پر آوازے کسنے کی جرأت نہیں کی۔ میرے محلے میں مدت سے کبھی چوری نہیں ہوئی، کوئی قتل نہیں ہوا، کوئی ڈاکہ نہیں پڑا، کسی نے کسی کی جائیداد پر قبضہ نہیں کیا، کسی نے کسی کو بے عزت نہیں کیا، کوئی جھگڑا نہیں ہوا، کوئی تنازع نہیں اُٹھا، کوئی لڑکی اغوا نہیں ہوئی، کوئی کانسٹیبل نہیں آیا...... کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں، یہ طیفے بدمعاش کا علاقہ ہے اور اگر طیفے کا میٹر پھر جائے تو وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔''

''تم یقین کرو جب کوئی بڑا افسر شہر میں آتا ہے تو علاقے کا ایس ایچ او مجھے بلا کر کہتا ہے، بھائی طیفے ڈی آئی جی صاحب آ رہے ہیں، اب میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے، مہربانی کرو شہر میں دو دن تک کوئی واردات نہیں ہونی چاہیے۔''

تو میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں، ملک صاحب آپ فکر ہی نہ کریں یہ شہر دو دن کے لیے مکہ مدینہ بن جائے گا اور پھر دو دن شہر میں چڑی نہیں پھڑکتی، کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں، یہ طیفے بدمعاش کا علاقہ ہے اور اگر طیفے کا میٹر پھر جائے تو وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔''

''تم یقین کرو جب پلس ساری کوششیں کر کے تھک جاتی ہے تو رات کے اندھیرے میں ایس ایچ او

میرے ڈیرے پر آتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے۔ ''طیفے کسی طریقے سے ملزم پیدا کرو، نہیں تو میری نوکری گئی اور میں دوسرے روز آلہ قتل کے ساتھ بندہ پیش کر دیتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے جب ایم این اے کے بیٹے کی گاڑی چوری ہوئی تو وہ کس نے برآمد کرائی تھی؟ میں نے، جب جنازے کے دوران وزیر کا پرس نکل گیا تو جیب کترا کس نے پلس کے حوالے کیا، میں نے، جب شیخ صاحب کی لڑکی نکل گئی تو وہ کس نے واپس کرائی؟ میں نے، جب شہر میں پاؤڈر بکنے لگا تو ''سودا'' بیچنے والے کس نے پکڑوائے؟ میں نے، کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں یہ طیفے بدمعاش کا علاقہ ہے اور اگر طیفے کا میٹر پھر جائے تو وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔''

''تم یقین کرو جب گلیاں پکی کرنے کا وقت آتا ہے تو سب سے پہلے بجری، ریت اور سریا طیفے کے محلے میں آتا ہے، جب فون لگنے لگتے ہیں تو پہلے طیفے کے محلے میں لگتے ہیں، جب بجلی اور گیس آتی ہے تو پہلے طیفے کے محلے میں میٹر لگتے ہیں، جب زکوٰۃ فنڈ تقسیم ہونے لگتا ہے تو رقم پہلے طیفے کے محلے میں آتی ہے، جب نوکریوں کا ''کوٹہ'' آتا ہے تو پہلے طیفے کے محلے کے بے روزگاروں کو ''لیٹر'' ملتے ہیں اور جب داخلے کھلتے ہیں تو پہلے طیفے کے محلے کے بچوں کو داخلے ملتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں یہ طیفے بدمعاش کا علاقہ ہے اور اگر طیفے کا میٹر پھر جائے تو وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔''

''تم یقین کرو جب گھروں میں کوئی جھگڑا ہو جائے، جب ہمسایہ ہمسائے سے لڑ پڑے، جب کسی کا داماد اس کی بیٹی کو مارنا پیٹنا شروع کر دے، جب جائیداد کی تقسیم تنازعہ بن جائے، جب رشتے لینے اور دینے پر سر کھلنے کا خطرہ پیدا ہو جائے، جب مولوی مولوی سے الجھنے لگے، جب بچہ باپ کے سامنے کھڑا ہو جائے، جب خاوند نئی شادی کرنے لگے، جب باپ بچوں کو چھینٹی لگانے لگے، جب ادھار یہ دکاندار کے پیسے دینے سے انکار کر دے، جب سوتیلی ماں بچوں کو باہر نکال دے اور جب بچوں کی لڑائی بڑوں تک پہنچنے لگے تو فریقین تھانے تھپانے کی بجائے طیفے کے ڈیرے پر آجاتے ہیں اور طیفا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو گواہ بنا کر ایمان قرآن کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور اس کے بعد کسی کی مجال نہیں کہ اس فیصلے سے بھاگ سکے کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں یہ طیفے بدمعاش کا علاقہ ہے اور اگر طیفے کا میٹر پھر جائے تو وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔''

''تم یقین کرو، ہمارے محلے کی استانیاں اور ماسٹر کبھی غیر حاضر نہیں ہوئے، ڈسپنسری کا ڈاکٹر کبھی لیٹ نہیں ہوا، خاکروب نے کبھی چھٹی نہیں کی، ہماری نالیاں کبھی گندی نہیں رہیں، ہمارے کوڑے دانوں نے کبھی بدبو نہیں چھوڑی، ہمارے بجلی کے تار کبھی نہیں ٹوٹے، ہمارے ٹیلی فون کبھی بند نہیں ہوئے، گیس لیک نہیں ہوتی، دائی نے کبھی نخرہ نہیں کیا، ناموں کا اندراج کرنے والے کلرک نے کبھی پیسے نہیں لیے۔ حفاظتی ٹیکوں والوں نے ''فرلو'' نہیں لگایا اور ٹونٹیوں سے کبھی ہوا خارج نہیں ہوئی۔ کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں یہ طیفے بدمعاش کا علاقہ ہے اور اگر طیفے کا میٹر پھر جائے تو وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔''

''ہاں تو تم کہتے ہو معاشرے میں سارا بگاڑ ہم نے پھیلا رکھا ہے۔ نہیں باؤ نہیں ...... یہ سارا گند

شریف لوگوں کا پھیلایا ہوا ہے، ہم تو اپنے گھروں، اپنے ہمسایوں کے گھروں کی حفاظت کر رہے ہیں، تم ذرا خود ایمان سے بتاؤ اگر کسی محلے میں اوباش لڑکے روز کسی لڑکی کو تنگ کرتے ہوں اور محلے کا مولوی ان لڑکوں کو روک کر کہے "تم لوگ اگر کل ادھر آئے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" تو کیا وہ لڑکے اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں گے، نہیں وہ لڑکے کل پھر اس لڑکی کے پیچھے آئیں گے۔ کیوں؟ کیونکہ وہ جانتے ہیں مولوی شریف آدمی ہے، وہ کبھی ٹانگیں نہیں توڑ سکتا، لیکن اگر طیفا بدمعاش ان لڑکوں کو روک کر صرف ایک بار کہہ دے، تم میں سے کل کوئی ادھر نظر نہ آئے، تو وہ لڑکے پوری زندگی اس گلی کا رُخ نہیں کریں گے۔ کیوں؟ کیونکہ وہ جانتے ہیں یہ طیفے بدمعاش کا علاقہ ہے اور اگر طیفے کا میٹر پھر جائے تو وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔"

"ہاں باؤ! جو شرافت کسی ایک اوباش شخص کا راستہ نہ روک سکے وہ شرافت نہیں بیماری ہوتی ہے، بزدلی، کمزوری اور منافقت ہوتی ہے۔"

"ہاں باؤ! جب شریفوں کو شرافت بیمار بنا دیتی ہے تو بدمعاشوں کی بدمعاشی ہی معاشروں کی حفاظت کرتی ہے۔"

طیفے بدمعاش نے چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی اور ناک آسمان کی طرف اُٹھا کر نتھنوں سے دھواں اگلنے لگا۔

تیسرا ڈنگ

۱۹۹۱ء کی ایک روشن صبح تھی۔

ہمارے اس وقت کے سیکرٹری جنرل خارجہ اکرم ذکی دفتر میں داخل ہوئے تو ہاٹ لائن پر وزیراعظم کا فون آ گیا۔ ''ذکی صاحب میں مری میں ہوں، اگر آپ کل فارغ ہیں تو لنچ میرے ساتھ کیجیے گا۔'' اب ظاہر ہے ذکی صاحب کے پاس تو انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی لہٰذا ان کی طرف سے رضا مندی کا اعلان سنتے ہی وزیراعظم نے دوسرا حکم دیا۔ ''آپ آتے ہوئے میاں صاحب کو بھی ساتھ لے آیئے گا۔'' ابھی ذکی صاحب ملاقات کا ایجنڈا معلوم کرنے کے لیے پر تول ہی رہے تھے، فون بند ہو گیا۔

دوسرے روز ذکی صاحب نے ''میاں صاحب'' کو ساتھ لیا اور مری کی طرف روانہ ہو گئے سنی بینک کے قریب میاں صاحب نے ذکی صاحب کے کان پر جھک کر پوچھا۔ ''ذکی! تمہیں اس لنچ کے ایجنڈے کا کچھ علم ہے؟'' اکرم ذکی نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ''کچھ، کچھ'' میاں صاحب کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور وہ کھسک کر ذکی صاحب کے مزید نزدیک ہو گئے، اکرم ذکی نے اپنی روایتی خوش دلی سے کہا ''آپ کا دوست ڈاکٹر محبوب الحق آپ کی جگہ آنا چاہتا ہے، میرا خیال ہے وزیراعظم آپ کی رائے دریافت کریں گے۔'' میاں صاحب کی آنکھیں بجھ گئیں، انہوں نے گھبرائے ہوئے انداز سے اکرم ذکی کو دیکھا اور کھسک کر ان سے دور ہو گئے۔

وزیراعظم کی میز پر کھانے سے چند لمحے قبل جب گفتگو شروع ہوئی تو نواز شریف نے سوپ کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا ''ذکی صاحب اگر خارجہ امور میاں صاحب کو دے دیئے جائیں تو آپ کے مسائل کم نہیں ہو جائیں گے؟'' ذکی صاحب نے سوپ کے پیالے میں چمچ چلاتے ہوئے گردن اثبات میں ہلا دی۔ وزیراعظم نے میاں صاحب کی طرف دیکھا، مسکرائے اور بولے ''کیوں میاں صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟'' میاں صاحب نے چمچ پلیٹ میں رکھا، نیپکن سے ہاتھ پونچھے اور نہایت سنجیدگی سے بولے۔ ''اگر آپ میری جگہ محبوب الحق کو لانا چاہتے ہیں تو میں چپ چاپ سازشی اور غیر محب وطن لوگوں میں چلا جاؤں گا۔'' وزیراعظم نے قہقہہ لگایا اور پیالے پر جھک گئے۔

یہ میاں صاحب ماضی کے وزیر خزانہ اور آج کے وزیر خارجہ سرتاج عزیز ہیں جو اپنی روایتی جرأت اور

منہ پر جواب دینے کی عادت سے 1991ء میں تو ''سازشی اور غیر محب وطن'' لوگوں میں جانے سے بچ گئے لیکن 98ء میں کیونکہ فیصلہ ڈائننگ ٹیبل کی بجائے ڈرائنگ روم میں ہوا تھا اور اس دوران فیصلہ کرنے والی قوتوں کے سامنے سوپ کا پیالہ بھی نہیں تھا لہٰذا سرتاج عزیز کو استروں کی یہ مالا پہننی ہی پڑی لیکن افسوس ڈاکٹر محبوب الحق جو 1991ء میں سرتاج عزیز کی جرأت کے باعث وزیر خزانہ نہ بن سکے۔ 98ء میں بھی سرتاج عزیز کے ''سرینڈرز'' کے باوجود اپنی حسرت پوری نہ کر سکے اور وزیر اعظم کو مجبوراً مرحوم کی جگہ ان کے شاگرد رشید حفیظ پاشا کو دینی پڑی۔

وزارت خارجہ سے سرتاج عزیز کی نفرت آج کی بات نہیں، یہ 26 برس پرانا قصہ ہے وہ ان دنوں پلاننگ کمیشن میں جوائنٹ سیکریٹری ٹریڈ اور ڈاکٹر محبوب الحق مرحوم جوائنٹ سیکریٹری اکنامک پلاننگ ہوا کرتے تھے، ان دونوں بزرگوں میں ان دنوں ویسی ہی دوستی تھی جیسی کوے اور بلبل میں ہوتی ہے۔ اس جنگ و جدل کے باعث سرتاج عزیز نے محاذ بدلنے کا فیصلہ کیا اور وہ فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن (ایف اے او) سے وابستہ ہو کر روم چلے گئے جہاں انہوں نے اپنی روایتی محنت اور ان تھک کام کرنے کی صلاحیت سے ڈائریکٹر جنرل ایف اے او مسٹر بورما کا دل جیت لیا، یہ ان کی شبانہ روز محنت ہی کا نتیجہ تھا کہ 1974ء میں جب ایف اے او نے ''ورلڈ فوڈ کانفرنس'' کے منصوبے پر کام شروع کیا تو بورما نے سرتاج عزیز کو اس کا آرگنائزر بنا دیا۔

پہلی کانفرنس ہوئی تو سرتاج عزیز نے دو بڑی قراردادیں پاس کرا کر پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا، پہلی قرارداد کی روشنی میں تیسری دنیا کو قحط اور غذائی بحران سے بچانے کے لیے ''ورلڈ فوڈ کونسل'' تشکیل پائی جبکہ دوسری قرارداد کے نتیجے میں انٹرنیشنل فنڈ فار ایگریکلچر ڈویلپمنٹ (آئی ایف اے ڈی) کی بنیاد پڑی جس کا کام چھوٹے ممالک کو زرعی قرضے فراہم کرنا تھا۔

امریکہ اور یورپ نے ان اداروں کی تشکیل پر کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ ان کا خیال تھا سرتاج عزیز جیسے شخص کے لیے فنڈ جمع کرنا ممکن نہیں ہوگا جس کے نتیجے میں دونوں ادارے اپنی موت آپ مر جائیں گے لیکن سرتاج عزیز نے عرب ممالک اور یورپ کے ایک ہی دورے میں یہ خیال باطل ثابت کر دیا یوں ڈاکٹر محبوب الحق سے ان کے اختلافات امریکہ سرتاج دشمنی میں تبدیل ہو گئے جسے سرتاج عزیز ایک وضع دار دشمن کی طرح پچھلے 26 برس سے نبھا رہے ہیں۔

1975ء میں ایک طرف سرتاج عزیز کی شہرت کا ڈنکا پورے کرۂ ارض پر بج رہا تھا تو دوسری طرف انہیں تیسری دنیا کے نجات دہندہ کا ٹائٹل دیا جا رہا تھا۔ ان کی اٹھان سے محسوس ہوتا تھا آنے والے برسوں میں دنیا کی کوئی طاقت انہیں عالمی دانشور بننے سے نہیں روک سکتی جب ان کی یہ نیک نامی، حالات کو بھانپنے اور وقت کے تیور سمجھنے والے ذوالفقار علی بھٹو تک پہنچی تو انہوں نے سرتاج عزیز کو ڈائریکٹر جنرل ایف اے او کے الیکشن میں کھڑا کر دیا، اس دور میں دنیا کے ہر اخبار نویس کو ان کی کامیابی واضح دکھائی دے رہی تھی، اس کی دو

وجوہات تھیں، ایک، سیکریٹری جنرل ایف اے او سعید مرے (یہ مصر کے نائب صدر بھی تھے) ان کے مداح تھے، دوسری، تمام وفدان کی مالا جپتے تھے، پوری دنیا کا میڈیا ان کے ترانے گاتا تھا لیکن بدقسمتی دیکھیے امریکہ ان کی شہرت سے خائف ہوگیا، اس نے ان کے خلاف سازش تیار کی اور پاکستان کی وزارت خارجہ میں اپنے ایجنٹوں کو اشارہ کیا۔ یہ لوگ فوراً اپنے ہی امیدوار کے خلاف کمر کس کر میدان میں اُتر آئے چنانچہ ان برادران یوسف نے ان کے ووٹ توڑنے کے لیے وہ وہ حرکتیں فرمائیں جن کے ذکر ہی سے زبان میں لکنت اور کانوں میں پیپ پڑ جاتی ہے۔

سرتاج عزیز ہار گئے، ملک واپس آگئے لیکن ان کے حوصلے نہ ٹوٹے، انہوں نے اپنی الیکشن مہم جاری رکھی یہاں تک کہ بارہ برس بعد 1987ء میں جب وہ جونیجو حکومت میں ایڈوائزر تھے انہیں اپنی پوزیشن بحال کرنے کا موقع مل گیا لیکن عین وقت پر صاحبزادہ یعقوب خان نے یونیسکو کے ڈی جی کے الیکشن میں کاغذات جمع کرا دیے۔ وزارت خارجہ میں اس وقت بھی امریکہ نژاد پاکستانیوں کا قبضہ تھا، کچھ صاحبزادہ یعقوب علی خان کی لابنگ بھی مضبوط تھی لہٰذا دفتر خارجہ نے اعلان کر دیا ''ہم بیک وقت دو امیدواروں کی انتخابی مہم نہیں چلا سکتے۔'' میٹنگ ہوئی تو اس سرتاج عزیز کو ڈراپ کر دیا گیا جس کی کامیابی کے نوے فیصد امکانات تھے اور اس یعقوب علی خان کو میدان میں اترنے کی اجازت دے دی گئی جسے اپنے ہی ملک کے وزیراعظم کی تائید حاصل نہیں تھی لہٰذا پاکستان کو کوئی نشست نہ ملی۔

وہ دن اور آج کا دن، سرتاج عزیز جب بھی وزارت خارجہ گئے انہیں اس عمارت اور اس کے باسیوں کے دیے زخم یاد آگئے جس کے بعد ان کے لیے آواز کی تلخی اور لہجے کی نفرت چھپانا ممکن نہ رہا۔

بہرحال آج یہ سرتاج عزیز ''مختارکل'' بن کر اسی عمارت میں آبیٹھے ہیں جس نے ہمیشہ ان کا راستہ کاٹا، جو 25 برس تک ان کی کردار کشی کرتی رہی، جہاں سے ان پر الزامات کے گولے داغے جاتے رہے، جہاں سے انہیں ایٹمی دھماکے کا مخالف قرار دیا گیا اور جہاں سے آج کل یہ خبریں نشر کی جا رہی ہیں ''سرتاج عزیز کو سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرانے کے لیے وزیر خارجہ بنایا گیا۔'' لیکن اصل صورتحال یہ ہے، وزرت خارجہ میدان بن چکی ہے۔ جس میں ایک طرف کیل کانٹے سے لیس سینکڑوں امریکی ایجنٹ صف آراء ہیں اور دوسری طرف ہمارا تنہا پٹھان مجاہد کھڑا ہے جبکہ امریکہ سمیت پوری دنیا رنگ سے باہر کھڑی نتیجے کا انتظار کر رہی ہے۔

جی ہاں محترم قارئین، اگر پاکستان نے وزارت خارجہ میں سرتاج عزیز کی موجودگی میں سی ٹی بی ٹی اور ایف ایم سی ٹی پر دستخط کر دیے تو امریکہ پٹھان مجاہد کو تیسری مات دینے میں کامیاب ہو جائے گا، ساری محب وطن قوتیں اس صورتحال سے پریشان ہیں لیکن میں مطمئن ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے ایک کمزور ایمان مومن تو شاید ایک سوراخ سے دوسری اور تیسری بار ڈسا جائے لیکن ایک پٹھان نہیں، خواہ وہ پٹھان سرتاج عزیز جیسا حلیم، سادہ اور عاجز ہی کیوں نہ ہو۔

مدینے کا شہید

پچھلے موسم سرما میں ایک نامور پاکستانی دانشور بھارت گئے، دورے کے اختتام پر ایک غیر سرکاری تنظیم نے دہلی میں ان کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا جس میں پاکستانی دانشور کو "خراج عقیدت" پیش کرنے کے لیے چوٹی کے بھارتی دانشور تشریف لائے، نشست کے آخر میں جب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک ہندو دانشور نے اپنے معزز مہمان سے ایک عجیب سوال پوچھا، پوچھنے والے نے پوچھا۔ "یہاں بھارت میں تو مسلمان مساجد میں نماز ادا کرتے ہیں وہاں پاکستان میں کہاں پڑھتے ہیں؟" پاکستانی دانشور نے اس سوال کو مذاق سمجھ کر فلک شگاف قہقہہ لگایا لیکن جب انہیں محفل کی طرف سے کوئی خاص ردعمل موصول نہ ہوا تو انہوں نے کھسیانا سا ہو کر سوالی کی طرف دیکھا، ہندو دانشور کے چہرے پر سنجیدگی کے ڈھیر لگے تھے، پاکستانی دانشور نے بے چینی سے پہلو بدل کر جواب دیا۔ "ظاہر ہے مسجدوں ہی میں پڑھتے ہیں۔" یہ جواب سن کر ہندو دانشور کھڑا ہوا، ایک نظر حاضرین پر ڈالی اور پھر مسکرا کر بولا۔ "لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق تو پاکستانی مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں کو گولی ماردی جاتی ہے۔" ہندو دانشور کا یہ تبصرہ پاکستانی دانشور کو سکڈ میزائل کی طرح لگا، اس کا ماتھا پسینے سے بھیگ گیا، ہاتھوں میں لرزہ طاری ہو گیا اور آنکھوں میں سرخی آ گئی، منتظمین موقع کی نزاکت بھانپ گئے لہٰذا انہوں نے فوراً نشست کے اختتام کا اعلان کر دیا یوں پاک بھارت تعلقات مزید بگڑنے سے بچ گئے۔

یہ واقعہ مجھے مرحوم حکیم سعید نے سنایا تھا، مجھے آج بھی وہ گرم سہ پہر یاد ہے میں ہمدرد دوا خانہ راولپنڈی میں حکیم صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا، مرحوم خلاف معمول تھکے تھکے سے لگ رہے تھے میں نے ادب سے طبیعت کے اس بوجھل پن کی وجہ دریافت کی تو دل گرفتہ لہجے میں بولے "ہم نے اس دکھ سے بھارت چھوڑا تھا کہ ہمیں وہاں مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی، ہم نماز پڑھنے جاتے تھے تو ہندو مسجدوں میں سور چھوڑ دیتے تھے، خانہ خدا کے دروازے پر ڈھول پیٹتے تھے، بول و براز کی تھیلیاں ہمارے اوپر پھینکتے تھے، ہندو شر پسند پچھلی صفوں میں کھڑے نمازیوں کو چھرے گھونپ کر بھاگ جاتے تھے، ہم نے سوچا چلو پاکستان چلتے ہیں وہاں کم از کم ہمارے سجدے تو آزاد ہوں، ہماری مسجدیں، ہماری درگاہیں تو محفوظ ہوں گی لیکن افسوس آج

مسلح گارڈز کے پہرے کے بغیر پاکستان کی کسی مسجد میں نماز کا تصور تک نہیں، مجھے میرے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید دہلی سے لکھتے ہیں، سعید واپس آجاؤ، پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں، یہاں، ادھر کم از کم مسجدیں تو محفوظ ہیں...... لیکن میں۔'' ان کی آواز اکھڑ گئی۔

''پاکستان آنے پر آپ کو کبھی پچھتاوا ہوا؟'' میں نے نرمی سے پوچھا۔''انہوں نے اچکن کے بٹن سہلائے ''نہیں، ہرگز نہیں، یہ سودا ہم نے خود کیا تھا، حمید بھائی میرے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے، ان کی خواہش تھی میں دہلی ہی میں ان کا ہاتھ بٹاؤں لیکن مجھے لفظ پاکستان سے عشق تھا لہٰذا ادھر چلا آیا، اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور وہ ادارہ جس کی بنیاد میں نے بارہ روپے سے رکھی تھی آج پاکستان کے چند بڑے اداروں میں شمار ہوتا ہے، یہ سب پاکستان سے عشق کا کمال ہے۔'' ان کی آواز میں بدستور ملال تھا۔''لیکن پاکستان کے حالات سے دکھ تو ہوتا ہوگا؟'' میں نے اپنے سوال پر اصرار کیا۔''ہاں بہت ہوتا ہے، اخبار پڑھتا ہوں، سیاستدانوں کے حالات دیکھتا ہوں، عوام کی دگرگوں صورتحال پر نظر پڑتی ہے تو بہت دکھ ہوتا ہے، جب ادھر دہلی سے کوئی عزیز رشتے دار پاکستان آکر کہتا ہے، کیوں پھر، تو دل پر چھری سی چل جاتی ہے، لیکن کیا کریں، گھر جیسا بھی ہے، ہے تو اپنا، ہم اسے چھوڑ تو نہیں سکتے، لہٰذا لگے ہوئے ہیں اور لگے رہیں گے آخری سانس تک......''

''کوئی ایسی خواہش جس کا آپ نے آج تک کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا؟'' انہوں نے کچھ دیر تک سوچا۔''ہاں کبھی کبھی جی چاہتا ہے میری موت حمید بھائی سے پہلے ہو، وہ میرے جنازے پر آئیں، میرے چہرے سے چادر سرکا کر دیکھیں اور پھر آہستہ سے مسکرا کر کہیں''ہاں سعید تمہارا فیصلہ درست تھا۔''

وہ گرم دوپہر ڈھل گئی تو اس کے بطن سے آج کی خنک اور غمناک صبح طلوع ہوئی، میرے سامنے میز پر آج کے اخبار بکھرے پڑے ہیں، ہر اخبار کی پیشانی کے ساتھ آج کے سب سے بڑے انسان کی تصویر چھپی ہے، خون میں نہائی اور حسرت میں ڈوبی ہوئی تصویر جو ہر نظر سے چیخ چیخ کر ایک ہی سوال کر رہی ہے۔

''میرا جرم کیا تھا، مجھے کیوں مارا گیا، میں تو زخموں پر مرہم رکھنے والا شخص تھا پھر میرے جسم کو زخم کیوں بنا دیا گیا۔'' میرا دماغ سلگتی لکڑیوں کی طرح چٹخنے لگا، میں نے سوچا، یہ تصویر آج دہلی کے کسی اخبار میں بھی چھپی ہوگی، وہ اخبار ہمدرد نگر کے ایک چھوٹے سے غریبانہ کمرے میں بھی پہنچا ہوگا، چٹائی پر بیٹھے بیاسی (82) برس کے ایک بوڑھے نے بھی اسے اٹھایا ہوگا، اس کی آنکھیں بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح چھلک پڑی ہوں گی، اس نے بھی شدت جذبات سے اخبار پرے پھینک دیا ہوگا، اس نے بھی بازو پر دانت جما کر چیخ ماری ہو گی، اس نے بھی اپنی چھاتی پر ہاتھ مارا ہوگا، اس نے بھی چلا چلا کر کہا ہوگا۔''سعید تمہارا فیصلہ غلط تھا، مجھے دیکھو 82 برس کے اس بوڑھے کو دیکھو، یہ بغیر محافظ کے مسجد جاتا ہے، پیدل مطب پہنچتا ہے، روز صبح شام کافروں کے درمیان چہل قدمی کرتا ہے لیکن اس پر کبھی کوئی گولی نہیں چلی، اس کا کبھی کسی نے راستہ نہیں روکا۔'' ہاں اس 82 برس کے کمزور بوڑھے نے چلا چلا کر کہا ہوگا۔''سعید میں کربلا میں زندہ رہا تم مدینے میں مارے گئے۔''

نقب زن

میں گوروں کا بہت احترام کرتا تھا لیکن برطانیہ کی سابق وزیراعظم مارگریٹ تھیچر نے یہ انکشاف کر کے مجھے تو بالکل ہی مایوس کر دیا کہ 10 ڈاؤننگ سٹریٹ (برطانیہ کا وزیراعظم ہاؤس، وزیراعظم سیکرٹریٹ) میں صرف 70 افراد پورے برطانیہ کا انتظام چلا رہے ہیں۔

مسز تھیچر کا کہنا ہے: ”10۔ ڈاؤننگ سٹریٹ آفس کم اور گھر زیادہ تھا، جہاں ہم 70 افراد ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ میری مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ مجھے نہیں یاد میں کبھی 4 گھنٹے سے زیادہ سوئی ہوں، میرے آفس کے لیے وزیراعظم کے لیے ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے کوئی لفٹ نہیں تھی، لہٰذا مجھے سیڑھیوں کے ذریعے ہی آنا جانا پڑتا تھا لیکن اس کا ایک فائدہ تھا کہ اس طرح اوپر نیچے آنے جانے سے میری اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی، کچھ فلیٹ بھی چھوٹا سا تھا، دوسرا اس کی صفائی کے لیے وقت نہ ہونے کے باعث مزید چھوٹا محسوس ہوتا تھا، ویسے عام حالات میں مجھے اس کے مختصر ہونے کا احساس نہیں ہوتا تھا، لیکن جب کوئی مہمان آ جاتا تو مجھے اخبارات، فائلیں اور کاغذات سمیٹ کر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے بڑی شرمندگی ہوتی۔“

تھیچر کہتی ہیں: ”میں اور میرا خاوند اس فلیٹ (وزیراعظم ہاؤس) میں اکیلے رہتے تھے، نوکر ہمارے پاس تھا نہیں، لہٰذا سارا کام ہمیں خود کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کو جب بھوک سے بری طرح نڈھال ہو جاتی تو بھاگتی ہوئی اوپر فلیٹ میں جاتی، لنچ تیار کرتی اور ”فٹافٹ“ کھا کر نیچے آ جاتی۔ رات کو گیارہ بجے جب تمام ساتھی اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تو میں تھکاوٹ سے چور سیڑھیوں کی ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اوپر فلیٹ تک آتی جہاں ڈینس (تھیچر کا خاوند) میرا منتظر ہوتا۔ پھر ہم لوگ کچن میں مصروف ہو جاتے، کھانا تیار کرتے، کھاتے اور پھر میں تازہ دم ہو کر دوبارہ فائلوں میں کھو جاتی۔ جب کبھی ہمارے ذاتی مہمان آتے تو میں اپنے پولیٹیکل سیکرٹری کو بھی اوپر ہی بلا لیتی، وہ کمال محبت کرتے اور میرے ساتھ کچن ہی میں کھڑے ہو جاتے۔ میں مہمانوں کے لیے کھانا تیار کرتی، ان سے گپ شپ کرتی اور ساتھ ساتھ پولیٹیکل سیکرٹری کی مدد سے امور سلطنت بھی انجام دیتی۔ ویسے تو مجھے اس مصروفیت کے بہت سے فوائد حاصل ہوئے، جن میں سب سے بڑا فائدہ اپنے

لوگوں، اپنے ملک کی خدمت تھا، لیکن مجھے اس کا ایک نقصان بھی اٹھانا پڑا اور وہ تھا اپنے خاندان سے کٹ کر رہنا۔ آپ یقین کریں میری فلڈ سٹریٹ میں مقیم اپنے خاندان سے دنوں نہیں، مہینوں نہیں، بلکہ سالوں میں کبھی ایک آدھ بار ملاقات ہوتی تھی۔ جب کبھی پچھلی رات کے سناٹے میں مجھے اپنے یاد آتے تو میں سوچتی میں کتنی بدنصیب ہوں۔ میرے پیارے چند میل کے فاصلے پر ہیں، لیکن میں انہیں سال بھر سے نہیں ملی تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے، لیکن میں انہیں فوراً پونچھ دیتی کیونکہ مجھے معلوم تھا، برطانوی شہری کمزور لیڈروں سے محبت نہیں کرتے۔"

تھیچر کا کہنا ہے: "۷۰ افراد کے عملے میں چند ڈپٹی کلرک، کچھ پریس آفیسر، گارڈن روم گرلز، پارلیمنٹرین سیکشن کے کچھ لوگ، خطوط کی سمریاں بنانے والے آفیسر، چرچ کے معاملات دیکھنے والے چند لوگ، پولیٹیکل آفیسرز، پالیسی یونٹ کے افراد اور پیغام رساں (چپڑاسی) شامل تھے۔ ہم لوگوں پر نہ صرف پورے برطانیہ کا نظام چلانے کی ذمہ داری تھی بلکہ دنیا بھر میں برطانوی امیج کی حفاظت اور تھرڈ ورلڈ کی ترقی کا خیال رکھنا بھی ہمارا ہی کام تھا۔ عملہ بہت ہی کم اور کام بہت ہی تھکا دینے والا تھا، لہٰذا ہم لوگ دن رات مصروف رہتے تھے۔ مجھے کبھی کبھی وائٹ ہاؤس اور جرمن چانسلری پر بڑا رشک آتا تھا، جہاں بالترتیب ۴۰۰ اور ۵۰۰ افراد یہی کام کرتے تھے، لیکن ہم نے تو اپنی چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے ہیں نا، سو اس مختصر سے عملے سے ہی کام چلانا پڑا، جو میں نے چلایا۔

تھیچر کا دعویٰ ہے "مجھے ہفتے میں ۳ سے ۷ ہزار تک خطوط موصول ہوتے تھے جو خطوط والے سیکشن سے ہو کر مجھ تک پہنچتے ان میں سے ایک بھی ایسا خط نہیں ہوتا تھا، جسے میں ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کی جرأت کر سکتی۔ چنانچہ خطوط کو پڑھنا، ان میں دیئے گئے نکات پر غور اور پھر ان پر حکم جاری کرنے سے قبل برطانوی آئین اور قانون کے تقاضوں کو مدنظر رکھنا بڑا کڑا مرحلہ ہوتا تھا، لیکن کرنا تھا سو کیا۔"

تھیچر نے بتایا: "۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ میں سب سے اہم عہدہ پرنسل سیکرٹری کا ہوتا ہے جبکہ اس کے بعد پریس سیکرٹری ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اس کی معمولی سی غلطی سے پریس وزیراعظم اور اس کی پارٹی کی دھجیاں بکھیر سکتا ہے۔ میں جب ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ میں داخل ہوئی تو مجھے معلوم ہوا، وہاں کے پریس سیکرٹری برنارڈ رنگ ہیم کا تعلق ہماری حریف سیاسی جماعت لیبر پارٹی سے ہے اور وہ نظریاتی طور پر میری جماعت کنزرویٹو پارٹی کا اتنا ہی مخالف ہے جتنا ایک لیبر پارٹی کا کارکن ہو سکتا ہے، لیکن پیشہ ورانہ سطح پر اس سے اچھا پریس سیکرٹری پورے برطانیہ میں نہیں تھا لہٰذا میں نے اسے اس کی جگہ سے نہیں ہلایا۔ وہ جب فارغ وقت میں میرے ساتھ بحث کرتا تھا تو مجھے اس کے نظریات سے لیبر پارٹی کے متشدد کارکنوں کی بو آتی تھی، لیکن جب وہ ڈیسک پر بیٹھتا تو اس وقت وہ گریٹ برٹن کا انتہائی محب وطن آفیسر ہوتا اور مجھے یہ بھی یقین تھا جب کبھی میں نے الیکشن لڑا برنارڈ میرے مخالف امیدوار ہی کو ووٹ دے گا، لیکن بحیثیت

وزیراعظم وہ میری ذمہ داریوں کی مدت کے دوران ایک مخلص ساتھی کی طرح میرا ساتھ دیتا رہے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔"

ہاں محترم قارئین، میں گوروں کا بہت احترام کرتا تھا لیکن برطانیہ کی سابق وزیراعظم مارگریٹ تھیچر نے یہ انکشاف کر کے مجھے تو بالکل ہی مایوس کر دیا کہ ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ میں صرف ۷۰ افراد پورے برطانیہ کا نظام چلا رہے ہیں۔

میں سوچتا ہوں۔ یہ ملک، یہ میرا ملک، پاک سرزمین شاد باد، گریٹ برٹن سے بڑی سلطنت ہے اور اس کا وزیر مارگریٹ تھیچر اور ٹونی بلیئر سے بڑا وزیراعظم ہے کہ اس کے تصرف میں سینکڑوں ایکڑ پر پھیلا وزیراعظم ہاؤس، چھ منزلہ عظیم الشان سیکرٹریٹ اور ڈیڑھ دو ہزار کا عملہ ہے لیکن اس کو پوچھنے والا کوئی نہیں؟

میں جب سوچتا ہوں سلطنتوں کی امارت اور غربت کا پیمانہ کیا ہوتا ہے؟ تو جواب آتا ہے جن ملکوں کے حکمران غریب ہوتے ہیں، وہ ملک امیر ہوتے ہیں لیکن جن ملکوں کے حکمران فرعون بن کر ایوان میں داخل ہوتے ہیں اور قارون بن کر باہر نکلتے ہیں، وہ ملک غریب ہوتے ہیں۔

سیانے کہتے ہیں امیر چوکیدار، چوکیدار نہیں نقب زن ہوا کرتے ہیں۔

(نوٹ: اس کالم کے لیے تمام معلومات مارگریٹ تھیچر کی خودنوشت "دی ڈاؤننگ اسٹریٹ ایئرز" سے لی گئیں۔)

احتجاج نہ احتساب

جی ہاں، جب میں نے عرض کیا، امیر چوکیدار، چوکیدار نہیں نقب زن ہوتا ہے تو بے شمار دوستوں نے خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعے پوچھا، کیا ساری جدید دنیا کے تمام صدور اور وزرائے اعظم کی طرز معاشرت ۱۰ ڈاؤننگ سٹریٹ جیسی ہی ہے؟ کیا تمام امیر ممالک کے حکمران برطانوی وزیراعظم ہی کی طرح ''کنجوسی'' کی زندگی گزار رہے ہیں؟ تو یقین فرمائیں، جوں جوں یہ سوالات میرے دماغ سے ٹکراتے گئے، مجھے جدید دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں کی ذاتی زندگی کی بے شمار محرومیاں، کمیاں اور ''کمزوریاں'' یاد آتی رہیں۔

مجھے فیلڈ مارشل منٹگمری یاد آیا، جنگ عظیم دوم کا سپریم کمانڈر، جس کی کمان میں اتحادیوں کی فوج نے نازیوں کی پھیلی ہوئی آگ بجھا دی، جس کے احکامات نے جاپان جیسی طاقت کو گورے سپاہیوں کے قدموں میں سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا اور جس کی جنگی حکمت عملی آج بھی دنیا بھر کے عسکری نصاب کا حصہ ہے، جب یہ جنرل ریٹائر ہوا تو اس کے پاس رہنے کے لیے ایک فلیٹ تک نہیں تھا، وہ کبھی کرائے پر اس گلی میں رہتا اور کبھی مالک مکان سے لڑ جھگڑ کر کسی دوسری جگہ جا ٹھکانہ بناتا، جب یہ نقل مکانی اذیت دینے لگی تو وہ وزیراعظم کے پاس گیا، ملک کے آئینی سربراہ نے ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ کے گیٹ پر دنیا کے عظیم سپہ سالار کا استقبال کیا، اسے نہایت عزت و احترام سے دفتر لایا، کرسی پر بٹھایا اور خود احتراماً اس کے سامنے کھڑا رہا، چند فقروں کے تبادلے کے بعد وزیراعظم نے تکلیف کرنے کی وجہ پوچھی تو فیلڈ مارشل نے بریف کیس کھول کر ایک درخواست وزیراعظم کے سامنے رکھ دی، وزیراعظم نے ٹیبل لیمپ جلایا، چشمہ ناک پر درست کیا اور درخواست پڑھنا شروع کر دی، درخواست میں فیلڈ مارشل نے دوسری جنگ عظیم میں اپنے کارنامے گنوانے کے بعد حکومت سے درخواست کی میرے پاس رہنے کے لیے گھر نہیں ہے، بہت بوڑھا ہو چکا ہوں، بار بار گھر نہیں بدل سکتا، مہنگائی بھی بہت ہے، کرایہ نہیں دے سکتا، لہٰذا مہربانی فرما کر مجھے ایک فلیٹ یا زرعی زمین کا ایک ٹکڑا الاٹ کر دیا جائے، وزیراعظم نے چشمہ اتارا، ٹیبل لیمپ بجھایا اور بڑے احترام سے بولا: ''سر، اس میں کوئی شک نہیں دوسری جنگ عظیم میں آپ کی خدمات پوری دنیا کے لیے قابل احترام ہیں، اس میں بھی کوئی شک نہیں دنیا میں اس وقت تک آپ کے پائے کا کوئی جرنیل نہیں، لیکن سر، آپ زندگی بھر اپنی خدمات کا معاوضہ لیتے رہے ہیں،

گریٹ بریٹن نے کبھی آپ کی تنخواہ لیٹ نہیں کی اور سر اگر اس کو بھی فراموش کر دیا جائے تو بھی پرائم منسٹر آف گریٹ بریٹن کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں، جس کے ذریعے وہ سپریم کمانڈر کو ایک فلیٹ الاٹ کر سکے، آئی ایم سوسوری سر" ساتھ ہی وزیراعظم نے ایڑھیاں بجائیں اور بوڑھے فیلڈ مارشل کو سمارٹ سا سلیوٹ پیش کر دیا۔

مجھے گولڈہ مائیر یاد آ گئی۔ اسرائیل کی وزیراعظم گولڈہ مائیر، جس نے چند پہاڑیاں، تھوڑے سے بنجر چٹیل میدانوں اور دنیا میں بکھرے چند لاکھ لوگوں کو دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی قوت بنا دیا، ۱۹۷۳ء کی "یوم کپور جنگ" سے پہلے جب ایک امریکی سینیٹر (جو کانگریس کی کمیٹی آف آرمڈ کا سربراہ بھی تھا) اس سے ملنے اسرائیل آیا تو اسے سیدھا گولڈہ مائیر کی رہائش گاہ پر لے جایا گیا، جہاں امریکی سینیٹر ایک عام سی گھریلو خاتون کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خاتون نے سینیٹر کا استقبال کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھی کچن میں لے گئی، جہاں اسے چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا دیا گیا، گولڈہ مائیر نے سفارتی گفتگو کے آغاز کے ساتھ ہی چولہے پر چائے کے لیے پانی رکھ دیا، پھر ٹیبل پر آ بیٹھی اور امریکی سینیٹر سے جہازوں اور ایم ۱۶ کا سودا شروع ہو گیا۔ بھاؤ تاؤ اور ابتدائی شرائط پر گفتگو کے دوران ہی گولڈہ مائیر چپکے سے اٹھی اور پیالیوں میں چائے بھر کر لے آئی۔ ایک کپ امریکی سینیٹر کے سامنے رکھا اور دوسرے گیٹ پر کھڑے امریکی گارڈز کو پکڑا آئی۔ گفتگو پھر شروع ہوئی، شرائط طے پانے لگیں، اسی دوران اس نے پیالیاں سمیٹیں اور ٹونٹی کھول کر انہیں دھونے لگی۔ دوبارہ ٹیبل پر بیٹھی اور امریکی سینیٹر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "مجھے یہ سودا منظور ہے، آپ تحریری معاہدے کے لیے اپنا سیکرٹری میرے سیکرٹری کے پاس بھجوا دیجئے۔

مجھے سوئٹزر لینڈ کا صدر آیا، ہمارے ضیا جالندھری ایک سٹور سے خریداری کر رہے تھے، اچانک ان کے دوست نے انہیں کہنی چبھو کر کہا: "ضیا تم اس شخص کو دیکھ رہے ہو؟" جالندھری صاحب نے چونک کر سامنے دیکھا، وہاں ایک بوڑھا گورا مختلف ریکس سے چھوٹی چھوٹی چیزیں چن رہا تھا، ضیا صاحب نے دوست کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو دوست سرگوشی میں بولا "سوال مت کرو، بس اسے دیکھتے جاؤ۔" ضیا جالندھری صاحب دوبارہ مڑے، غور سے بوڑھے کی حرکات و سکنات نوٹ کرنے لگے۔ بوڑھا پورے سٹور میں گھوما، چھوٹی چھوٹی چیزیں جمع کیں، کاؤنٹر پر جا کر بل بنوایا، بریف کیس کھولا، ساری چیزیں اندر رکھ کر اسے تالا لگایا اور سیلز مین کو سلام کر کے باہر نکل گیا، سڑک پر پہنچ کر وہ رکا، اس نے اوورکوٹ کے کالر اٹھائے اور انہیں کانوں پر لپیٹ کر آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگا، جب وہ اسی طرح چلتے چلتے نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ضیا جالندھری صاحب نے دوست سے پوچھا: "ہاں، اب بتاؤ یہ کون تھا اور اس پر نظر رکھنا کیوں ضروری تھی؟" دوست مسکرایا اور پھر سرگوشی میں بولا: "یہ بوڑھا گورا سوئٹزر لینڈ کا صدر ہے۔" ضیا صاحب نے حیرت سے پوچھا: "لیکن پروٹوکول کی گاڑیاں کہاں ہیں؟" دوست مسکرا کر بولا: "پروٹوکول کی گاڑیاں تو رہیں ایک طرف، اس کے پاس تو اپنی گاڑی تک نہیں یہ پیدل دفتر آتا ہے اور پیدل ہی واپس جاتا ہے۔"

مجھے سویڈن کا ''اولف پالمے'' یاد آیا، ہمارے الطاف گوہر جب ''ساؤتھ'' کے ایڈیٹر تھے تو اس کا انٹرویو کرنے گئے۔ دوران گفتگو لنچ کا وقت ہوگیا، اولف نے الطاف گوہر صاحب کو کھانے کی دعوت دی، گوہر صاحب مان گئے۔ وہ کرسی سے اٹھا اور انہیں ڈائننگ ہال میں لے گیا، جہاں ایک عام سی میز اور چند بے ترتیب کرسیاں پڑی تھیں۔ اس نے الطاف گوہر صاحب کو بٹھایا، الماری کھولی، اپنا ٹفن کیریئر کھول کر ''سالن'' پلیٹ میں ڈالا اور پلیٹ ٹرے میں رکھ کر الطاف گوہر صاحب کے سامنے رکھ دی۔ دوسرے ڈبے سے چند سلائس اور سلاد کے چند ٹکڑے بھی نکال کر ٹیبل پر سجا دیئے اور پھر مسکرا کر بولا: ''ایڈیٹر شروع کرو۔''

مجھے اندرا گاندھی یاد آگئی، ہمارے شمیم قریشی صاحب (پامسٹ ہیں، بنارس یونیورسٹی سے پامسٹری میں ایم اے کر رکھا ہے، نہرو خاندان سے بڑی دوستی تھی) جب اس سے ملنے وزیراعظم ہاؤس گئے تو وزیراعظم ''بھوجن'' کر رہی تھی، قریشی صاحب کو سیدھا ڈائننگ ٹیبل پر لے جایا گیا، ایک عام سی میز تھی، جس پر پلاسٹک کی سستی سی شیٹ پڑی تھی، میز پر چینی کی درمیانے درجے کی پلیٹوں میں ابلے چاول، مسور کی دال اور ملی جلی سبزی تھی، شیشے کے دیسی گلاس اور ٹھنڈے پانی کا ایک سستا سا جگ تھا، اوپر پرانے ''زمانے'' کا پنکھا چل رہا تھا، وزیراعظم کے اشارے پر ایک ملازم نے قریشی صاحب کے سامنے چینی کی پلیٹ رکھ دی۔

مجھے لوک سبھا کا منظر یاد آگیا، یہ گجرال کی حکومت کے خاتمے کا منظر تھا، میں نے دوردرشن پر دیکھا امریکہ تک کو للکارنے والی جمہوریت اور دنیا کے چند بڑے صنعتی ممالک میں شمار ہونے والے ملک کے نمائندے بنچوں پر بیٹھے تھے، ایوان کی چھتوں پر جالے لٹک رہے تھے اور لمبے لمبے راڈوں پر تقسیم ہند سے قبل کے جہازی سائز کے پنکھے جھول رہے تھے۔

مجھے گورباچوف یاد آگیا، جسے ایوان اقتدار سے فراغت کے بعد ماسکو میں فلیٹ نہیں مل رہا تھا، ہاں، مجھے بہت سے غریب لوگ یاد آگئے، جو امیر ممالک کے غریب چوکیدار تھے اور جنہیں عوام نے اپنی حفاظت اور اپنے نظام کی حفاظت کے لیے ایوانوں میں بھیجا تھا۔

ہاں، قارئین کرام میں آپ سے پھر سوال کرتا ہوں، اتنے بڑے بڑے گورنر ہاؤسز، وزیراعظم ہاؤس، ایوان صدر، پارلیمنٹ ہاؤس اور پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کی موجودگی میں اس ملک کو غریب کہا جاسکتا ہے؟ اور اگر یہ غریب ہے تو پھر حکمران طبقے کو اس عیاشی پر ٹوکنے والا کوئی نہیں؟ خدا کی قسم اگر صرف وزیراعظم ہاؤس اور ایوان صدر کی ایک روز کی بجلی بچالی جائے تو پنڈی بھٹیاں جیسے نصف درجن قصبوں کے پورے ماہ کے بل ادا کیے جاسکتے ہیں۔

لیکن افسوس، اس ملک میں کوئی احتجاج کرنے والا بچا ہے نہ ہی احتساب کرنے والا۔

پرائم منسٹر سیکرٹریٹ

قمر بھٹی کا دعویٰ ہے پاکستان برطانیہ سے کہیں زیادہ جدید، امیر اور خوشحال ہے ...... لیکن ٹھہریئے، آگے چلنے سے قبل قمر بھٹی کا تعارف بھی ضروری ہے۔ قمر کے والدین گوجر خان کے ایک پسماندہ گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اچھے وقتوں میں برطانیہ چلے گئے تھے جہاں بڑے بھٹی صاحب نے دن رات محنت کر کے نہ صرف اپنا کاروبار سیٹ کر لیا بلکہ سوسائٹی میں اپنا ایک مقام بھی پیدا کر لیا۔ قمر بھٹی کی ساری پرورش برطانیہ کے آزاد ماحول میں ہوئی۔ تعلیم وہیں پائی، زندگی گزارنے کے سارے آداب وہیں سے سیکھے۔ جب بڑا ہوا تو والدین سے دو چیزیں ورثے میں ملیں۔ ایک جما جمایا کاروبار اور دوسری گوجر خانی پنجابی۔ قمر بھٹی ایک عرصے بعد اوورسیز پاکستان فاؤنڈیشن کے کنونشن میں شرکت کے لیے پاکستان آیا۔ یہاں دیگر پانچ سو ''غیر ملکی'' پاکستانیوں کے ہمراہ اس نے کنونشن سنٹر، وزیراعظم سیکرٹریٹ (نیا تعمیر شدہ)، پارلیمنٹ ہاؤس، شاہراہ دستور، دامن کوہ اور دو فور اور فائیو سٹار ہوٹل دیکھے۔ سڑکوں پر رواں دواں گاڑیاں اور شاپنگ سنٹروں میں خریداری کرتی بیگمات دیکھیں، دروازوں تک پیک ریسٹورنٹ اور سڑکوں تک پھیلی دکانیں ملاحظہ کیں، سرکاری ملازمین کو جیبوں میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کے بنڈل نکالتے اور پھر بغیر گنے کاؤنٹر پر پھینکتے دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔

اس نے سوپ کی ''سپ'' لی اور نیپکن کے کونے سے ہونٹوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے کہا ''یقین کریں میں نے لیبر پارٹی کے ایڈوائزر کی حیثیت سے پورا برطانیہ دیکھا، ایک ایک کونہ، ایک ایک گلی دیکھی، لیکن خدا کی قسم گوروں کے پورے دیس میں اسلام آباد کنونشن سنٹر جیسی ایک بھی سرکاری عمارت نہیں اور نہ ہی مستقبل میں ایسی شاندار عمارت بننے کا امکان ہے کیونکہ برطانیہ کی کوئی بھی حکمران جماعت اتنی فضول خرچی کے بعد پھر ایک سو سال تک الیکشن نہیں لڑ سکتی۔ آپ یقین فرمائیں، جس شاہی محل کی شہرت پوری دنیا میں پھیلی ہے، میں نے اسے اندر سے دیکھا ہے، لیکن وہ ہمارے پارلیمنٹ ہاؤس کا کسی بھی حوالے سے مقابلہ نہیں کر سکتا، رہا پرائم منسٹر سیکرٹریٹ، تو یقین کیجیے گا دنیا کے ''بوڑھے بادشاہ'' کے پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کی آپ کے جدید مغلیائی سیکرٹریٹ کے سامنے وہی حیثیت ہے جو گاؤں کے چودھری کے سامنے کسی ''کمی'' کی ہوتی

ہے۔ آپ ''۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ'' جائیں آپ کو لکڑی کا ایک بھدا سا دروازہ ملے گا، آپ اس کے اندر داخل ہوں سامنے'' کیبنٹ ہال'' ہے جس میں بمشکل پچاس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اس کے گرد دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن میں صوفے لگے ہیں، اس سے اوپر (دوسری منزل) وزیراعظم کا آفس ہے، معمولی سا کمرہ، جس میں ایک دفتری میز، ایک بڑی کرسی اور چند چھوٹی کرسیاں ہیں، کمرے میں ایک تولئے، چند فائلوں اور ایک آدھ تصویر کے سوا کوئی قابل ذکر چیز نہیں۔ اس آفس کے باہر وزیراعظم کے عملے کے چند دفتر ہیں، ایک کیبنٹ سیکرٹری کا دفتر، ایک پرسنل سیکرٹری اور اس کے سیکرٹری کا دفتر اور ایک پروٹوکول افسر کا دفتر اور بس۔ تیسری منزل ''وزیراعظم ہاؤس'' ہے جہاں وزیراعظم اپنی فیملی کے ساتھ اپنی آئینی مدت پوری کرتا ہے، یہ دو بیڈروم کی معمولی سی رہائش گاہ ہے جس میں کوئی خانساماں، کوئی بٹلر اور کوئی چوکیدار نہیں، گھر کے تمام کام خاتون اول کرتی ہے جبکہ دروازہ کھولنا اور بند کرنا وزیراعظم کی ذمہ داری ہوتی ہے، سرکاری خدمات کی بجا آوری کے بعد مسٹر ٹونی بلیئر اور مسز بلیئر سر جوڑ کر گھر چلانے کے نسخے ''ڈسکس'' کرتے ہیں۔ ذاتی دوستوں سے ملنے کے لیے اپنی پرانی کار میں جاتے ہیں، خریداری کے لیے سیل کے سیزن کا انتظار کرتے ہیں اور مہمان کی آمد پر دونوں میاں بیوی ''اب کیا کریں'' کی کھسر پھسر بھی کرتے ہیں...... لیکن آپ کا وزیراعظم سیکرٹریٹ، اللہ معاف کرے، اگر مسز بلیئر اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لے تو شاید بیہوش ہو جائے، چھ منزلہ عظیم مغلائی عمارت جس میں ایک وسیع بینکویٹ ہال، کانفرنس ہال، کیبنٹ میٹنگ ہال، پورے فلور پر وزیراعظم کا آفس، سیکرٹریز کے لیے شاہانہ دفاتر اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ ہم لوگ برطانیہ میں ایسی عمارت ''افورڈ'' نہیں کر سکتے۔'' اس نے نیپکن سے دوبارہ ہونٹ صاف کیے، میں نے قہقہہ لگایا اور پھر سرگوشی میں کہا: ''شاہانہ عمارت کے باوجود، ہم نے وزیراعظم کی رہائش کے لیے ایک الگ محل بنا رکھا ہے، جس کی حفاظت کے لیے اڑھائی تین سو لوگ ملازم ہیں۔'' ''اوئو'' قمر کے منہ سے نکلا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

ہمارے دوست ملک اکرم کو وائٹ ہاؤس کی ''زیارت'' کا موقع ملا تو انہوں نے واپس آ کر تمام دوست جمع کیے اور انہیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ دنیا کے دارالحکومت ''وائٹ ہاؤس'' میں پوری دنیا کے ''بادشاہ'' کے تصرف میں صرف دو کمرے ہیں۔ ''اوول آفس'' جس کا مجموعی رقبہ اڑھائی سو فٹ سے زیادہ نہیں ہوگا، اس میں چپڑاسی تک نہیں، دنیا کا صدر مہمان کے لیے خود دروازہ کھولتا ہے، پردے کھینچتا ہے اور فائلیں تلاش کرتا ہے، آفس کے ساتھ ہی میٹنگ ہال ہے، جس میں ایک لمبی میز کے ساتھ دو تین درجن کرسیاں رکھی ہیں، پھر صدر کے ذاتی عملے کے چند دفاتر ہیں، یہ چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں، جن میں آسائش نام کی کوئی چیز نہیں اور باقی وائٹ ہاؤس...... ایک عرصے سے عجائب گھر قرار دیا جا چکا ہے جہاں دنیا بھر کے سیاح ٹکٹ لے کر داخل ہوتے ہیں اور مختلف کمروں میں گھوم پھر کر امریکی روایات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ملک اکرم نے گائیڈ سے اس ''واردات'' کی وجہ پوچھی تو اس نے کندھے اچکا کر کہا'' مجبوری مائی ڈیئر'' وائٹ ہاؤس کی مین ٹی ننس کے

اخراجات بہت زیادہ تھے، جنہیں پورا کرنے کے لیے حکومت کو مجبوراً اس کا ایک بڑا حصہ میوزیم ڈیکلیئر کرنا پڑا۔''

''کیا امریکی خزانہ اپنے ایوان صدر کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا۔'' ملک اکرم نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں خزانے میں اس فضول خرچی کی کوئی گنجائش نہیں'' گائیڈ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں کیا امریکہ ایک غریب ملک ہے'' ملک اکرم کی تحقیقاتی حسیں جاگ اٹھی تھیں۔ ''نہیں غریب تو نہیں لیکن امریکی شہری حکومت کو اپنی فلاح و بہبود کے لیے ٹیکس دیتے ہیں، وائٹ ہاؤس کی تزئین و آرائش کے لیے نہیں۔ چلیں دفع کریں، آیئے میں آپ کو امریکی صدر کو کام کرتے ہوئے دکھاتا ہوں'' اور پھر گائیڈ اپنے سیاحوں کو ایک ایسے زاویے پر لے گیا جہاں شیشے کی دیوار کی دوسری جانب صدر ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ایک فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔

میرا ایک سفارتکار دوست آسٹریلیا سے واپس آیا تو اس نے ایک عجیب واقعہ سنایا، کہنے لگا: ''ہم پاکستان سے آنے والے مہمانوں کو ایک بوسیدہ سی عمارت کے احاطے میں لے جاتے تھے، جھاڑ جھنکار سے الجھتے، کانٹوں سے بچتے بچاتے اور اونچے نیچے راستوں سے ٹھڈے کھاتے ہوئے جب ہم قدیم دور کی اس عمارت کے قریب پہنچتے تھے تو شیشے سے آنکھیں لگا کر مہمان سے کہتے سامنے دیکھو، مہمان غور سے دیکھتا تو معمولی سے دریچے کے ڈرائنگ روم میں ایک بوڑھے کو آتش دان میں لکڑیاں رکھتے اور ایک بوڑھیا کو آرام چیئر پر سویٹر بنتے پاتا، پھر حیرت سے واپس مڑ کر استفہامیہ نظروں سے پوچھتا، یہ کون ہیں؟ ہم مسکرا کر کہتے آسٹریلیا کی منتخب حکومت کا آئینی سربراہ اور خاتون اول، تو وہ اچھل کر دو قدم پیچھے آ گرتا۔

میاں محمود جب جنرل ضیا کے ساتھ جاپان گئے تو جاپانی وزیراعظم کو ایک معمولی سے کمرے میں معمولی سی میز پر بیٹھے پایا۔ میز کے ایک کونے پر سٹیل کے چھوٹے سے راڈ پر جاپان کا جھنڈا لگا تھا جبکہ میز پر لٹھے کا ایک معمولی سا میز پوش بچھا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹریل سٹیٹ کے آئینی سربراہ نے اسی میز پر بیٹھے بیٹھے جنرل ضیا اور ان کے وفد کا استقبال کیا، اسی میز پر ان سے گفتگو کی اور اسی میز پر اربوں ڈالر کے سمجھوتوں پر دستخط کیے۔ اسی دورے کے دوران جب پاکستان کی ایک بڑی شخصیت نے وزیراعظم ہاؤس دیکھنے پر اصرار کیا تو میزبان انہیں ایک کھنڈر میں لے گئے، چوکھٹوں کو دیمک کھا چکی تھی، دروازے ٹوٹ کر قبضوں پر جھول رہے تھے، چھتیں ٹپک رہی تھیں، سیلن فرش کی ٹائلیں توڑ کر اوپر آ چکی تھی اور دیواروں کا پلستر اینٹوں کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ حیرت زدہ مہمان نے میزبان سے پوچھا ''کیا واقعی یہی وزیراعظم ہاؤس ہے۔'' میزبان نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہاں ہز ایکسی لینسی، یہی ہمارا وزیراعظم ہاؤس ہے۔'' ''مگر یہ تو بھوت بنگلہ ہے۔'' مہمان نے خوف سے پوچھا۔ ''ہوا کرے، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کیونکہ ہم نے جنگ عظیم دوم کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ جب تک پورا جاپان تعمیر نہیں ہو جاتا وزیراعظم ہاؤس میں سفیدی ہو گی اور نہ ہی کوئی اینٹ لگائی جائے گی۔'' میزبان دوبارہ مسکرایا۔

سویڈن کی ایک ٹرام میں جب ہمارے ایک دوست نے کہنی سے اپنے بوڑھے ہم سفر کو دوسری طرف دھکیلا تو میزبان نے سرگوشی میں کہا۔ ''یار بے چارے کو تنگ مت کرو یہ ہمارا وزیر داخلہ ہے۔'' دوست نے چونک کر دیکھا بوڑھا ایک کونے میں سمٹ کر معذرت خواہانہ انداز سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ادھر ناروے میں جب میزبان کی گاڑی خراب ہوگئی تو اس نے ایمرجنسی لائٹس آن کر دیں دو منٹ بعد فلیگ والی ایک گاڑی قریب آ کر رکی۔ اس میں سے ایک مسکراتا ہوا چہرہ اترا، مسئلہ پوچھا اور پھر میزبان کو گاڑی میں بیٹھنے کی ہدایت کر کے خود خراب گاڑی کو دھکا لگانے لگا، آدھے گھنٹے کی مشقت کے بعد جب گاڑی سٹارٹ ہوئی تو دھکا لگانے والے کے کپڑے، ہاتھ اور منہ بری طرح گندے ہو چکے تھے، ایک کلومیٹر بعد میزبان نے کیسٹ پلیئر کی آواز نیچی کی اور مہمان سے پوچھا، تم اس شخص کو جانتے ہو؟ مہمان نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ناروے کا وزیراعظم ہے۔ افسوس بے چارے کو اب اپنی ذاتی جیب سے کپڑے دھلوانے پڑیں گے۔''

کاش یہ سویڈن ہوتا

۱۹۶۱ء میں اس وقت کے نوجوان وزیر ذوالفقار علی بھٹو امداد لینے کے لیے سویڈن گئے، پاکستانی وفد مقررہ وقت پر میٹنگ روم پہنچ گیا لیکن سویڈش وزیراعظم اولف پالمے غائب تھے، جب بھٹو صاحب کو انتظار کرتے ہوئے پورے پانچ منٹ گزر گئے تو انہوں نے اس زیادتی پر پروٹوکول آفیسر سے احتجاج کیا، ابھی آفیسر کسی مناسب جواب کے لیے پر تول رہا تھا، دروازہ کھلا اور اولف پالمے اس شان سے ہانپتے ہوئے اندر داخل ہوئے کہ ان کے بال بکھرے تھے، ٹائی ڈھیلی ہو کر لٹک رہی تھی اور ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے، میزبان وزیراعظم نے آتے ہی مہمانوں سے کہا ''میں تاخیر سے آنے پر معذرت خواہ ہوں، میں نے دراصل اپنی بیوی کو کہیں ڈراپ کرنا تھا، اس ''ڈیوٹی'' سے فارغ ہو کر واپس پہنچا تو آپ لوگوں کی گاڑیوں کی وجہ سے پارکنگ میں جگہ نہیں تھی لہٰذا گاڑی دو میل پیچھے کھڑی کر کے وہاں سے بھاگتا ہوا یہاں پہنچا، معافی، معافی۔''

ملاقات کے بعد جب بھٹو صاحب ہوٹل واپس پہنچے تو انہوں نے وفد میں شامل ایک سینئر سفارتکار سے پوچھا۔ ''مسٹر بیگ میرا خیال ہے اولف پالمے اس واقعے کے ذریعے ہمیں کچھ سمجھانا چاہتے تھے۔'' منہ پھٹ سفارتکار نے فوراً جواب دیا۔ ''جی ہاں معزز وزیر اولف یہ کہنا چاہتے تھے آپ لوگ ۱۶۷ افراد کے وفد کے ساتھ جس ملک میں امداد لینے آئے ہیں اس کے تو وزیراعظم ہی کو پارکنگ میں جگہ نہیں ملتی۔'' بھٹو نے سادگی سے پوچھا۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' سفارتکار نے جواب دیا۔ ''سر اس لیے کہ یہ پاکستان نہیں سویڈن ہے۔''

میرا خیال ہے اگر ہم پاکستان کی بجائے سویڈن کے شہری ہوتے تو ہم نواز شریف کے اس بیان ''وفد میں ۱۲۰ نہیں صرف ۵۱ افراد شامل تھے'' کے بعد بھی حکومت سے سینکڑوں سوال پوچھ سکتے تھے۔ مثلاً ہم پوچھ سکتے تھے'' جناب ان ۱۵۱ افراد کے علاوہ جو ۶۹ دانشور، بیوروکریٹ، سفارتکار اور صحافی وزیراعظم کے پہنچنے سے پہلے ہی امریکہ میں خیمہ زن ہو چکے تھے، وہاں کس ملک کی ''خدمت'' کے لیے گئے تھے، ان کے قیام و طعام، فضائی، بری اور بحری سفر کے اخراجات کس نے ادا کیے، ہم پوچھ سکتے تھے، جب اوول آفس میں وزیراعظم کے ساتھ صرف پانچ حضرات (شہباز شریف، اسحاق ڈار، سرتاج عزیز، شمشاد احمد اور ریاض کھوکھر) جا سکتے تھے تو پھر اپنے ساتھ ۱۵۱ سالار لے جانے کی کیا ضرورت تھی، ہم پوچھ سکتے تھے، جب اس دورے کے لیے ۱۵ افراد ضروری تھے تو پھر تین دستوں میں ۱۲۰ افراد امریکہ منتقل کیوں کیے گئے، ہم پوچھ سکتے تھے اس

سیکرٹری کی اہلیہ اور اس کے لندن میں بیٹے کی امریکہ میں کیا ضرورت پڑ گئی تھی جسے آخری وقت میں وفد کا حصہ بنایا گیا تھا، ہم پوچھ سکتے تھے، اس ورکنگ وزٹ (جس میں امریکی صدر کوئی بڑی کمٹمنٹ نہیں دیتا، مہمان وزیر اعظم کو وائٹ ہاؤس میں گارڈ آف آنر نہیں دی جاتی، صدر مہمان کو ڈنر نہیں دیتا، وائٹ ہاؤس کے دروازے پر اس کا استقبال نہیں کرتا) سٹیٹ وزٹ بنا کر کیوں پیش کیا گیا؟

اگر یہ سویڈن ہوتا تو ہم لوگ پوچھ سکتے تھے "جناب اس دورے پر ایک ملین ڈالر کی خطیر رقم کس کی اجازت سے خرچ کی گئی، پی آئی اے کا ایک طیارہ دس روز تک امریکہ میں کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی، جس کے اب اڑھائی کروڑ روپے بطور لینڈنگ چارجز ادا کیے جائیں گے، ۴۰ ڈالر (۲۴ سو روپے قریباً) فی گھنٹہ پر تین روز کے لیے ۵۰ لیموزین کرائے پر کیوں لی گئیں۔ وفد کے ارکان نے معمولی سی تکلیف برداشت کر کے ان لیموزینز پر خرچ ہونے والے ۲۱ لاکھ ۴۰ ہزار روپے کیوں نہیں بچالیے اور کرائے کے ہیلی کاپٹروں پر نیاگرا فال جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

اگر یہ سویڈن ہوتا تو ہم لوگ پوچھ سکتے تھے "جناب لندن میں اتوار کی رات گیارہ بجے پاکستانی ہائی کمشنر کو گالیاں کیوں دی گئی تھیں، اسے وفاقی وزراء کے لیے فائیو سٹار ہوٹل کی بجائے فور سٹار کا انتظام کرنے پر سخت سست کیوں کہا گیا تھا، کس کی اجازت سے سرتاج عزیز، عابدہ حسین، غوث علی شاہ، چوہدری نثار علی، فخر امام، شمشاد احمد اور حاجی بازگل کو ماربل آرچ کے فور سٹار کمبر لینڈ سے پارک لین کے فائیو سٹار ہلٹن منتقل کیا گیا اور ان فور سٹار اور فائیو سٹار ہوٹلوں کے کرائے کس کی جیب سے ادا کیے گئے۔"

اگر یہ سویڈن ہوتا تو ہم لوگ پوچھ سکتے تھے، ہمارے وفاقی وزراء، سفارتکار اور بیورو کریٹ امریکہ اور لندن میں پاکستانیوں سے منہ کیوں چھپاتے پھر رہے تھے، وہ اتنے بڑے وفد، شاہی اخراجات اور قیمتی گاڑیوں کے بارے میں جواب دینے سے کیوں کترا رہے تھے، جناب اسحاق ڈار نے لندن کی پریس کانفرنس میں چڑ کر کیوں کہا تھا "پچھلی حکومت تو مراثیوں اور ڈانسروں کو بھی دوروں میں شامل کر لیتی تھی۔" وفاقی وزیر خزانہ اس شخص پر کیوں چڑھ دوڑے تھے جس نے سینکڑوں افراد کی موجودگی میں کہہ دیا تھا۔ "جناب آپ بھی تو اپنے ساتھ میراثی ہی لے کر آئے ہیں۔"

اگر یہ سویڈن ہوتا تو یقیناً ہمارے وزیر اعظم کو بھی اپنی گاڑی دو میل پیچھے کھڑی کرنا پڑتی، انہیں بھی وہاں سے بھاگ کر میٹنگ روم آنا پڑتا، انہیں بھی عام فلائٹوں پر اکانومی کلاس میں سفر کرنا پڑتا، انہیں بھی سفارتخانوں کی معمولی گاڑیوں پر وائٹ ہاؤس جانا پڑتا، انہیں بھی نیاگرا فال دیکھنے کے لیے ذاتی جیب سے ٹرینوں، ٹراموں اور ٹیکسیوں میں سفر کرنا پڑتا، انہیں بھی دس روزہ دورے کے لیے آٹھ چھٹیاں لینا پڑتیں۔

ہاں اگر یہ سویڈن ہوتا تو آج دنیا ہمیں ایسی قوم نہ کہہ رہی ہوتی جو مانگے کی شراب بھی ہیرے جڑے پیالوں میں پیتی ہے۔

اگر یہ سویڈن ہوتا! کاش یہ سویڈن ہوتا!

شیشے کی دوکان میں ہاتھی

رٹ بجری گیڈ (Ritt Bjeregaad) ڈنمارک کی خاتون وزیر تھیں، وہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے پیرس گئیں، کانفرنس ختم ہوئی تو ڈنمارک کے ایک اخبار نے رٹ کے سرکاری خرچ پر ہوٹل میں ٹھہرنے کی خبر شائع کر دی، بس خبر چھپنے کی دیر تھی ڈینش عوام سڑکوں پر آ گئے، رٹ کے خلاف جلوس شروع ہو گئے، اس کے پتلے جلنے لگے، یہ عوامی ردعمل اس قدر شدید تھا کہ ڈنمارک کی حکومت کو اس کا فوراً نوٹس لینا پڑا، رٹ کو چارج شیٹ کر دیا گیا جس کے جواب میں خاتون وزیر نے موقف اختیار کیا ''کانفرنس ہال ڈینش ایمبیسی سے بہت دور تھا، میں بہت علیل تھی، میرے لیے دن میں دو تین بار ہال تک آنا جانا ممکن نہیں تھا لہٰذا میں نے مجبوراً کانفرنس ہال کے نزدیک ایک دوسرے درجے کے ہوٹل کا ایک معمولی سا کمرہ لے لیا جس کا کرایہ میں نے سرکاری خزانے سے نہیں بلکہ اپنے ٹی اے ڈی اے سے ادا کیا'' گو رٹ کے موقف میں بڑی جان تھی لیکن اس کے باوجود قوم نے انہیں معاف کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ وہ نہ صرف مستعفی ہو گئیں بلکہ انہیں ہمیشہ کے لیے سیاست سے بھی غائب ہونا پڑا۔

مجھے یہ واقعہ ایک سفارتی تقریب میں ڈنمارک کے ایک سفارتکار نے سنایا تھا جب وہ رٹ کی کہانی سنا چکے تو میں نے حیرت سے پوچھا ''اتنی معمولی سی بات پر اتنی کڑی سزا'' سفارتکار نے گرمجوشی سے جواب دیا ''آپ شاید ڈنمارک کی سفارتی روایات سے واقف نہیں، ڈینش حکومتی عہدیداروں کو دوروں کے دوران ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے۔'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا ''پھر وہ کہاں ٹھہرتے ہیں؟'' اس نے اس جوش سے جواب دیا ''ڈنمارک کی ایمبیسیوں میں، سفیروں کے سرکاری گھروں پر یا پھر میزبان ملک کی فراہم کردہ رہائش گاہوں میں۔'' مجھے اس بات پر یقین نہ آیا لہٰذا میں نے انہیں مزید کریدنے کے لیے پوچھا ''لیکن رٹ کے عذر میں تو بڑا وزن تھا۔'' سفارتکار نے مسکرا کر پلیٹ میز پر رکھ دی اور ٹشو سے منہ صاف کر کے بولا ''بات مجبوری یا عذر کی نہیں، بات یہ بھی نہیں رٹ نے ہوٹل کا بل کہاں سے ادا کیا تھا، بات صرف روایت کی ہے اور روایت یہ کہتی ہے ڈینش عوام اپنے کسی نمائندے کو غیر ملک کے کسی ہوٹل میں برداشت نہیں کرتے اور رٹ نے اس روایت کی خلاف ورزی کی تھی چنانچہ اسے مستعفی ہونا پڑا۔''

سفارتکار کا استدلال میرے سینے پر برچھی کی طرح لگا، میرا جی چاہا میں اس کا دامن پکڑ کر کہوں، میرے دوست تم لوگ کتنے کم ظرف ہو اپنے نمائندوں کی اتنی چھوٹی غلطیاں معاف نہیں کرتے، ہمارے ظرف دیکھو، ہم کتنے وسیع القلب ہیں، گزشتہ پچاس برسوں میں ہمارے ''رتوں'' نے ۱۱ ہزار غیر ملکی دورے کیے، ہر دورے پر لاکھوں، کروڑوں روپے خرچ ہوئے، وفد کا ہر رکن فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرا، ہر شخص نے تین تین بار ناشتہ کیا لیکن ہم نے آج تک کسی ''رت'' کو روک کر نہیں پوچھا ''جناب آپ یہ ڈالر کس کی اجازت سے خرچ کرتے رہے۔ کیا آپ کو اس عیاشی کا استحقاق حاصل تھا۔''

میرا جی چاہا میں اس کا دامن پکڑ کر کہوں میرے دوست دیکھو، وسیع القلب لوگ ایسے ہوتے ہیں پچھلے ایک برس میں ہماری اعلیٰ شخصیات نے بھاری وفد کے ساتھ ۳ے غیر ملکی دورے کیے، ان میں وزیراعظم کی معیت میں ۲۴ اور وزیر خارجہ کی قیادت میں ۲۲ ''لشکر'' باہر گئے لیکن ہم نے کسی ''رت'' سے نہیں پوچھا۔ ''جناب آپ لوگوں نے ڈیواس کے دو روزہ دورے پر دو ملین ڈالر (اس وقت ۹ کروڑ روپے) کیوں خرچ کیے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ کانفرنس ہال میں صرف پانچ افراد جا سکتے ہیں آپ چھ درجن ''ماہرین'' اپنے ساتھ کیوں لے کر گئے، آپ کو سات گاڑیوں کی ضرورت تھی لیکن آپ نے آٹھ سو فرانک (اس وقت ۲۴ ہزار روپے) فی گاڑی کے حساب سے ۴۸ گاڑیاں کرائے پر کیوں لیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یورپ کے تین وزرائے اعظم کانفرنس میں شرکت کے لیے ٹرین پر سوئٹزرلینڈ آ رہے ہیں، آپ جہاز بھر کر کیوں روانہ ہوئے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ۹۰ فیصد سربراہان مملکت اپنے سفارت خانوں، ریسٹ ہاؤسز اور دوست احباب کے فلیٹس میں قیام کریں گے، آپ نے اپنا ''بحری بیڑا'' فائیو سٹار ہوٹلوں میں لنگر انداز کیوں کیا۔

میرا جی چاہا میں اس کا دامن پکڑ کر کہوں میرے دوست دیکھو وسیع القلب لوگ ایسے ہوتے ہیں، ہمارے ''رت'' امداد کے لیے چین جانے لگے تو ''سواریاں'' زیادہ ہو گئیں، فیصلہ ہوا اس بار ی ۱۳۰ کی بجائے بوئنگ ۳۱۰ ایئر بس ہی لے جاتے ہیں، حکم جاری ہوا، پی آئی اے کا ایک طیارہ روک لیا جائے، حکم کی تعمیل ہوگئی ۲۲، لاکھ روپے (وزیر اطلاعات کا دعویٰ تھا ۲۲ نہیں صرف ۳ لاکھ روپے خرچ ہوئے) سے اس کی تزئین و آرائش کی گئی جب عوامی جہاز ''شاہی سواری'' کے قابل ہو گیا تو تب کہیں جا کر دو سو ''رتوں'' کا لشکر اس ملک کی طرف روانہ ہوا جہاں آج بھی وزراء سائیکلوں پر دفتر جاتے ہیں، جب یہ لوگ ''بحالی قوت'' کے قدیم چینی نسخوں سے لدے پھندے واپس لوٹے تو تو ۳۱۰ کو ''ورلڈ ایئر ٹریفک'' سے الگ ہوئے پندرھواں روز تھا، ان ۱۵ ایام میں قوم کو زیادہ نقصان نہیں اٹھانا پڑا بس قومی ایئر لائن ان ۱۰ کروڑ روپے سے محروم ہو گئی جو وہ اس طیارے کے ذریعے کما سکتی تھی۔

میرا جی چاہا میں اس کا دامن پکڑ کر کہوں، میرے دوست دیکھو وسیع القلب لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے ''رتوں'' کا ایک اور لشکر کلنٹن کا شکریہ ادا کرنے امریکہ روانہ ہوا جہاں فائیو سٹار ہوٹلوں

کے صاف ستھرے چمکدار کمرے، برق رفتار مرسیڈیز گاڑیاں اور نیلی پیلی روشنیوں والے چکنے فرش ان کے منتظر ہیں، ہم لوگ جانتے ہیں وہاں کیا ہوگا، اس دورے کے کیا نتائج برآمد ہوں گے، لیکن اس کے باوجود ہم لوگ سڑکوں پر نہیں آئیں گے، جلوس نہیں نکلیں گے، پتلے نہیں جلیں گے کیونکہ ہم ہی وہ لوگ ہیں جو شیشے کی دکان میں ہاتھی بٹھا کر امن، ترقی اور خوشحالی کے خواب دیکھتے ہیں۔

مینڈل سن شرمندہ تھا

۱۹۹۶ء کی بہار تھی، برطانیہ کی لیبر پارٹی کا مشہور لیڈر پیٹر مینڈل سن اپنی ہی سیاسی جماعت کے ایک ارب پتی راہنما جیفری رابن سن کے گھر گیا، باتوں ہی باتوں میں جدید طرز تعمیر کا کرذ کر چل نکلا مینڈل سن نے رابن سن کے عالیشان گھر پر نظر دوڑائی اور پھر بڑی حسرت سے بولا ''اتنا ہی شاندار گھر میرا بھی خواب تھا لیکن.....'' مینڈل سن خاموش ہوگیا، رابن سن نے کروٹ بدل کر پوچھا ''لیکن؟'' مینڈل سن نے بھرائی آواز میں جواب دیا ''لیکن میں افورڈ نہیں کرسکتا۔'' مینڈل سن کا یہ فقرہ سن کر رابن سن نے قہقہہ لگایا اور اسے آسان شرائط پر قرضے کی پیشکش کردی، رابن سن کی آفر اس قدر شاندار اور برجستہ تھی کہ مینڈل سن نے بلا سوچے سمجھے ہاں کردی، چنانچہ اگلے روز دونوں دوست شہر گئے اور چند گھنٹوں کی جستجو کے بعد ٹرینڈی نوٹنگ ہل ایریا (Trendy notting hill area) میں ایک شاندار مکان پسند کرلیا،۳ لاکھ ۷۳ ہزار پونڈ میں سودا ہوا جو رابن سن نے اسی وقت ادا کردیے۔

مئی ۱۹۹۷ء میں برطانیہ میں الیکشن ہوئے،عوام میں پیٹر مینڈل سن کی ساکھ اور مقبولیت کے باعث لیبر پارٹی نے ''لینڈ سلائیڈ وکٹری'' حاصل کرلی جس کے نتیجے میں ٹونی بلیئر وزیراعظم بن گیا جبکہ پیٹر مینڈل سن وزیر صنعت وتجارت اور جیفری رابن سن خزانہ کا نائب وزیر ہوگیا،ٹونی بلیئر نے وزیراعظم کی حیثیت سے اپنی پہلی تقریر میں اعلان کیا ''ہماری حکومت اتنی پاکیزہ ہوگی کہ پاکیزگی بھی اس پر رشک کرے گی۔'' آنے والے دنوں میں بلیئر نے اپنی پالیسیوں اور بعض غیر معمولی اقدامات سے اپنا یہ دعویٰ سچ کر دکھایا، یہ سب بھی مینڈل سن کا مرہون منت تھا کیونکہ وہ نہ صرف عوام میں مقبول تھا بلکہ تمام وزراء سے بھی ذہین تھا۔

۱۹۹۸ء کے وسط میں مینڈل سن کی وزارت نے جیفری رابن سن کے اثاثہ جات کی پڑتال کی جس کی رپورٹ پر وزیر نے قاعدے کے مطابق دستخط کردیئے، بات ختم ہوگئی لیکن دسمبر ۱۹۹۸ء کے شروع میں لندن کے ایک اخبار کو کسی ذریعے سے مینڈل سن کے خفیہ قرضے کی خبر ہوگئی اخبار کے رپورٹر نے تحقیق کے بعد ۲۱ دسمبر ۱۹۹۸ء کو ''مینڈل سن، رابن سن ڈیل'' کی خبر شائع کردی، بس چھپنے کی دیر تھی، برطانیہ کے حکومتی ایوانوں میں زلزلہ آگیا، دوپہر تک مارکیٹ میں پونڈ امریکی ڈالر اور جرمن مارک کے مقابلے میں خشک پتے کی طرح کانپنے

لگا یوں محسوس ہوتا تھا برطانوی معیشت ہی بیٹھ جائے گی، لوگ باہر آ گئے، اخبارات نے معمول کی خبریں روک کر مینڈل سن سیکنڈل پر خصوصی ضمیمے شائع کرنا شروع کر دیئے۔

اسی شام ایوان کا ہنگامی اجلاس ہوا جس میں خاتون ممبر الزبتھ فیلکن نے مینڈل سن کے بخیئے ادھیڑ دیئے، مینڈل سن کا موقف تھا "یہ میرا ذاتی قرض تھا جس میں ذرا برابر بھی حکومتی اثر و رسوخ استعمال نہیں ہوا۔" فیلکن کا کہنا تھا، "یہ درست ہے اس قرضے سے کسی برطانوی قانون پر زد نہیں پڑی لیکن الیکشن کے دوران جب اثاثہ جات کی فہرست تیار ہوئی تو مینڈل سن نے اس قرض کا اس میں ذکر کیوں نہیں کیا۔ مزید جب رابن سن کے اثاثہ جات کی پڑتال ہو رہی تھی تو مینڈل سن کیوں خاموش رہا لہٰذا یہ دونوں "جرائم" کسی بھی طرح قابل معافی نہیں۔" ایوان کے زیادہ تر ارکان نے الزبتھ فیلکن کے موقف کی تائید کی۔

فلیکن کی جرح ۲۲ اور ۲۳ دسمبر کے اخبارات میں شائع ہوئی جس نے مینڈل سن کے خلاف عوامی نفرت کو بھانبڑ بنا دیا، اس روز سیاسی تجزیہ نگاروں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اگر اس سیکنڈل پر بروقت قابو نہ پایا گیا تو شاید چند دنوں میں مینڈل سن کے ساتھ ساری حکومت ہی رسوا ہو جائے لہٰذا ۲۳ دسمبر ہی کے روز برطانیہ کے مقبول ترین لیڈر پیٹر مینڈل سن نے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا "ہم نے اعلان کیا تھا ہماری حکومت اتنی پاکیزہ ہوگی کہ اس پر پاکیزگی بھی رشک کرے گی لیکن افسوس میں اس دعوئی پر پورا نہ اتر سکا لہٰذا مجھے اب حکومت میں رہنے کا کوئی حق نہیں، میں مستعفی ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔" ٹونی بلیئر نے دکھی دل کے ساتھ اس کا استعفیٰ منظور کر لیا ٹھیک ۳ گھنٹے بعد قرض دینے والا جیفری رابن سن بھی مستعفی ہو گیا، جب دونوں رہنما ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ سے باہر آ رہے تھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، وزیراعظم ہاؤس کے سامنے کھڑے لوگ ان سیاستدانوں کا دکھ سمجھ سکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے اب برطانوی سیاست کے دروازے ان دونوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں۔

مجھے ان لوگوں کی آبزرویشن سے اتفاق نہیں کیونکہ میرا خیال ہے مینڈل سن کی آنکھوں میں اقتدار چھوڑنے پر آنسو نہیں تھے بلکہ وہ پاکستان کی بجائے برطانیہ میں پیدا ہونے پر دل گرفتہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا اگر وہ پاکستان میں ہوتا تو قرض لینے اور قرض چھپانے کے "جرم" میں آج یوں رسوا نہ ہو رہا ہوتا، وہ ۵ لاکھ پونڈ کے خفیہ اکاؤنٹ کے اعتراف کے بعد بھی آفتاب شیر پاؤ کی طرح بدستور پیپلز پارٹی کا سیکنڈ ان کمانڈ ہوتا، وہ بھی ۱۹ غیر ملکی خفیہ اکاؤنٹس اور ۱۸ پوشیدہ جائیدادوں کے ثبوتوں کے باوجود بے نظیر بھٹو کی طرح اپوزیشن لیڈر ہوتا، وہ بھی ڈیڑھ ارب ڈالر کے خفیہ اکاؤنٹ (اس کے ثبوت معروف قانون دان اکرم شیخ کے پاس ہیں) کے باوجود "شیر پنجاب" ہوتا، وہ بھی آسٹریلیا میں فارمز اور کوریا میں خفیہ فیکٹریوں کے باوجود مضبوط ترین وزیر ہوتا، وہ بھی لندن، واشنگٹن اور اوٹاوا میں پوشیدہ فرموں کے کھلے رازوں کے باوجود سر پر وگ اوڑھ کر پھر رہا ہوتا، وہ جانتا تھا اگر وہ پاکستان میں ہوتا تو کوئی انگلی اس کی طرف نہ اٹھتی وہ ہر دو اڑھائی سال بعد منتخب ہو کر آتا،

لوٹتا، دم لینے کے لیے چلا جاتا اور پھر لوٹنے کے لیے آ جاتا۔ سٹیٹ بنک کی طرف سے نادہندہ قرار دیے جانے کے باوجود اس کی مضبوط کرسی پر کوئی لرزہ طاری نہ ہوتا، اس کا کوئی بال تک بیکا نہ کر سکتا، اسے کوئی پکڑ نہ سکتا، اسے کوئی سزا نہ دے سکتا۔

بس مینڈل سن اپنی اس غلطی پر نادم تھا، پاکستانی نہ ہونے پر شرمندہ تھا۔

بنیاد سے اکھڑی قومیں

کیا آسمان سے ٹوٹے تارے اور بنیاد سے اکھڑی قوموں کے لیے واپسی کا کوئی راستہ ہوتا ہے؟
میں نے گردن گھمائی اور میرے سامنے مٹی کی کچی دیواروں، ٹین کی چھتوں، ٹاٹ کے دروازوں اور دور دور تک پھیلے بوسیدہ خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔ میں نے دیکھا وہاں غربت، مسافرت، مظلومیت اور بے مقصدیت کے ڈھیر لگے تھے۔ کسی چہرے پر گزرے وقت کی خوشحالی، حال کا عزم اور مستقبل کی روشنی نہیں تھی اور جب ان تنگ گلیوں سے ہوا گزرتی تو گلتے سڑتے گوشت کی بدبو، ٹوٹے خوابوں کی چبھن اور تاسف کا احساس بھی ساتھ لے کر چلتی اور سورج جب اس خوابیدہ بستی سے طلوع ہوتا تو مسافروں کے کل کی زردی اس کے چہرے پر بچھی ہوتی اور جب شام کی زلفیں بکھرتیں تو رات کی سیاہی کچھ زیادہ ہی سیاہ نظر آتی۔
''شاہ جی! یہ لوگ کب سے یہاں ہیں؟'' میں نے اپنے ہمراہی سے پوچھا۔ ''افغان وار شروع ہوتے ہی یہاں آ گئے تھے۔'' ہمراہی نے تاسف کا گہرا گھونٹ بھرا۔ ''ہاں!'' میں نے سوچا یہ دکھ کئی نسلوں پر محیط ہے ایک نسل جب اپنے وطن سے چلی تو راستے میں جگہ جگہ اپنی ہڈیاں دفن کرتی آئی۔ دوسری نسل نے یہاں خیمے گاڑے اور واپسی کا راستہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ تیسری نسل پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے پورے پاکستان میں پھیل گئی۔ اجنبیوں کے بوٹ پالش کیے، مٹی ڈھوئی، مکئی کے بھٹے اور چنے بیچے، قہوہ خانے بنائے، بھٹوں، کارخانوں اور کھیتوں میں بیگار کی، برتن مانجھے، جھاڑو دیے، ٹانگی لگائی اور چوتھی نسل، ہاں اس نے آنکھ کھولی تو اس کا کوئی وطن نہیں تھا، قوم؟ افغان، جائے پیدائش؟ مہاجر کیمپ پشاور، زبان فارسی/ پشتو۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟ کہیں کے بھی نہیں۔ تعلیم؟ جہالت، پیشہ؟ سارے حرام، جائز۔ یہ نسل پچھلے پندرہ سولہ برس سے مسلسل پیدا ہو رہی ہے۔ ہر روز ان میں دو تین ہزار کا اضافہ ہو جاتا ہے۔''
''یہ سب افغانستان کے دوسرے درجے کے شہری ہیں؟'' میں نے اپنے ہمراہی سے پوچھا ''نہیں ان میں اکثریت اعلیٰ طبقے کی ہے۔'' ہمراہی نے اوپر بستی کی پیشانی پر جھکے زرد سورج پر نظریں گاڑ کر کہا ''ان میں اکثر اپنے اپنے علاقوں کے چودھری، ملک، خان، میاں، ٹمن، زرداری، لغاری، مزاری، جتوئی، گیلانی، قریشی اور بھٹو تھے۔ وہ دیکھیں بغیر استری لٹھے کے رومال جیسے چہرے والا وہ بوڑھا افغان، جس کے بدبودار

لباس نے کبھی صابن کا ذائقہ نہیں چکھا، جس کی پیٹھ گرم بستر اور نرم گدے کا گداز بھول چکی ہے اور جس کے دستر خوان پر روٹی کم اور ہاتھ زیادہ ہوتے ہیں، کابل کا امیر ترین شخص تھا۔ اس کے کھیتوں میں رزق اور اس کے باغوں میں ذائقہ اُگتا تھا اور اس کے محل میں آسائش، فراوانی اور خوشحالی کا دریا بہتا تھا، لیکن اب وہ پچھلے بارہ برس سے فٹ پاتھوں پر خشک میوے بیچتا ہے اور یہ بچہ جنوری کے آخری دنوں میں جس کے پاؤں میں جوتا نہیں، میل سے جس کی پوشاک تار تار ہو چکی ہے اور جس نے ایک عرصے سے منہ نہیں دھویا اور جو ہر صبح آنکھ میں مظلومیت بھر کر رزق کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے اور رات کو چند روپوں کی بھیک لے کر واپس لوٹ آتا ہے، افغانستان کی مرحوم پارلیمنٹ کے ایک رکن کا پوتا ہے اور وہ عورت بانس کی ٹوکریاں بناتے جس کے ہاتھ قیمہ ہو چکے ہیں، جس کے سفید بال وقت کی میل سے چیکٹ ہیں اور جو پردہ داری تو رہی ایک طرف ستر پوشی تک کے احساس سے غافل ہو چکی ہے، شہید افغانستان کے ایک مقتول وزیر کی بیوہ ہے۔ ہاں'' ہمراہی آہ بھر کر بولا'' یہ مظلوم اپنے اپنے وقت کے فرعون تھے۔''

'' کیا ان میں عام لوگ بھی ہیں۔'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

'' ہاں، ان میں عام لوگ بھی ہیں لیکن ان کی شناخت ممکن نہیں کہ گھروں سے نکلنے کے بعد خاص اور عام ایک ہو جاتے ہیں، سب مہاجر ہو جاتے ہیں۔''

'' یہ لوگ واپس کیوں نہیں جاتے؟'' ہمراہی نے قہقہہ لگایا اور مجھے تمسخرانہ نظروں سے دیکھ کر بولا: '' یہ اپنے وقت کا سب سے بڑا بے وقوفانہ سوال ہے، شاید تم نہیں جانتے، جس بستی سے ایک بار موت گزر جائے وہاں زندگی کو نمو کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں، جن کھیتوں میں ایک بار بارود کے ڈھیر لگ جائیں وہاں برسوں تک صرف اور صرف موت اُگتی ہے اور جن راستوں پر ایک بار توپ گاڑ دی جائے ان پر واپسی کا سفر محال ہوتا ہے، بیوقوف انسان اب افغانستان میں کچھ نہیں، سوائے ٹیکسلا، موہنجوداڑو اور ہڑپہ جیسے چند شہروں، تھوڑی سی آدھ جلی ہڈیوں، بے شمار بے گور و کفن نعشوں اور ہزاروں لاکھوں رائفلوں، توپوں اور گولوں کے۔ ہاں اب وہاں کچھ نہیں، جب کہیں سے زندگی، تہذیب اور معاشرت کے قدم اکھڑ جائیں تو انہیں دوبارہ استوار ہونے کے لیے صدیوں کی جدوجہد چاہیے ہوتی ہے، کئی نسلوں کی قربانیاں، ہزاروں لاکھوں لوگوں کا خون چاہیے ہوتا ہے۔ یہ لوگ گری دیواروں، بنجر زمینوں اور جلے باغوں کی آبادکاری کے لیے اپنی بچی کھچی نسل داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہیں، کیوں؟ کیونکہ یہ یقین ان کے وجود کا حصہ بن چکا ہے کہ اب افغانستان کبھی آباد نہیں ہوگا۔''

میں پیچھے مڑا تو میرے سامنے بہت بڑا شہر تھا، پشاور، جدید دنیا کا ایک جدید شہر اور اس سے پیچھے اور بھی بہت سے شہر تھے زندگی کی گہما گہمی سے لبریز، بھاگتے، دوڑتے، چیختے، چلاتے شہر اور پھر ان شہروں اور ان بستیوں سے ہوا کا ایک بگولا اٹھا اور آ کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا، میں نے دیکھا، اس بگولے میں گلتے سڑتے

گوشت کی تیز بو، بہت سے ٹوٹے خوابوں کی چبھن اور بے راہ روی کی بے انتہا حدت تھی، میں نے پوچھا:
''کہیں ایک اور افغانستان تو نقل مکانی کے لیے تیار نہیں کھڑا۔''

ہمراہی نے جواب دیا ''افغان گھر سے نکلے تو پاکستان ان کے لیے جائے اماں بن گیا، لیکن اگر پاکستانی گھروں سے نکل پڑے تو کہاں جائیں گے؟''

ہاں، میں نے سوچا، جن کے سامنے کوئی مدینہ ہو، انہیں اپنے مکہ سے ضرور ہجرت کرنی چاہیے، لیکن دنیا میں جن کے لیے ایک بھی انصار نہ ہو، انہیں نقل مکانی کی حماقت نہیں کرنی چاہیے کہ آسمان سے ٹوٹے تارے اور بنیاد سے اکھڑی قوموں کے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

معاف کیجیے گا

سویڈن کی مثال لیں، شہنشاہ کا محل سٹاک ہوم کے سنٹر میں ہے، شاہانہ طرز کے اس قدیم محل کے بالکل ساتھ بسوں کا اڈہ ہے، ہز میجسٹی نے شہر کی انتظامیہ کو لکھا ''میری سٹڈی میں دن بھر دھواں اور شور آتا رہتا ہے جس سے میرے مطالعے میں خلل پڑتا ہے، آپ مہربانی فرما کر یہ اڈہ کسی دوسری جگہ شفٹ کر دیں۔'' انتظامیہ نے طویل غور و خوض کے بعد جواب دیا۔ ''بادشاہ سلامت ہم آپ کا مسئلہ سمجھتے ہیں، ہمیں آپ سے ہمدردی بھی ہے لیکن اس تمام تر ہمدردی کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ آپ کا مسئلہ ایک فرد کی پرابلم ہے جس کے ازالے کے لیے ہم اگر اڈہ شفٹ کر دیں تو سینکڑوں افراد متاثر ہوں گے جو کسی بھی طرح قرین انصاف نہیں لہٰذا جناب بادشاہ سلامت آپ کو باقی زندگی اس دھوئیں اور شور کے ساتھ ہی گزارنا ہو گی۔ ہماری معذرت قبول فرمائیے۔''

جرمنی میں تو ایک اور ہی قسم کا ''ڈرامہ'' ہوا، ان کے ایک وزیر اپنی اہلیہ کو ایک شاپنگ سنٹر میں ڈراپ کرنے گئے، خاتون پلازے کے سامنے اتری، ہاتھ ہلا کر خاوند کو خدا حافظ کہا اور مڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی، وزیر موصوف نے گیئر بدلا لیکن اس سے قبل کہ آگے بڑھتے ان کی اہلیہ کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ سیڑھیوں سے نیچے لڑھک گئی، وزیر موصوف نے گاڑی وہیں چھوڑی اور بیوی کو سہارا دینے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے، اسے اٹھایا، چوٹیں دیکھیں، معمولی خراشیں تھیں، ذرا سا سہلانے سے بیگم صاحبہ کی طبیعت بحال ہو گئی، بیوی نے شکریہ ادا کیا اور دوبارہ ہاتھ ہلا کر شاپنگ سنٹر کے اندر چلی گئی، وزیر موصوف واپس مڑے تو دیکھا سامنے ٹریفک پولیس کا ایک سارجنٹ کھڑا ہے، وزیر نے اسے اپنی مجبوری بتائی تو سارجنٹ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''جناب قانون میں کہیں نہیں لکھا، اگر کسی کی بیوی گر پڑے تو اسے نو پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کرنے کا استحقاق حاصل ہو جاتا ہے لہٰذا جناب کا چالان تو ہو گا......'' اور وہ ہوا۔

لندن میں ایک ''پڑھاکو'' قسم کے بچے نے اچانک پڑھائی میں دلچسپی لینا چھوڑ دی، سکول کی انتظامیہ نے تحقیق کی تو پتہ چلا، بچے کا والد سہ پہر کو اسے کہانیاں سنایا کرتا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ اب یہ معمول جاری نہیں رکھ پا رہا جس کا بچے نے بڑا برا اثر لیا، انتظامیہ نے والد کو لکھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا لہٰذا مجبوراً انتظامیہ کو پولیس کی مدد لینا پڑی، پولیس نے ''جرم'' کی تفتیش کی تو معلوم ہوا، بچے کا والد 10۔ ڈاؤننگ

سٹریٹ میں وزیراعظم کے ذاتی سٹاف میں شامل ہے، دفتر میں اچانک کام بڑھ جانے سے وہ پچھلے چند ہفتوں سے وقت پر گھر نہیں جاسکا جس سے اس کی گھریلو زندگی ڈسٹرب ہوئی اس کا اثر اس کے بچے نے لیا اور وہ چڑچڑا ہوگیا، پولیس کے ایک ''معمولی'' سے افسر نے وارننگ دینے کے لیے وزیراعظم کو خط لکھا، وزیراعظم نے اگلے ہی روز بچے اور اس کے والد کو بلا کر معذرت کرلی۔

فرانس میں ایک وزیر اچھے ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھاتے تھے، ایک روز ان کی رہائش گاہ پر انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کا ایک اہلکار آیا، شناخت کرائی اور ان کے سامنے ایک فائل رکھ کر بولے ''سر میں نے حساب لگایا سال بھر میں آپ نے جتنے پیسوں کا کھانا کھایا وہ آپ کی تنخواہ سے کہیں زیادہ ہیں۔ آپ بتانا پسند کریں گے آپ نے یہ اضافی رقم کہاں سے حاصل کی اور کیا آپ اس رقم پر باقاعدہ ٹیکس جمع کراتے ہیں؟'' اب یہ تو بھلا ہو وزیر صاحب کے بزرگوں کا جو ان کے لیے کچھ پراپرٹی چھوڑ گئے تھے جس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے وہ ''لنچ'' جیسی عیاشی ''افورڈ'' کرلیتے تھے ورنہ ان کا وہ حشر ہوتا کہ خدا کی پناہ۔

اب آتے ہی دوبارہ سویڈن کی طرف، وہی شہنشاہ جنہوں نے شہر کی انتظامیہ کو خط لکھ کر اپنی خوب بے عزتی کرائی تھی، ایک روز وہ اپنے پوتے کو لانگ ڈرائیو پر لے گئے، راستے میں پوتے نے دادا کی گود میں بیٹھنے کی ضد کردی، اب دادا خواہ سویڈن کا ہو، ہوتا دادا ہی ہے لہٰذا بادشاہ سلامت کا دل پسیج گیا اور انہوں نے پوتے کو اچک کر گود میں بٹھالیا، بادشاہ سلامت کی یہ ناشائستہ حرکت ایک سارجنٹ دیکھ رہا تھا، اس نے گاڑی رکوائی، پوتے صاحب کو اٹھا کر پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور ادب سے سر جھکا کر بادشاہ کو مخاطب کیا، ''ہز ایکسی لینسی قانون توڑنا مجرموں کا کام ہوتا ہے بادشاہوں کا نہیں۔''

سویڈن کے شہنشاہ، برطانوی وزیراعظم اور فرانس اور جرمنی کے وزراء سے قطع نظر میں اپنے عظیم المرتبت صدر، بہت ہی قابل احترام وزیراعظم اور شریعت کے پابند ان 151 ارکان قومی اسمبلی سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں جن کی مساعی سے پاکستان کے عوام کو پندرھویں ترمیم کا تحفہ نصیب ہوا۔ ''جناب عالی ذرا یہ تو بتائیے کیا اس شریعت کے نفاذ کے بعد اب سویڈن کے بادشاہ کی طرح ہمارا صدر بھی ایک عام پاکستانی شہری کے سٹیٹس پر آجائے گا، ایک عام پولیس انسپکٹر وزیراعظم کو وارننگ دے سکے گا، وزراء کی گاڑیوں کے چالان ہوں گے اور ان سے ان کی آمدنی کے ذرائع پوچھے جاسکیں گے؟ قانون کی نظر میں ایک موچی اور لاڑکانہ اور دادو کے ہزاروں مربعوں کے مالک جاگیردار برابر ہوجائیں گے؟ اور کیا یہ شریعت غلام اور آقا کا باہمی فاصلہ، کمی اور چودھریوں کی تفریق، مزارعے اور سردار کی درمیانی خلیج مٹا دے گی؟ کیا یہ انسانوں کو ایک نظر، ایک سطح اور ایک زاویے سے دیکھے گی؟

جی ہاں اگر پندرھویں ترمیم کے بعد بھی ہوٹر بجتے رہیں، کھلی کچہریوں میں درخواستیں لے کر آنے والے مظلوموں پر اسی طرح ڈنڈے برسائے جاتے رہیں سیاستدانوں کے پروردہ غنڈے اسی طرح عورتوں کو

بازاروں میں گھسیٹتے رہیں اور وزیروں، مشیروں اور ارکان اسمبلی کے چاچے، مامے اور بچے پچنگوڑے اسی طرح اپنے ڈیروں پر ''انصاف'' کرتے رہے تو پھر معاف کیجیے گا۔ اس ''شریعت'' کا نتیجہ بھی وہی نکلے گا جو بھٹو کے روٹی، کپڑا اور مکان کا نکلا تھا یا پھر جنرل ضیا کی سائیکل سواری کا برآمد ہوا تھا۔

بارود کا لباس

میاں جاوید میرے بزرگ ہیں، پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کے چیئرمین ہیں، اخلاقی اور مالیاتی بحران کے اس دور میں بھی ان کا لہجہ تکبر اور آنکھ خواہش سے خالی ہے، آپ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھے رہیں وہ آپ کے اعصاب پر بوجھ نہیں بنیں گے، جب بھی آپ کی طرف دیکھیں گے آپ کو ان کی آنکھوں میں ماں جیسی مٹھاس ملے گی، جب بھی بولیں گے آپ کو ان کے لہجے میں صوفی جیسی حلیمی اور عالم جیسی عاجزی ملے گی...... سچی بات ہے میں صرف ان کی وجہ سے ان تمام لوگوں کا احترام کرتا ہوں جو اپنے نام کے ساتھ میاں لکھتے ہیں۔

ابھی میاں جاوید نے عرصہ پہلے ایک بس ڈرائیور کا ذکر کیا تھا جو برطانیہ میں بس چلاتا تھا، قصہ کچھ یوں ہے یہ بس ڈرائیور لندن کے مضافات میں بس چلا رہا تھا، سڑک کچھ ناہموار تھی لیکن وہ اپنی ترنگ میں آگے بڑھتا جا رہا تھا، اچانک ایک سیاہ رنگ کی کار اس کے قریب سے گزری اور تھوڑا سا آگے جا کر رکنے کا اشارہ کیا، ڈرائیور نے پریشان ہو کر بریک لگا دی، بس آہستہ آہستہ کھسکتی ہوئی کار کے قریب پہنچ کر رک گئی، وہ انگریز مسکراتا ہوا ڈرائیور کی کھڑکی کے نزدیک آیا اور نہایت ہی شائستہ لہجے میں معذرت کر کے بولا "بھائی میرے سڑک ناہموار ہے آپ ذرا آہستہ چلیں، سواریوں کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔" ڈرائیور نے مودب ہو کر جواب دیا۔ "سر میں نے حد رفتار کا اصول تو پامال نہیں کیا۔" انگریز دوبارہ مسکرایا، اس اصول پسندی پر ڈرائیور کی تعریف کی اور کہا "وقتی طور پر اس اصول کو بدل لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا جس سے عام لوگوں کو تکلیف پہنچ رہی ہو۔" دوبارہ معذرت کی، ہاتھ ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ایک مسافر نے ڈرائیور کو بتایا "یہ برطانیہ کے وزیراعظم ہیرلڈ ولسن تھے۔"

میں نے ایک جگہ پڑھا تھا بھارت کے وزیراعظم لعل بہادر شاستری چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے، چٹائی پر سوتے تھے اور ان کی اہلیہ خود اپنے ہاتھوں سے گھر کا کام کرتی تھی جبکہ مرار جی ڈیسائی سڑک پر گاڑی رکوا کر لوگوں کو کیلے کے چھلکے، پلاسٹک کے لفافے اور آئس کریم کے خالی پیکٹ کچرے کے ڈبے میں پھینکنے کی ہدایت کیا کرتے تھے، الطاف گوہر بتایا کرتے ہیں جب وہ اندرا گاندھی سے ملنے گئے تو وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی، میز پر ڈائننگ شیٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی، عام سستی قسم کی پلیٹوں میں عام سا کھانا تھا، جگ گلاس بہت

ہی غریبانہ اور سادہ سے تھے، وزیراعظم نے خود ان کے سامنے پلیٹ رکھی اور گلاس میں پانی ڈال کر دیا۔

میرے دوست ارشد ملک نے مجھے اردن کے شاہ حسین کا واقعہ سنایا، کسی نے شاہ سے شکایت کی جناب ٹریفک پولیس کا نظام بگڑا جا رہا ہے ان کی کھچائی ضروری ہو چکی ہے۔ شاہ نے اثبات میں گردن ہلا کر اصلاح احوال کی یقین دہانی فرما دی۔ اسی شام شاہ حسین عام گاڑی میں خود ڈرائیونگ کرتے ہوئے شہر میں نکلے، اشارہ توڑا اور گاڑی بھگا لے گئے، ان کی یہ حرکت ایک سارجنٹ دیکھ رہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، موٹر سائیکل بھگائی اور انہیں جا لیا، گاڑی رکوائی، لائسنس طلب کیا، چالان کیا، رسید ہاتھ میں پکڑائی اور سلام کر کے چلا گیا، شاہ حسین وہاں سے سیدھے کچہری گئے، چالان فیس بھری اور واپس آ گئے۔ شکایتی کو طلب کیا اور ہنس کر کہا۔ ”نہیں جناب آپ کا خیال درست نہیں ٹریفک پولیس کا نظام بالکل ٹھیک ہے، خدا کی پناہ جو سارجنٹ اپنے حکمران کا چالان کرتے نہیں چوکتا وہ عام آدمی کی غلطی کیسے معاف کرے گا؟“

مجھے کسی صاحب نے بتایا مصر کے جمال عبدالناصر آرمی کے معمولی سے کوارٹر میں رہتے تھے، ان کے بچے عام بس سے سکول جاتے تھے، ایک بار ایک کنڈیکٹر نے ان سے کرایہ نہ لیا، بچوں نے گھر آ کر شکایت کی تو جمال عبدالناصر نے اس بس کا سارا عملہ معطل کر دیا جس کے بعد کسی کنڈیکٹر کو کسی بڑے آدمی، کسی بااختیار شخص کے اہل خانہ کو رعایت دینے کی جرأت نہ ہوئی، یہاں تک کہ ایک بس ڈرائیور نے تو جمال عبدالناصر کے بچوں کے لیے ایک منٹ اضافی رکنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

دنیا حیران ہے وہ صدام حسین جس نے پوری عراقی قوم کو جنگ کے جہنم میں دھکیل دیا تھا، جس کے باعث آج 50 لاکھ عراقی بچے دواؤں کے لیے ترس رہے ہیں، پوری قوم ایک وقت کھانا کھا رہی ہے اور جہاں اب ٹوٹی عمارتوں، شکستہ سڑکوں، یتیم بچوں اور مظلوم بیواؤں کے سوا کچھ نہیں بچا، وہ صدام آج بھی عراق کا پاپولر لیڈر ہے، لوگ اب بھی اس پر جان چھڑکتے ہیں اب بھی ملک کے کسی کونے سے ”صدام مردہ باد، قومی حکومت لاؤ، صدام کو باہر نکالو“ کی صدا سنائی نہیں دیتی، کیوں، آخر کیوں؟ صدام میں ایسی کیا خوبی ہے جو دوسروں میں نہیں؟ بات صرف اتنی ہے کہ عراق کا بچہ بچہ جانتا ہے اگر وہ ایک روٹی کھا رہا ہے تو صدام کے دستر خوان پر بھی ایک ہی روٹی ہو گی، اگر اس کے درد کے لیے دوا نہیں تو صدام بھی درد کی گولی نہیں کھائے گا، دوسرا صدام حسین نے ہفتے کا پورا ایک دن عوام کے لیے وقف کر رکھا ہے، اس روز وہ سارا دن ٹیلی فون پر دستیاب ہوتا ہے، عراق کے کسی بھی گوشے سے کوئی عراقی شاہی محل کا نمبر ڈائل کرے صدام خود فون اٹھائے گا، اس کی شکایت سنے گا، جائز ہوئی تو دو گھنٹے میں اس کا ازالہ ہو جائے گا۔

میرا دعویٰ ہے جس روز وزیراعظم عام گاڑی پر بس ڈرائیوروں کو ہدایات دیتے نظر آئے، میاں نواز شریف چٹائی پر سوئے، کلثوم نواز شریف نے اپنے ہاتھوں سے گھر کا کام شروع کر دیا، بے نظیر لوگوں کو چھلکے کچرے کے ڈبوں میں پھینکنے کی ہدایت کرتی دکھائی دی، بلاول، بختاور اور آصفہ چھ نمبر ویگن پر سکول گئیں، شہباز

شریف کی گاڑی کا چالان ہوا اور انہوں نے اے سی کی عدالت میں قطار میں کھڑے ہو کر پیسے جمع کرائے اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے معراج دین نے پی سی او سے فون کیا اور وزیراعظم پاکستان نے خود اپنے کانوں سے اس کی شکایت سنی اسی روز پاکستان کی کسی گلی، کسی چوراہے، کسی چوک سے کتا اور ہائے ہائے کی آواز نہیں آئے گی، کسی قاضی حسین احمد کا جلسہ کامیاب نہیں ہوگا، کسی ولی خان، کسی مینگل کی ریلی میں لوگ جمع نہیں ہوں گے، کوئی اشارہ، کوئی بتی اور کوئی شیشہ نہیں ٹوٹے گا، کسی لیڈر، کسی وزیر کسی مشیر کو گالی نہیں دی جائے گی۔

اس نظام کو جو لیڈرز کو برہمن اور عوام کو شودر بنا دیتا ہے، ختم کر دیں ورنہ یہ نظام آپ کو مٹا دے گا کہ بارود کا لباس پہن کر آگ کے نزدیک کھڑے ہونے والے لوگ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتے۔

ذات کے خلا

اس کہانی میں سبق کا کوئی پہلو مضمر تھا اور نہ کوئی چونکا دینے والی بات، بس اس دکھی شام، سفر کے چھیل دینے والے احساس، ذہن سے گزرتی ہوئی جذباتی لہر اور اپنے اپنے دکھ سنانے کی جبلی خواہش نے اس میں معنی بھر دیئے، اسے آفاقی داستان بنا دیا، زندگی کے سب سے بڑے واقعے اور سردیوں کی چوٹوں کی طرح دیر تک محسوس ہونے والے درد کی شکل دے دی اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی اس کہانی کے قطرہ قطرہ ٹپکتے زہر میں ڈوبتے چلے گئے۔

دانشور نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کی دھند صاف کی اور پھر سرگوشی میں بولا ''یہ آج سے 30 برس پرانی بات ہے، ان دنوں میرا علی اڑھائی برس کا تھا، سرما کی ایک یخ ٹھنڈی رات کو جب میں تھکا ہارا گھر پہنچا تو میری بیوی، علی کو کندھے سے لگائے میرا انتظار کر رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی علی ماں کی گود سے اترا اور بھاگتا ہوا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں نے بیوی سے ماجرا پوچھا تو وہ خفگی سے بولی یہ پچھلے دو گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہا ہے، میں نے اسے لاکھ بہلاوے دیئے، آپ کی تھکاوٹ اور بے چین طبیعت کے قصے سنائے، گیدڑوں کی آوازوں سے ڈرایا لیکن اس کی ایک ہی ضد ہے ''میں تو ابو سے ملوں گا'' میں نے علی کو اٹھایا، پیار کیا اور اندر کمرے میں لے آیا۔ پلنگ پر لٹایا اور اوپر کمبل دے کر پوچھا۔ ''جی میری جان کیا بات ہے؟'' بچے نے مجھے گردن سے پکڑ کر نیچے جھکایا اور میرے ماتھے پر بوسہ دے کر بولا: ''ابو جان آپ میری بات مانیں گے'' میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور تیقن سے کہا: ''کیوں نہیں بیٹا، آپ کہو تو سہی'' علی نے گھبرائے گھبرائے انداز میں اپنی ماں کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف مڑ کر بولا: ''ابو مجھے ہاتھی خرید دیں، اصلی ہاتھی۔'' مجھے اس کی معصوم خواہش پر بڑا پیار آیا، میں نے اسے کھینچ کر سینے سے لگایا اور پھر پوچھا ''ابو کی جان یہ تو بتاؤ ہاتھی ملتے کہاں ہیں؟'' علی نے جوش سے ہاتھ فضا میں لہرایا اور پھر چہک کر بولا: ''بازار سے'' میں نے پھر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے کہا: ''بیٹے اس وقت تو ساری دکانیں بند ہو چکی ہیں، کل آپ میرے ساتھ چلئے گا، ہاتھی خرید لیں گے۔'' علی نے یہ سنتے ہی میرا ہاتھ جھٹکا اور غصے سے چلا کر بولا: ''اس وقت بھی مل سکتا ہے آپ تلاش تو کریں۔'' میں نے چند لمحے سوچا اور پھر نتیجے پر پہنچ کر اس کے گالوں پر بوسہ دیا

اور کہا: ''اوکے، بیٹا چلو تیار ہو جاؤ، ابھی ہاتھی خرید لاتے ہیں۔'' میرا یہ فقرہ سن کر وہ اپنی ماں کی طرف دیکھ کر چلایا ''دیکھا میں نہ کہتا تھا، ابو میرے ساتھ ضرور جائیں گے۔''

دانشور نے دھندلا چشمہ اتار کر گود میں رکھا اور پھر غمناک لہجے میں بولا ''دسمبر کی وہ رات بڑی ہی سرد تھی جب میں اور میرا بیٹا رات کے دو بجے ہاتھی خریدنے کے لیے گھر سے نکلے، شہر میں سناٹے، یخ ٹھنڈی ہوا اور گیدڑوں کی نوکیلی آوازوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہم کانوں پر مفلر لپیٹے، ہاتھ بغلوں میں دیئے ٹھٹھرتے ہوئے بازار میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے، بازار کے آخر میں ایک نانبائی کی دکان تھی جس میں سردی کے مارے تین شخص سرد ہوتے تنور کے گرد بیٹھے صبح کا انتظار کر رہے تھے، میں نے علی سے کہا: ''بیٹا ذرا ان سے پوچھو تو سہی ہاتھی کہاں سے ملے گا؟'' علی نے گردن ہلائی اور دوڑتا ہوا تھڑے پر چڑھ گیا، آگ تاپنے والے تینوں اشخاص نے حیرت سے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، علی نے سلام کیا اور آنے کی وجہ بیان کر دی، تینوں نے قہقہہ لگایا اور بچے کو پچکار کر بولے: ''بیٹا ہاتھی تو کھلونوں کی دکان سے ملتا ہے۔'' علی کو ان کا یہ مذاق بالکل نہ بھایا، وہ برا سا منہ بنا کر بولا: ''میں نقلی نہیں اصلی ہاتھی کی بات کر رہا ہوں۔'' آگ تاپنے والوں نے پھر قہقہہ لگایا اور اسے قریب بلا کر بولے: ''بیٹے ہاتھی تو چڑیا گھر میں ہوتا ہے جہاں اسے دیکھا جا سکتا ہے، اس پر سواری کی جا سکتی ہے، پر اسے ساتھ نہیں لایا جا سکتا۔'' علی کو ان کی یہ بات بھی پسند نہ آئی، تھڑے سے نیچے اترا اور میری انگلی پکڑ کر بولا: ''ابو ان لوگوں کو کچھ پتا نہیں، چلیں کسی دوسری دکان سے پوچھتے ہیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے ساتھ لے کر آگے چل پڑا۔

شہر میں کوئی دکان نہیں کھلی تھی، گلیوں میں کوئی ذی روح نہیں تھا، بس ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے دانتوں پر دانت جمائے چلتے جا رہے تھے، چلتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ریلوے سٹیشن آ گیا، ہم پلیٹ فارم پر آ گئے، جہاں زندگی کے کچھ کچھ آثار تھے، ہم سب سے پہلے چائے کے کھوکھے پر گئے اور ہاتھی کا پتا پوچھا، جواب میں چائے والے نے قہقہہ لگا کر ہمیں آگے بھیج دیا، ہم پان سگریٹ کی ریڑھی پر گئے اور ہاتھی طلب کیا اس نے بھی قہقہہ لگایا اور ہاتھ سے ٹکٹ گھر کی طرف اشارہ کر دیا، ہم بکنگ کلرک کے پاس گئے اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو میرے بیٹے نے ہاتھی کا مطالبہ کر دیا، یہاں بھی نتیجہ نانبائی کی دکان سے مختلف نہ نکلا۔ یہاں پہنچ کر علی زچ ہو گیا، اس نے منہ بسورتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچ کر ریلوے سٹیشن سے باہر لے آیا، ہم عین چوراہے میں کھڑے ہو گئے، میں نے شفقت سے اس کے سرد ہوتے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر ہوا میں بوسہ دے کر پوچھا ''بیٹا اب بتاؤ کہاں جائیں؟'' علی نے اوپر میری طرف دیکھا اور پھر روہانسا ہو کر بولا: ''ابو میرا خیال ہے ہاتھی دکانوں پر نہیں ملتے۔'' میں نے نیچے جھک کر اس کا مفلر درست کیا اور پھر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا: ''ہاں یار میرا بھی ایسا ہی خیال ہے اگر تم کہو تو کل جا کر چڑیا گھر والوں سے پوچھ لیتے ہیں اگر کہیں سے ہاتھی ملتا ہوگا تو جا کر خرید لیں گے کیوں؟'' ''ہاں یہ ٹھیک ہے۔''

علی نے پر جوش لہجے میں کہا اور ہم دونوں واپس گھر کی طرف چل پڑے۔

میری بیوی اور میرے والد گھر کے باہر ہمارا انتظار کر رہے تھے، علی نے میرا ہاتھ چھڑایا اور بھاگ کر میرے والد کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میرے والد نیچے جھکے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے: ''کیوں پھر ہو آئے بازار سے؟'' علی نے سر اوپر اُٹھایا اور چلا کر بولا: ''دادا ابو، دادا ابو، ہاتھی دکانوں پر نہیں ملتے، اگر ملتے ہوتے تو میرے ابو مجھے ضرور خرید کر دیتے۔'' ننھے علی کے یہ الفاظ میرے والد پر بم کی طرح گرے، ان کے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں اپنے آنسو چھپاتا ہوا اندر چلا گیا۔'' دانشور نے رک کر آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔

دانشور نے دبیز شیشوں والا چشمہ گود سے اُٹھایا اور اسے اپنی ناک پر جما کر بولا: ''اس لیے کہ بچپن میں جب ایک بار میں نے ہاتھی خریدنے کی ضد کی تھی تو میرے والد نے تھپڑ مار مار کر میرے گال سرخ کر دیئے تھے۔''

ہم تینوں خاموش تھے، ہم تینوں اپنے اپنے بچپن کے ہاتھی تلاش کر رہے تھے، ہم تینوں اپنے اپنے گال سہلا رہے تھے، ہم تینوں اپنے اپنے بچوں کو یاد کر رہے تھے۔

اس بار بھی دانشور ہی نے پہل کی اور ہمیں اپنی طرف متوجہ کر کے بولا: ''بچپن کی محرومیاں، بچپن کی زیادتیاں، بچپن کی ماریں اور بچپن کے کھوتے ہماری ذات میں خلا بن جاتے ہیں، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم کبھی اس خلا کو کتابوں سے بھرنے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی عورتوں سے، کبھی راگوں سے، کبھی تصویروں اور کبھی شعروں سے، کبھی دولت، شہرت اور تعلقات عامہ سے، لیکن یہ خلا کبھی نہیں بھرتے۔ تم، میں اور اس نے، دانشور نے رک کر تیسرے ساتھی کی طرف اشارہ کیا، بچپن میں اپنے والد کی انگلی پکڑ کر ہاتھی تلاش کیا ہوتا تو آج ہماری ذات میں کوئی خلا نہ ہوتا۔ آج ہمارے آنسو ہمارے حلق میں نہ گر رہے ہوتے، ہم دنیا فتح کرنے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے یوں نہ نکلے ہوتے، ہم بھی نارمل زندگی گزار رہے ہوتے۔''

ہم تینوں نے اپنے اپنے چشمے اُتارے اور ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں مسل کر بولے: ''یار لوگوں کو کبھی ڈرائیونگ کا شعور نہیں آ سکتا، لائٹیں سیدھی آنکھوں میں مارتے ہیں، میری تو آنکھیں بھی خراب رہتی ہیں، خواہ مخواہ ہی پانی آ جاتا ہے۔''

(نوٹ: اس کالم کے دانشور مشہور شاعر جناب افتخار عارف ہیں جبکہ ہمارے ساتھ تیسرے صاحب جناب خلیل ملک تھے۔)

کاغذ کی حکومت

کہر میں لپٹی راول جھیل سے یخ ہوا کا جھونکا اٹھا اور میرے چہرے پر سوئیوں کی طرح اتر گیا۔ میں نے ٹروزر کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر جیکٹ کے کالر سیدھے کیے اور انہیں کانوں پر لپیٹ کر زپ چڑھا دی۔ دور جھیل میں کہر زدہ دودھیا پانی سے کپکپاتا ہوا زرد سورج آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ میں نے سورج پر نظریں گاڑھ کر سینہ ذرا سا ڈھیلا چھوڑا اور میری سانس کی نالی میں برف اتر گئی۔ میں نے فوراً یخ ہاتھ ناک پر رکھ لیا، جس کے ساتھ ہی ایک خیال اڑتا ہوا آیا اور میرے دماغ کو ہلا کر گزر گیا۔ میں نے سوچا دنیا کب ختم ہوگی؟ اس روز جب ساری زمین برف میں دفن ہو جائے گی یا اس روز جب زمین اور آسمان سے آگ برسے گی یا جب کاغذ انسان کی جگہ لے لے گا۔ میں رکا، ناک سے ہاتھ ہٹایا اور برف ہوتی انگلیوں پر پھونک مار کر سوچا، اگر یہ پیش گوئی سچ ہے تو پھر قیامت آ چکی ہے، دنیا دفن ہو چکی ہے کیونکہ کاغذ انسان کی جگہ لے چکے ہیں۔

ہم کیا ہیں؟ میونسپلٹی کے کاغذوں پر لکھے چند حروف۔ دفتروں، سکولوں، کالجوں، کارخانوں اور بینکوں کے رجسٹروں پر چڑھے چند نام۔ ایک شخص سولہ برس تک ٹھنڈے کلاس روموں میں سلیبس کی ٹھنڈی ٹھار کتابوں پر سر پٹختا ہے اور آخر میں اسے کیا ملتا ہے، کاغذ کا ایک ٹکڑا۔ وہ نہ ملے تو ایم اے پاس شخص ان پڑھ ہے۔ ایک شخص ساٹھ برس تک زندگی کی چکی گھماتا ہے، کمر جھک جاتی ہے، بینائی مدھم پڑ جاتی ہے، بال سفید ہو کر جھڑ جاتے ہیں، سانس پھیپھڑوں سے الجھتی رہتی ہے اور جسم بیماریوں کی امانت بن جاتا ہے تو اسے کیا ملتا ہے، کاغذ کے چند بنڈل، وہ جل جائیں، بہہ جائیں یا گم ہو جائیں تو زندگی کا سارا سفر اکارت گیا، ایک شخص اونچے عہدے پر بیٹھا ہے، لوگ اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں، جھک کر سلام کرتے ہیں، اس کی ناگوار سے ناگوار بات پر بتیسی نکال کر اسے داد دیتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ اس کے پاس کاغذ پر چند حروف لکھنے کا اختیار ہے۔ ایک شخص دوسرے شخص کو جان سے مار دیتا ہے کیوں؟ کیونکہ اسے کاغذ کے چند پیکٹ مل جاتے ہیں۔

میرا برتھ سرٹیفکیٹ ہے، تو میں پیدا ہو چکا ہوں۔ میرا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری ہو گیا تو میں مر چکا ہوں۔ میرے پاس اُردو میں چھپا شناختی کارڈ ہے تو میں پاکستانی ہوں، چمکتے کاغذ پر انگریزی میں چند حرف لکھے ہیں تو امریکی ہوں، پاسپورٹ کے چند ورق پر مزید چند کاغذ چپکے ہیں تو پوری دنیا میرا گھر ہے، میرے

پاس کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے تو میں صحت مند ہوں، میرے سرہانے پڑی فائل میں چند کاغذ لگے ہیں تو میں موت کا مریض ہوں۔ ایک شخص نے کاغذ جاری کر دیا تو میں مجرم ہوں، دوسرے نے دوسرا کر دیا تو میں بے گناہ معصوم شہری ہوں۔ میرا میری بیوی کے ساتھ ایک کاغذ کا رشتہ ہے، وہ ہے تو ہم میاں بیوی ہیں، نہیں ہے تو ہم گنہگار ہیں۔ میرے پاس کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے تو میں ڈاکٹر ہوں، انجینئر ہوں، وکیل ہوں، استاد ہوں، جج ہوں، ایک بااختیار افسر ہوں۔ میرے پاس کاغذی نوٹوں کے انبار ہیں تو میں زندگی کی ہر نعمت سے لطف اُٹھا سکتا ہوں، سارے دروازے میرے لیے کھلے ہیں۔ نہیں ہیں تو میں ایسے قید خانے میں بند ہوں، جہاں میں پانی کا ایک گلاس نہیں پی سکتا۔ مجھے ایک روٹی نہیں مل سکتی میں سر درد کی ایک گولی نہیں لے سکتا، ہاں، میں بغیر کاغذ دیے کوئی چیز اٹھا کر کھا لیتا ہوں، تو میں چور ہوں، سڑک پر کھڑے مفلوک الحال لوگوں میں کاغذ بانٹنے لگتا ہوں تو سخی ہوں، ان داتا ہوں، نہیں کرتا تو کنجوس ہوں۔ میں مسجدوں، مندروں، گرجا گھروں اور گردواروں کے متولیوں کو کاغذ پیش کرتا ہوں تو خدا کا مقرب بندہ ہوں، نہیں کرتا تو بخیل ہوں، معاشرے اور مذہب کا مجرم ہوں۔

چند جلد شدہ کاغذ ہیں تو ارسطو، سقراط، بقراط، افلاطون، کنفیوشس، بودھ، ہومر، چاسر، کالی داس، شیکسپئر، گوئٹے، دانتے، ابن عربی، سینا، فردوسی، رومی، سعدی، حافظ، وارث شاہ، کانٹ، والٹیئر، روسو، سارتر، نطشے، ہیگل، مارکس، فرائیڈ، ٹوائن، برنٹے، فسکی، ڈکنز، کامیو، غالب، اقبال اور فیض ہیں۔ چند کتابیں ہیں تو ہندو میرا دشمن ہے، یہودی اور مسلمان الگ الگ ہیں، شیعہ سنی جانی دشمن ہیں، روسی اور امریکی ایک میز پر نہیں بیٹھ سکتے۔ کاغذ ہیں تو میری ایک پوری تاریخ ہے، میرے آباؤ اجداد ہیں، میری تہذیب، میرا تمدن ہے، نہیں ہیں تو یہ طے نہیں ہو سکتا کہ میرا نسب بندر سے شروع ہوا یا آدم سے، میں امیبا سے انسان بنا تھا یا کسی دوسرے سیارے سے یہاں آ پہنچا۔ کاغذ پر چند سو لفظ نہیں چھپے تو میرا کوئی مستقبل نہیں، میری کوئی منزل، میرا کوئی کل نہیں۔ کاغذ کے اس ٹکڑے (اخبار) کے اس کونے میں میرا نام (زیرو پوائنٹ) چھپا ہے تو میں ہوں، نہیں چھپا تو میں کوئی نہیں۔

ہاں، اور وہ بھی تو ہزاروں لاکھوں لوگ تھے، اہل تمکین، اہل علم و دانش، اہل ہنر، جنہیں کاغذ کی شناخت نہ ملی تو وہ خاموشی سے چلے گئے اور وہ بھی تو ہیں جو زندگی میں بے یار و مددگار رہے، اپنے ہی کرتوں پر پیوند جوڑتے رہے، اپنی ہی بھوک سے لڑتے رہے، لیکن جب مرے تو انہیں کاغذ کا کفن مل گیا۔ لہٰذا آج وہ لائبریریوں میں زندہ ہیں۔

یہ کلنٹن کیا ہے؟ بیلٹ بکس سے نکلے چند کروڑ کاغذوں سے بنا شخص، اگر (ووٹ) نہ ملتے تو کچھ نہ ہوتا اور وہ کیا کر سکتا ہے۔ ایک کاغذ جاری کر کے ایران، لیبیا اور عراق کو دنیا سے غائب کر سکتا ہے، ایک کاغذ جاری کر کے صومالیہ، روانڈا، افغانستان اور البانیہ کو بھوک سے بچا سکتا ہے، ایک کاغذ جاری کر کے مشرق بعید کو مغرب بعید کے قریب لا سکتا ہے، ایک کاغذ جاری کر کے تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کا مقدر بدل سکتا ہے، ایک

کاغذ جاری کر کے دنیا کے سارے سلگتے مسائل کی آگ بجھا سکتا ہے۔

ہاں، کاغذ ہی تو مقدر ہے جس کے لالچ میں ہر روز اربوں لوگ اپنا پسینہ بہاتے ہیں، کروڑوں لوگ لاٹریاں خریدتے ہیں، لاکھوں افراد دوسروں کا گلا کاٹتے ہیں، ہزاروں لوگ ہزاروں لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں، لاکھوں لوگ کروڑوں لوگوں کو لوٹتے ہیں، ہاں کاغذ ہی تو مقدر ہے جس کے بدلے لوگ زندگی خریدتے ہیں، لوگ زندگی بیچتے ہیں۔

ہاں، کاغذ ہی تو مقدر ہے جو امید بن کر طالب علم کی آنکھوں میں چمکتا ہے، سانس بن کر قیدی کے سینے میں چلتا ہے، آس بن کر مریض کی رگوں میں دوڑتا ہے، خواہش بن کر دکاندار کے حلق سے نکلتا ہے اور فرعون بن کر سیاستدان کی آواز میں بولتا ہے۔

ہاں، میں نے برف ہوتی گردن پر ہاتھ رگڑتے ہوئے سوچا، قیامت ہو چکی ہے، دنیا فنا ہو چکی ہے، کاغذ انسان کی جگہ لے چکے ہیں۔

این کاؤنٹر تو

''این کاؤنٹر'' (اسے پیرس ریویو بھی کہتے تھے) دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد دنیا میں کمیونزم کا سب سے بڑا نقیب بن کر طلوع ہوا، آفسٹ پیپر پر جدید ترین پرنٹنگ سسٹم کے تحت شائع ہونے والا یہ رسالہ پیرس کی بندرگاہوں، ایئرپورٹس اور ریلوے سٹیشنوں سے نکلتا اور پھر چند ہی روز میں دنیا بھر کے ٹی ہاؤسز، کافی شاپ اور شراب خانوں میں پہنچ جاتا، جہاں نہ صرف ایک ایک سطر کو الہام سمجھ کر پڑھا جاتا، بلکہ ایمان کا درجہ دے کر اس پر عملدرآمد بھی شروع کر دیا جاتا۔ ہم اگر مارکسی نظریات، مارکسزم کے پیروکاروں کے حلیوں اور ان کے متشدد نظریات کی تاریخ کھود کر نکالیں تو ہمیں ''این کاؤنٹر'' ہی ملے گا، جس نے پوری دنیا میں بھوک کو مضبوط ترین فلسفہ بنا دیا، یہ این کاؤنٹر ہی تھا جس سے متاثر ہو کر لوگوں نے بال بڑھا لیے، غسل کرنے کی عادت ترک کر دی، مارکسی لٹریچر کو مقدس سمجھ کر اس کا ایک ایک لفظ رٹ لیا، بیویوں کو طلاقیں دے دیں اور بچوں کو ''ان امیروں کو لوٹ لو'' کا درس دینا شروع کر دیا۔

رسالے کے پیچھے کروڑوں روبل تھے، دنیا کے ذہین ترین مارکسی دماغ تھے، ماہر صحافی تھے، انتہائی زیرک نقاد اور دانشور تھے، لہٰذا اس دور میں اس سے بڑھ کر معیاری، جامع اور پر اثر جریدہ دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ معیار کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ سپنڈر، آڈن اور مارلو جیسے دانشور اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ ایک بین الاقوامی مجلس ادارت تھی، جو دنیا بھر سے موصول ہونے والے مضامین، تجزیوں اور تبصروں کا کڑی نظر سے جائزہ لیتی، انہیں مارکسی کسوٹی پر پرکھتی، زبان و بیان کی غلطیوں کی نشاندہی کرتی، اعداد و شمار اور حقائق کی صحت کا اندازہ لگاتی، تسلی کے بعد یہ مضامین مختلف ڈیسکوں پر چلے جاتے، جہاں اپنے وقت کے ماہرین ان کا ترجمہ کرتے، ان کی نوک پلک سنوارتے، اس کے بعد ایک اور شعبہ اس ترجمے کا جائزہ لیتا، اس میں پائی جانے والی جھول، سقم اور لفظی کوتاہیاں درست کرتا، آخر میں جب اشاعت کا مرحلہ آتا تو انتظامیہ انگریزی ٹیکسٹ کے ساتھ ساتھ اصل متن (جو مختلف زبانوں میں ہوتا) بھی چھاپ دیتی، تا کہ اگر ترجمے میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو قارئین اصل مضمون دیکھ کر اسے درست کر لیں، اس کڑے معیار، انتخاب اور عرق ریزی کے باعث ناقدین ''این کاؤنٹر'' کو کمیونزم کی ترویج میں وہ مقام دیتے تھے جو شاید کارل مارکس اور

لینن کو بھی نصیب نہیں ہوا۔
لیکن قارئین کرام المیہ دیکھیے ''این کاؤنٹر'' کی اشاعت کے دس پندرہ برس بعد انکشاف ہوا، جسے دنیا کمیونزم کی بائبل سمجھ رہی تھی، وہ دراصل سی آئی اے کا منصوبہ تھا اور اس کے ذریعے امریکی خفیہ ادارے کے ہیڈ کوارٹر کے ایک چھوٹے سے کمرے سے ڈپٹی سیکرٹری رینک کا ایک امریکی، دو کلرک اور ایک چپڑاسی چند فائلوں، ٹیلکس کے چند پیغامات اور کچھ خفیہ ٹیلیفون کالز کے ذریعے برسوں تک پوری اشتراکی دنیا کو بیوقوف بناتے رہے، ان کے نظریات میں زہر گھولتے رہے، یہاں تک کہ کمیونزم کے ٹارگٹ ممالک میں مقامی سطح پر کمیونزم کے خلاف مزاحمت شروع ہوگئی۔
عرصے بعد جب این کاؤنٹر پراجیکٹ کا چیف ثقافتی یلغار کے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے پیرس گیا تو شرکاء نے اُٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ بوڑھے ریٹائرڈ امریکی نے ہیٹ اتار کر سب کا شکریہ ادا کیا اور پھر جھک کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پوچھنے والوں نے پوچھا ''سر آپ نے یہ سب کچھ کیسے کیا؟'' بوڑھا امریکی مسکرایا اور پھر مائیک کو انگلی سے چھو کر بولا ''ینگ مین ویری سمپل، ہم نے کمیونزم کو اتنا کڑا، سخت اور غیر لچک دار بنا دیا کہ وہ لوگوں کے لیے قابل قبول نہ رہا۔'' ایک اور نوجوان اُٹھا اور بوڑھے سے مخاطب ہو کر بولا ''لیکن جریدے کے سارے منتظمین تو کمیونسٹ تھے اور جہاں تک ہماری معلومات ہیں سی آئی اے کا ان سے کوئی براہ راست رابطہ بھی نہیں تھا۔'' بوڑھے نے قہقہہ لگایا اور پھر دوبارہ مائیک کو چھو کر بولا ''نوجوان ہاں، ہمارا این کاؤنٹر کی انتظامیہ، اس کے ایڈیٹوریل بورڈ اور اس کے کمیونسٹ ورکرز سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن دنیا کے مختلف کونوں سے این کاؤنٹر تک پہنچنے والے مضامین تو ہم لوگ ہی لکھواتے تھے۔'' ایک اور نوجوان کھڑا ہوا اور بوڑھے کو ٹوک کر بولا ''لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟'' بوڑھا آہستہ سے مسکرایا اور پھر مائیک کو چٹکی میں پکڑ کر بولا: ''بہت کچھ ہوتا ہے، ینگ مین، تم خود فیصلہ کرو جو بائبل ایسے احکامات دے جو انسانی فطرت سے متصادم ہوں، جو انسان کو آزادی سے سوچنے، بولنے اور عمل کرنے سے روکتے ہوں، جو لوگوں کو بد بودار کپڑے پہننے، شیو نہ کرنے، دانت گندے رکھنے اور گالی دینے کا درس دیتی ہو، وہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہوگی؟ ہم نے یہی کیا، این کاؤنٹر کے پلیٹ فارم سے اشتراکی نظریات کے حامل لوگوں کو بے لچک، متشدد اور سخت موقف کے حامل افراد ثابت کر دیا جس کے بعد تیسری دنیا میں ان لوگوں کے خلاف مزاحمتی تحریکیں شروع ہوئیں اور ہمارا کام آسان ہوگیا۔'' یہاں پہنچ کر پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ بوڑھا نشست سے اُٹھا، دوبارہ ہیٹ اُتار کر ہوا میں لہرایا، سینے پر ہاتھ رکھا اور سٹیج کے اداکاروں کی طرح حاضرین کا شکریہ ادا کر کے واپس چلا گیا۔
......اور میں جب بھی محفلوں میں ''پڑھے لکھے'' خواتین و حضرات کے منہ سے علماء کرام کے خلاف ''فتوے'' سنتا ہوں، نوجوانوں کو اسلام کو (نعوذ باللہ) قدیم فرسودہ اور نا قابل عمل قرار دیتے دیکھتا ہوں، شائستہ خاموش طبع اور ذکر اللہ سے جھکے لوگوں کو ''مولوی'' کے نام سے مخاطب ہوتے دیکھتا ہوں۔ جب بھی مساجد کے

سامنے کلاشنکوف بردار گارڈ دیکھتا ہوں، مختلف مذہبی رہنماؤں کو کیل کانٹے سے لیس باڈی گارڈز کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ اخبارات، رسائل اور جرائد کی پھیلائی ڈس انفارمیشن پر مدرسوں کے معصوم بچوں کو سڑکوں پر توڑ پھوڑ کرتے دیکھتا ہوں، تو میں سوچتا ہوں کہیں سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے کسی کمرے میں بیٹھا کوئی ڈپٹی سیکرٹری، دو کلرک اور ایک چپڑاسی چند فائلوں، ٹیلکس کے چند پیغامات اور ٹیلی فون کی کچھ کالز کی مدد سے اسلام کو اسلامی دنیا میں اجنبی نہ بنا رہے ہوں، اسے فرسودہ، نا قابل عمل اور انسانی فطرت کے خلاف نظام ثابت نہ کر رہے ہوں؟

قارئین کرام! اگر آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں تو آپ مجھ سے پورا اتفاق کریں گے کہ اسلام کے خلاف جتنی نفرت اسلام کے ذریعے پھیلائی گئی، مولوی کو جتنا مولوی کے ذریعے نا قابل برداشت بنایا گیا، مدرسے کو مدرسے کے ذریعے جتنا قابل نفرین ثابت کیا گیا اور مسجد کو مسجد کے ذریعے جتنا بدنام (نعوذ باللہ) کیا گیا، اتنا پچھلے دو تین سو برسوں میں یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے بیانات، خطبات اور تحریروں نے نہیں کیا۔

یقین کیجیے، جب کوئی نوجوان بڑی نفرت سے کہتا ہے یہ "مولوی" تو فوراً میرے دماغ میں ایک بوڑھے امریکی کی تصویر ابھر آتی ہے، جو مائیک کو چٹکی میں پکڑ کر کہتا ہے: "ویری سمپل، ہم نے اسلام کو اتنا کڑا، سخت اور غیر لچک دار بنا دیا کہ وہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہی نہ رہا۔" اور بوڑھا کہتا ہے: "ہم نے دنیا پر ثابت کر دیا، جس مذہب میں ایک مولوی دوسرے مولوی کے پاس بیٹھنے کا روادار نہیں، وہ مذہب جدید دنیا کے انسانوں کے لیے کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ ہاں ہم نے ثابت کر دیا جو لوگ معمولی سا اختلاف برداشت نہیں کر سکتے، اپنی مسجد میں کسی دوسرے مسلمان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے، وہ جمہوری روایات کی پاسداری کیسے کر سکتے ہیں، ہاں ہم نے ثابت کر دیا، مسلمان پتھر کے زمانے کے لوگ ہیں جو ہر سوال کا جواب پتھر سے دیتے ہیں۔"

رات کے آخری پہر جب گلی کی ساری بتیاں کہر کی چادر اوڑھے سو چکی ہیں، میں سوچ رہا ہوں عالم اسلام میں کوئی ایک بھی ایسا شخص نہیں جو "این کاؤنٹر پراجیکٹ ٹو" کی فائل پڑھ سکے۔

ایک روٹی کا سوال ہے بابا......

1974ء کے آغاز میں امریکہ نے ایک خصوصی کمیٹی بنائی جس کا کام 2000ء تک درپیش خطرات کی نشاندہی کرنا تھا۔ اس کمیٹی نے پے در پے اجلاسوں کے بعد اپریل 74ء میں اپنی سفارشات مرتب کیں، ان سفارشات کو کمیٹی کے سربراہ اور بین الاقوامی شہرت یافتہ یہودی سفارتکار ہنری کسنجر نے "ایس 200 رپورٹ" کا نام دے کر مئی کے پہلے ہفتے صدر نکسن کو پیش کر دیا۔ اس خفیہ رپورٹ میں پاکستان، مصر، بنگلہ دیش، ترکی، نائیجیریا اور انڈونیشیا میں بڑھتی ہوئی آبادی کو اگلے 25 برسوں میں امریکہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا گیا۔ ماہرین نے خیال ظاہر کیا مسلم دنیا میں آبادی بڑھنے سے ان ممالک کی سیاسی، معاشی اور عسکری قوت میں اضافہ ہوگا۔ ان ممالک سے نکلنے والا وہ خام مال جس سے یورپ اور امریکہ کے کارخانوں کی چمنیاں گرم ہوتی ہیں، آنا بند ہو جائے گا۔ لوگوں میں قدرتی وسائل کو اپنے قبضے میں رکھنے کا شعور بیدار ہوگا اور اس مراعات یافتہ طبقے کے خلاف موجود عوامی نفرت باقاعدہ تحریکوں کی شکل اختیار کر لے گی جو تیسری دنیا میں امریکی مفادات کی نگہبانی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ خوش قسمتی سے اس رپورٹ پر پالیسی بننے سے قبل ہی نکسن "واٹر گیٹ سیکنڈل" میں پھنس گیا جس کے نتیجے میں اسے اگست 74ء میں مستعفی ہونا پڑا۔ یوں "ایس 200 رپورٹ" کی یہ فائل داخل دفتر ہوگئی۔

16 اکتوبر 1975ء کو ہنری کسنجر نے اس وقت کے صدر فورڈ کو ایک خط لکھا جس پر "ارجنٹ اینڈ ویری کانفیڈینشل" کی مہر ثبت تھی۔ اس خط میں یہودی سفارتکار نے "ایس 200 رپورٹ" کا حوالہ دے کر صدر سے درخواست کی کہ:

"کیونکہ معاملہ بہت حساس اور فوری نوعیت کا ہے لہٰذا جتنی جلدی ہو سکے، اس کی منظوری دے دی جائے۔"

اس خط کے ٹھیک چالیس روز بعد 26 نومبر 75ء کو سکوکرافٹ کے دستخطوں سے وائٹ ہاؤس سے ایک آرڈر جاری ہوا جس کا نمبر 314 تھا۔ اس آرڈر کی کاپیاں فوری طور پر وزارت دفاع، خزانہ، خارجہ، چیف آف سٹاف اور سی آئی کے ڈائریکٹر جارج بش کو بھیج دی گئیں۔

اور پھر اس آرڈر کے ذریعے ان چھ مسلم ممالک میں، جہاں سے امریکہ کو مستقبل بعید میں "بغاوت" کے خدشات سر اٹھاتے نظر آ رہے تھے، نس بندی کے فوری اقدامات کا حکم دے دیا گیا کیونکہ (آرڈر کی تحریر کے مطابق) ان چھ ممالک کے مزاج میں بڑی مماثلت ہے۔

متشددانہ مذہبی فکر غالب ہے۔

عوام یورپی اقوام سے نفرت کرتے ہیں۔

نفاذ اسلام لوگوں کی پہلی اور آخری خواہش ہے لہٰذا اگر ابھی سے ان ممالک کی آبادی پر قابو نہ پایا گیا تو اس سیلاب کو واشنگٹن تک پہنچتے دیر نہیں لگے گی۔ آرڈر میں بطور مثال مصر کو پیش کیا گیا جس کی آبادی 2000ء تک 85 ملین ہونے کا امکان ہے جبکہ اس کے قدرتی وسائل اور مادی ذرائع اس دباؤ کے متحمل نظر نہیں آتے، چنانچہ یہ آبادی سرحدیں توڑ کر اسرائیل میں داخل ہو جائے گی جس کی آبادی اس وقت تک کسی بھی طرح 33 ملین سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اسرائیل کا مسئلہ اس لیے بھی زیادہ گھمبیر ہے کہ غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے جیسے علاقوں میں یہودیوں کے مقابلے میں عربوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا اگر مصری مسلمانوں کی "نس بندی" نہ کی گئی تو آئندہ اڑھائی دہائیوں میں یہودی اسرائیل میں اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔

اس آرڈر میں ان ممالک کی آبادی کنٹرول کرنے کے لیے 9 طریقے تجویز کیے گئے۔

(۱) مسلم ممالک میں فیملی پلاننگ کے لیے بھرپور مہم چلائی جائے اور اگر مذہبی عناصر، مختلف طبقات اور تنظیمیں اس کے خلاف تحریک چلانے کی کوشش کریں تو انہیں "کرش" کر دیا جائے۔

(۲) سائنسی ہتھکنڈوں کے ذریعے غیر محسوس طریقے سے فیملی پلاننگ کے خلاف کام کرنے والے مذہبی عناصر کو معاشرے سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ انہیں لوگوں میں مذاق، تحقیر اور نفرت کی علامت بنا دیا جائے تاکہ کوئی شخص ان کی بات تک سننے کا روادار نہ ہو۔

(۳) آئی ایم ایف کے ذریعے ان ممالک کو شدید ترین اقتصادی دباؤ میں لایا جائے۔

(۴) ترقی یافتہ ممالک کے رہنما ان ممالک کی لیڈر شپ سے ملاقاتوں کے دوران بار بار بڑھتی ہوئی آبادی کی نشاندہی کریں تاکہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو جائیں اور یہ "داغ" دھونے کے لیے اپنے سارے وسائل وقف کر دیں۔

(۵) امریکی انتظامیہ تیسری دنیا کے ہم خیال لیڈروں کو دوست ممالک کے رہنماؤں کو قائل کرنے کا "حکم" دے۔

(۶) وہ تمام جدید طریقے استعمال کیے جائیں جن کے ذریعے عوام میں بڑھتی ہوئی آبادی کے خلاف "شعور" بیدار کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مقامی دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور ماہرین کو استعمال کیا جائے جو گاہے بگاہے اعداد و شمار کے ذریعے ثابت کرتے رہیں کہ فلاں سال میں آبادی

اتنی ہوگئی تو اتنا بڑا قحط پڑے گا، اتنی بیماریاں پھیل جائیں گی، رہائش کا اتنا بڑا مسئلہ پیدا ہوگا، بیروزگاری اور جہالت میں اتنے فیصد اضافہ ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔

(۷) اگر ان ممالک میں فوجی آمروں کو حکومت دلا دی جائے تو زیادہ بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

(۸) جنگ سے بہتر کوئی طریقہ نہیں جس سے آبادی کنٹرول کی جا سکتی ہے لہٰذا اگر مسلم دنیا کے باہمی تنازعات بڑھا دیئے جائیں تو امریکہ اپنا قیمتی سرمایہ بچا سکتا ہے۔

(۹) اگر اوپر دیئے گئے تمام طریقے ناکام ہو جائیں تو امریکی انتظامیہ خوراک کو بطور آخری ہتھیار استعمال کرے اور صرف ان ممالک کو گندم، ادویات اور دیگر اشیائے ضروریہ مہیا کرے جو آبادی کم کرنے کا عہد کریں۔

جی ہاں محترم قارئین! یہ ہے وہ سازش جس کے ذریعے پچھلے بیس برسوں سے ان لاکھوں بچوں کو ماؤں کی کوکھ ہی میں دفن کیا جا رہا ہے، جو انقلاب بن کر زمین پر طلوع ہونے تھے۔ ہو سکتا ہے اس ملک کی ساری ''امریکہ نژاد'' اشرافیہ، دانشور اور اکانومسٹ اس انکشاف کو بھی فراڈ قرار دیں لیکن کیا امریکہ مسلم دنیا میں پھیلے ہوئے اپنے ان لاکھوں ایجنٹوں کے باوجود تاریخ سے اپنا بیس سالہ ''ٹریک ریکارڈ'' کھرچ سکتا ہے؟ یہ ٹریک ریکارڈ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے جب اسرائیلی طیاروں نے عراق کے ایٹمی ری ایکٹر پر بم برسائے تو امریکی وزیر خارجہ نے کہا ''ہم دنیا کا امن پامال کرنے والے عراق کی حمایت نہیں کر سکتے'' لیکن جب اسی عراق کی توپیں ایرانی بارڈر پر گاڑی گئیں تو نہ صرف امریکہ نے اسے انتہائی مہلک اسلحہ دیا بلکہ وہ کیمیائی ہتھیار تک مہیا کیے جنہوں نے کردوں کی ایک پوری نسل معذور بنا دی۔

اور پھر جب صدام ایران سے منہ موڑ کر اچانک امریکی مفادات کے سامنے کھڑا ہو گیا تو یہی امریکہ پوری دنیا کی عسکری قوت کے ساتھ عراق پر چڑھ دوڑا اور آج یہ عالم ہے کہ عراقی ماں کو اذیت سے بلبلاتے بچے کے لیے پورے بغداد سے درد کی ایک گولی تک نہیں ملتی کہ شفا کے سارے ''فراتوں'' پر کلنٹن کے پہرے ہیں...... اور جب پورا یورپ یورینیم کے دور سے پلاٹونیم کے دور میں داخل ہوا تو پاکستان نے ''اسلامی بم'' بنانے کا اعلان کر دیا، لیکن ''ایس 200 رپورٹ'' والے ہنری کسنجر نے پاکستان آ کر کہا:

> ''تمہارا خیال ہے تم تباہی کی اس ٹیکنالوجی کو پورے عرب میں پھیلا دو گے۔ نہیں مسٹر پرائم منسٹر! ہم تمہیں دنیا میں عبرت ناک مثال بنا دیں گے۔''

اور جب بھارت مقبوضہ کشمیر میں ہزاروں معصوم مسلمان شہریوں کے سینے چاک کر رہا تھا تو پوری دنیا کی مہذب اقوام پانڈا کی کم ہوتی نسل بچانے کے لیے کوشاں تھیں لیکن جب حریت پسندوں نے بندوق اٹھائی تو پوری دنیا کی ہیومن رائٹس آرگنائزیشنیں جاگ اٹھیں اور امریکی قونصلر نے وزیراعظم ہاؤس میں کھڑے ہو کر

کہا "اگر آپ لوگوں نے کشمیری دہشت گردوں کی مدد بند نہ کی تو ہم آپ کو دہشت گرد ملک قرار دے دیں گے۔"

جی ہاں، امریکی اخبارات ہی نے تو دنیا کو بتایا تھا کہ عراقیوں کو جراثیمی گندم دی جا رہی ہے جو انہیں اندر سے کھوکھلا کر رہی ہے۔ اسرائیل نے مصر میں ایسے بیج سمگل کئے جس سے ساری مصری کھیتیاں صحرا بن گئیں۔ لیبیا میں ہر سال وائرس کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے جس سے ان کی لاکھوں بھیڑیں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ سی آئی اے اور موساد پوری مسلم دنیا میں ایڈز سمگل کر رہی ہیں۔ ترکی کی مسجدوں کے تالے کھولنے کے لیے جو پارٹی آتی ہے، اسے ناکام بنا دیا جاتا ہے اور نائیجیریا کی اکانومی کو اس طرح تباہ کر دیا گیا کہ لوگ چند سکوں کے لیے دوست کا گلا کاٹنا جرم نہیں سمجھتے۔ بنگلہ دیش میں نس بندی کرانے والی ہر عورت کو ریشمی ساڑھی دی جاتی ہے اور...... پاکستان، ہاں امریکہ اپنے اتحادیوں کو اشارہ کرتا ہے تو کراچی کے ساحل پر گندم کے جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں، ورنہ پشاور کے بازاروں میں ایک آفریدی پٹھان بولی دے کر 30 روپے میں ایک روٹی خریدتا ہے۔

ہاں میرے محترم قارئین! کہیں ایسا تو نہیں کہ اس صدی کے آخری سال جب "ایس 200 رپورٹ" کی فائل بند کی جا رہی ہو گی تو ہم چوراہوں میں کھڑے ہو کر ہر گوری چمڑی والے کو روک کر کہیں "ہم اپنے ہاتھوں سے اپنے سارے بچے مار دیتے ہیں، بس تم ہمیں ایک روٹی دے دو۔ ایک روٹی کا سوال ہے بابا؟"

جی ہاں، بس ایک روٹی کا سوال ہے بابا۔

فکری لولے لنگڑے

ذوالفقار علی بھٹو پوری طرح با اختیار تھے تو ایک بار امریکہ کے دورے پر گئے۔ وہاں بھٹو صاحب کے اعزاز میں پاکستان کے سفارت خانے نے ڈنر کا پروگرام بنایا، جس کی ''صدارت'' کے لیے ہنری کسنجر کو دعوت دی گئی، جسے انہوں نے سفارتی عملے کی کوششوں اور بھٹو صاحب کی ''کرشماتی شخصیت'' سے متاثر ہو کر قبول کرلیا، جو یقیناً پاکستانی حکام کے لیے بڑے ''اعزاز'' کی بات تھی لہٰذا ڈنر سے دو روز قبل سفارت خانے میں ''مینو'' تیار کرنے کے لیے اجلاس طلب کیا گیا، جس میں بھٹو صاحب اپنی تمام تر مصروفیات ترک کر کے شریک ہوئے۔

اس اجلاس میں دنیا بھر کے ان تمام کھانوں کا جائزہ لیا گیا، جو ہنری کسنجر کو مرغوب تھے یا جن کے مرغوب ہونے کا امکان تھا۔ کسی نے کہا کسنجر ایک بار حیدر آبادی دال کا بڑا ذکر کر رہے تھے۔ کسی نے بتایا بھارتی سفارت خانے کے ایک فنکشن میں انہوں نے بریانی کے پورے دو چمچ لیے تھے۔ کوئی بولا ''ارے صاحب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کسنجر کیکڑے کے سوپ کے پورے دو پیالے چڑھا گئے۔'' وغیرہ وغیرہ لیکن بھٹو صاحب کا اصرار تھا کیونکہ ایک عرصے بعد امریکی برف ٹوٹی ہے، لہٰذا یہی وقت ہے جب ہم کسنجر کو مٹھی میں لے کر امریکیوں کے دل جیت سکتے ہیں، چنانچہ ہمیں مینو میں کوئی ایسی حیرت انگیز چیز رکھنی چاہیے، جو کسنجر کی ساری توجہ کھینچ لے۔ بھٹو صاحب کا حکم تھا، لہٰذا تمام سفارتی دماغ اس اہم نکتے پر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اچانک ایک صاحب نے سر اٹھایا اور حاضرین کو مخاطب کر کے بولے۔ ''کیوں نہ ہم ہنری کسنجر کو کالے بیٹر کھلائیں۔'' بس ان لفظوں کا ادا ہونا تھا بھٹو صاحب نے چیخ کر کہا ''یس دیٹ از تجیشن'' اور سب کے چہروں پر روشنی پھیل گئی۔

اس کے بعد واقفان حال بتاتے ہیں، پاکستان کا پورا سفارتی عملہ اور بھٹو صاحب کے وفد کے تمام ارکان امریکہ میں کالے بیٹروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، لیکن رات گئے تک کوشش کے باوجود بیٹر دستیاب نہ ہو سکے۔ پھر کسی ''سیانے'' نے مشورہ دیا۔ جہاز بھیجیں اور کراچی سے جتنے چاہے بیٹر منگوالیں۔'' تجویز اچھی تھی لہٰذا وزیراعظم نے فوراً اس نیک کام کے لیے اپنا طیارہ وقف کر دیا۔ قصہ مختصر اگلے روز وزیراعظم کے طیارے پر دو ہزار بیٹر امریکہ آ گئے تو پتہ چلا سفارت خانے کا خانساماں تو ''بیٹر'' بنانے کا اہل ہی نہیں۔ اب کیا ہو سکتا تھا، ناچار وزیراعظم کا طیارہ دوبارہ کراچی آیا اور بیٹر بنانے کا ''ماہر'' لے کر واپس واشنگٹن گیا۔ اگلے روز

ڈنر کا دن تھا چنانچہ سارا دن سفارتی عملہ ''بیٹر'' بنانے میں خانساماں کی مدد کرتا رہا۔ شام کو جب ''ڈش'' تیار ہوگئی تو مینو کارڈ پر اس کا خصوصی طور پر اندراج کیا گیا، جس میں مرحوم بیٹروں کی تمام عادات، خصائل اور فوائد کا نہایت خوبصورت انگریزی میں ذکر تھا۔ بہر حال قصہ مزید مختصر، رات کو جب ہنری کسنجر نے ''پاکستان ہاؤس'' میں قدم رنجہ فرمایا تو بھٹو صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگے ''مسٹر پرائم منسٹر میں بہت مصروف ہوں، آپ لوگوں کو صرف پندرہ منٹ کمپنی دے سکوں گا۔ آیئے کھانے کی میز پر ہی گپ لگاتے ہیں۔'' سب نے فوراً گردن ہلا کر ان کی تائید کی جس کے بعد معزز مہمان ایک کرسی پر براجمان ہوگئے۔ سب سے پہلے کسنجر کے سامنے مینو رکھا گیا، جو انہوں نے بغیر پڑھے گلاس کے نیچے رکھ دیا۔ پھر بیٹروں کی ٹرے ان کے سامنے لائی گئی، جسے دیکھ کر انہوں نے ''نو تھینکس'' کہا اور سلاد کی پلیٹ سے ''کھیرے'' کی چند قاشیں اٹھا کر بھٹو صاحب کا ''حال چال'' پوچھنا شروع کر دیا۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ان کی سیکرٹری آگے بڑھی اور نہایت احترام سے پوچھا۔ ''سر ہمارے لیے کیا حکم ہے۔'' کسنجر نے فوراً گھڑی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بھٹو صاحب سے بولا ''تھینک یو ویری مچ پرائم منسٹر، وی ول میٹ سون'' کرسی کھسکائی اور ہاتھ ہلاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

یہ واقعہ ہمارے بزرگ، سابق بیوروکریٹ اور نامور ادیب مختار مسعود نے اپنی نجی محفلوں میں جب بھی سنایا ہم سب نے اسے ایک دلچسپ حکایت، ایک پر مزاح قصہ سمجھ کر سنا اور بھول گئے لیکن جب کل لاہور کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے گورنر ہاؤس میں برطانیہ کی ملکہ معظمہ الزبتھ کی ضیافت کے ''مینو'' کی تیاری کا احوال سنایا تو بے اختیار یہ بھولا ہوا واقعہ یاد آگیا۔ بتانے والے نے بتایا ایک روز قبل ''مینو'' کے لیے باقاعدہ اجلاس بلایا گیا جس کی صدارت گورنر پنجاب نے بذات خود فرمائی جبکہ بیگم صاحب چیف کوآرڈی نیٹر کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ اجلاس اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے شروع ہوا جس کے بعد ایک ''سیکرٹری صاحب'' نے ان تمام کھانوں کی فہرست پڑھ کر سنائی جو ملکہ معظمہ کو زندگی کے مختلف ادوار میں مرغوب رہے۔ فہرست کے اختتام پر جب سیکرٹری نے فخر سے حاضرین کی طرف دیکھا تو جناب صدر نے حیرت سے پوچھا ''لیکن یہ ساری معلومات آپ کو ملیں کہاں سے۔'' سیکرٹری نے مسکرا کر گردن جھٹکی اور بولا ''میں جب برطانیہ میں پڑھ رہا تھا تو ملکہ کا شیف میرا لینڈ لارڈ تھا، چھٹی کے روز ہم ایک دوسرے سے ''ویو ایکسچینج'' کیا کرتے تھے۔ یہ ساری معلومات ہماری انہی ملاقاتوں کے کونٹس ہیں، جو میں اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا رہا۔'' گڈ ویری گڈ، ''جناب صدر نے سیکرٹری کی فراست کی داد دی۔ سیکرٹری تھوڑا سا جھکا اور ''تھینک یو'' کہہ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد کونے سے ایک اور صاحب اٹھے اور جیب سے ایک فہرست نکال کر پڑھنے لگے۔ تقریر کے اختتام پر جب صاحب صدر نے ان کی وسیع معلومات کا ماخذ دریافت فرمایا تو صاحب نے انکشاف کیا ''میں نے یہ ساری معلومات شاہی خاندان کے افراد کے انٹرویوز اور اخبارات میں شائع ہونے والی شاہی ضیافتوں کی روداد وں سے جمع کیں کیونکہ مجھے دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی دلچسپیاں اور پسند و ناپسند جمع کرنے کا شوق ہے، لہٰذا میں ملکی اور

غیر ملکی اخبارات کے ایسے تمام حصے کاٹ لیتا ہوں، جن میں ایسی معلومات ہوتی ہیں۔"

گورنر نے اس پر بھی گڈ کہا تو تیسرے شخص نے ایک فہرست نکالی اور پڑھنا شروع کر دی۔ فہرست کے اختتام پر جب اس سے بھی معلومات کے ذرائع دریافت کیے گئے تو اس نے بھی اسی قسم کی ایک کہانی سنا دی، الغرض تمام شرکاء اجلاس کے پاس ایک ایک فہرست تھی، جس کے بارے میں ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ اصل معلومات صرف اس کے پاس ہیں۔ گورنر صاحب بری طرح مخمصے میں پھنس گئے، لہٰذا طویل بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ان فہرستوں میں موجود تمام مشترکہ کھانے پکا لیے جائیں یوں جب اجلاس کے آخر میں ملکہ کے لیے "مینو" تیار ہوا تو اس میں صرف 19 کھانے تھے۔

لیکن قارئین کرام! بدقسمتی ملاحظہ فرمائیے ملکہ معظمہ اور ہنری کسنجر کی عادات میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ شاید اسی لیے جب ملکہ ضیافت میں شرکت کے لیے ہال میں داخل ہوئیں تو ان کے سیکرٹری نے آگے بڑھ کر گورنر کے کان میں سرگوشی کی "ملکہ کا پرہیزی کھانا لندن سے آتا ہے، پلیز ان سے کھانے کے لیے اصرار نہ کیجیے گا" اور گورنر صاحب بہادر نگران تاج برطانیہ سمیت تمام منتظمین کے چہرے دھواں ہو گئے۔

اگر یہ روایت صحیح اور سچ ہے تو کاش اس وقت محترم مختار مسعود میرے سامنے ہوتے تو میں ان سے پوچھتا "بابا کیا بھٹو سے نواز شریف تک وقت ایک ہی جگہ ٹھہرا رہا۔" تو یقیناً وہ اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں جواب دیتے غلامی جسمانی مجبوری نہیں فکری معذوری ہوتی ہے اور جو لوگ فکری سطح پر لولے لنگڑے ہوتے ہیں ان پر وقت کبھی نہیں بدلا کرتا۔ راکھ سو برس بعد بھی راکھ ہی رہتی ہے۔

بھوسے میں دبی آگ

میں اسلام آباد میں ''ممی ڈیڈی جنریشن'' کے ساتھ رہتا ہوں، روز میرا ان کے ساتھ ٹاکرا ہوتا ہے، روز میں ان سے گفتگو کرتا ہوں، روز میں ان سے مایوس ہوتا ہوں، روز مجھے اپنی تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور روز میں اس شہر کی گلیوں، بازاروں، ریستورانوں اور پارکوں سے دکھ کا احساس لے کر گھر واپس لوٹتا ہوں۔

میں جب بھی ان کے سامنے بھارت کا تذکرہ کرتا ہوں تو یہ لاتعلقی سے سگریٹ کا کش لیتے ہیں اور گل جھاڑ کر بڑے اطمینان سے کہتے ہیں ''آخر بھارت سے دشمنی رکھنے کا کیا فائدہ؟ ہم اسے دوست بنا کر ہمیشہ کے لیے جنگ کے خطرات سے آزاد کیوں نہیں ہو جاتے؟ ہم دس روپے کے بجائے دو روپے کلو آلو کیوں نہیں خریدتے؟ ہم 65 کے بجائے 18 ہزار میں موٹر سائیکل کیوں نہیں لیتے۔ ہم اپنے سینماؤں میں سجاش گئی کی بنائی فلمیں کیوں نہیں چلاتے۔''

میں جب بھی ان کے سامنے رحمت اللہ علیہ کے ساتھ اکابرین کا نام لیتا ہوں تو یہ بال ماتھے سے پیچھے جھٹک کر پورے ''اعتماد'' سے کہتے ہیں ''آخر ہم قائداعظم، علامہ اقبال اور لیاقت علی خان کی ڈومیسٹک لائف پر بات کیوں نہیں کر سکتے؟ ان کے ویسٹرن وے آف لائف پر ڈسکشن کیوں نہیں ہو سکتی، ادھر بھارت میں تو نہرو کی رومانوی زندگی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تک لکھا گیا۔''

میں جب بھی ان کے سامنے یہودیوں کو عالم اسلام کا دشمن قرار دیتا ہوں تو یہ سیب کو میلی جینز پر رگڑ کر چکاتے ہیں اور پھر کچر کچر چباتے ہوئے کہتے ہیں ''آخر ہم من حیث القوم ان یہودیوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں جو پوری انسانیت کے ''محسن'' ہیں جنہوں نے دنیا کی 70 فیصد ایجادات کیں، جنہوں نے دنیا کے بڑے بڑے فلاحی اداروں کی بنیاد رکھی، جنہوں نے ویلفیئر سٹیٹس کا تصور دیا اور جو ماڈرن سائنسز میں ترقی کا باعث ہے۔ آخر ہم اپنے ''محسنوں'' کو گنہگار کیوں سمجھتے ہیں؟''

میں جب بھی ان کے سامنے پاک آرمی کا ذکر ممنونیت سے کرتا ہوں تو وہ چٹکی بجا کر طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہیں اور پھر لفظ چبا چبا کر کہتے ہیں ''آخر دنیا کا 127 واں غریب ملک اپنے بجٹ کا 28.6 فیصد دفاع پر کیوں خرچ کرتا ہے؟ جس ملک کے ہسپتالوں میں ڈسپرین تک دستیاب نہیں، اسے ایٹم بنانے کی

کیا ضرورت ہے؟ جس ملک کے شہریوں کے لیے گندم تک خریدی جاتی ہے، اسے سات لاکھ فوج پالنے کی ضرورت ہے؟ جس ملک کے زیادہ تر پرائمری سکول برگد کے نیچے قائم ہیں، اس کے لیے ایف 16 اور میراج کیوں ضروری ہیں؟''

میں جب بھی ان کے سامنے پختونخواہ کو پاکستان کے خلاف سازش قرار دیتا ہوں تو یہ برگر کی پیکنگ ہاتھ میں مسلتے ہیں، اس کا گولا بناتے ہیں اور پھر اسے ٹھڈا مار کر کہتے ہیں۔ ''اگر سرحد کو پختونخواہ کہہ لیا جائے، بلوچستان کو گریٹر بلوچستان اور سندھ کو سندھو دیش تو کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر ایک کے بجائے چھوٹے چھوٹے چار ملک بن جائیں تو کیا مضائقہ ہے، مقبوضہ کشمیر بھارت ہی کے پاس رہنے دیا جائے تو کیا حرج ہے، گلگت اور بلتستان ادھر جائے یا ادھر، کیا نقصان ہے؟ تقسیم کی ایک اور لکیر کھینچ کر جغرافیہ درست کر دیا جائے تو کیا جاتا ہے؟''

میں جب بھی ان کے سامنے اسلام کو پاکستان کی آخری منزل کہتا ہوں تو یہ بیئر کے خالی ٹن ہوا میں اچھال کر کہتے ہیں'' ہم اسلام کے بجائے انسانیت کے لیے جنگ کیوں نہیں لڑتے، شخصی آزادیوں اور انسانی حقوق کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتے، لبرل ازم، قلبی وسعت اور باطنی کشادگی کے لیے جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟''

ہاں محترم قارئین، میں جب بھی اس نئی نسل سے تبادلہ خیالات کرتا ہوں تو مجھے ان میں سے اکثر اجنبی اجنبی سے محسوس ہوتے ہیں، جیسے ان کا اس زمین، اس کی آئیڈیالوجی، اس کے کلچر اور اس کے بیک گراؤنڈ سے کوئی تعلق نہیں، جیسے بھارت ان کا نہیں پاکستان کا دشمن ہے، جیسے قائداعظم ان کے نہیں پاکستانیوں کے لیڈر ہیں، جیسے اسرائیل ان کا نہیں پاکستان کا مسئلہ ہے، جیسے فوج ان کی نہیں پاکستان کی محافظ ہے، جیسے کشمیر ان کے لیے نہیں پاکستان کے لیے اہم ہے اور جیسے اسلام ان کی نہیں پاکستانیوں کی آخری منزل ہے۔ ہاں محترم قارئین، مجھے یہ لوگ پاکستان سے الگ نظر آتے ہیں، کسی دوسرے ملک کے باسی، کسی دوسرے سیارے کے شہری، جو چند دنوں کے لیے یہاں آئے ہیں اور جو گھوم پھر کر واپس چلے جائیں گے۔ یقین کریں ان لوگوں کو اس زمین سے اتنی بھی دلچسپی نہیں جتنی کسی سیاح کو کسی اجنبی مقام سے ہوتی ہے۔

ادھر میرا تعلق ایک پسماندہ دیہاتی علاقے سے ہے جہاں ان پڑھ، سادہ اور محروم لوگ بستے ہیں، جہاں جوان کم اور بوڑھے زیادہ ہیں۔ میں جب ''ممی ڈیڈی'' لوگوں سے نکل کر لالہ موسیٰ جاتا ہوں، جب اپنے لوگوں سے ملتا ہوں، پرانی بیٹھکوں، کھلے چوپالوں اور سیلن زدہ ڈیوڑھیوں میں کھانستے، لرزتے، کانپتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر بدلتے وقت کی آواز سننے کی کوشش کرتے بوڑھوں سے ملاقات کرتا ہوں تو میں انہیں پاکستان کے لیے متفکر پاتا ہوں، ہندو کو ازلی دشمن کہتے سنتا ہوں، قائداعظم کی تصویر کو چومتے اور علامہ اقبال کو رحمتہ اللہ علیہ کہتے دیکھتا ہوں، یہودیوں کو پورے عالم اسلام کا مخالف کہتے پاتا ہوں، پاک فوج کو ملکی بقاء کا آخری ہتھیار کہتے سنتا ہوں، پاکستان کی سلامتی کے لیے ہزار بار قربان ہونے کے لیے تیار پاتا ہوں، اسلام کو

انسانیت کا دوسرا نام قرار دیتے دیکھتا ہوں، تو فوراً میرے ذہن میں خیال آتا ہے کہیں پاکستان اور پاکستانیت صرف ان لوگوں تک محدود ہو کر تو نہیں رہ گئی، جنہوں نے آزادی کے لیے ہجرت کے دکھ سہے، جنہوں نے ہندوؤں کے ظلم وستم برداشت کیے، جنہوں نے گھر بار چھوڑے، جنہوں نے اپنے آدھے آدھے خاندان کو کٹوا کر آزادی دیکھی، جنہوں نے کانٹوں سے گزر کر پھولوں کی باس سونگھی اور جنہوں نے لمبی بھوک کے بعد دانہ گندم کا ذائقہ چکھا یا ان لوگوں میں محصور ہو کر رہ گئی ہے جو بڑے شہروں سے دور ہیں، جو خوشحالی اور ترقی سے بے بہرہ ہیں، جو آج بھی صرف ریڈیو پاکستان ہی کو حرف آخر سمجھتے ہیں، جو پاکستان کے ساتھ لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص نہایت ایمانداری سے ان دو دنیاؤں کا جائزہ لے، ان دو نسلوں کا مشاہدہ کرے تو شاید اسے دکھ کے ساتھ یہ اعلان کرنا پڑے کہ نظریہ پاکستان صرف بوڑھی نسل تک محدود ہو کر رہ چکا ہے۔ پاکستان کی محبت دیہاتوں اور قصبوں میں محصور ہو کر رہ گئی ہے، پاکستان کی بقاء کے لیے جان قربان کرنا اور اس کی ایک ایک انچ کی حفاظت صرف ساٹھ ستر برس کے کھانستے، لرزتے پختونخواہ کے مطالبے نے جتنا بزرگوں کو مجروح کیا، اتنے دکھ، اتنے درد کا اظہار تو جوان نسل بالخصوص شہروں میں بسنے والی نوجوان نسل نے نہیں کیا، وہ فیلنگ، وہ جذبات آج کی جینز، جیکٹ، برگر اور کوک جنریشن سے نشر نہیں ہوئے جو بزرگوں نے ٹرانسمٹ کیے، جو چھوٹے شہروں سے ابھرے۔

یوں محسوس ہوتا ہے نظریاتی عدم توجہ، فکری تربیت کی کمی، بھارت کی ثقافتی یلغار اور معیشت کا مصنوعی خوف، پرانی اور نئی نسل کے درمیان اتنی بڑی خلیج بن کر حائل ہو چکا ہے کہ اب وہ اپنے اپنے کناروں پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کی آواز تک نہیں سن سکتے اور شاید یہ اسی نظریاتی بحران ہی کا نتیجہ ہے کہ آج پختونخواہ کے مسئلے پر اے این پی سے جناب مجید نظامی، ضیا شاہد اور انکل نسیم انور بیگ جیسے بزرگ لڑ رہے ہیں یا پھر اندرون ملک آباد نیم خواندہ لوگ جبکہ آج کا نوجوان نہ صرف پختونخواہ کے مسئلے پر خاموش ہے، بلکہ وہ قائداعظم کی توہین، بھارت کے ساتھ تجارت، ایٹمی پروگرام کیپ کرنے اور سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے ایشوز پر بھی کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کر رہا۔

کتنے دکھ کی بات ہے، اس قوم کو پوری گھن گرج کے ساتھ اکیسویں صدی میں لے جانے کے خواہاں حکمران اس سنگین بحران کی آہٹ تک نہیں سن رہے، انہیں مٹھی سے سرکتی ریت کا احساس تک نہیں ہو رہا، انہیں یہ تک خبر نہیں ہو رہی کہ اجنبیوں کا ایک ایسا لشکر جرار تیار ہو چکا ہے جسے پاکستان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں، جو مادھوری کو اپنی ہیروئن اور سنجے دت کو اپنا ہیرو مان چکا ہے۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں شاید ان انجن ڈرائیوروں کی طرح، جو بوگیاں پلیٹ فارم پر چھوڑ کر سفر پر نکل جاتے ہیں، ہمارے پالیسی ساز بھی اسے المیے سے بے خبر ہیں۔ وہ اس ''ممی ڈیڈی جنریشن'' سے ناواقف

ہیں، وہ بھارتی کلچر اور بھارت کی فکر سے متاثر ان ''بھارتیوں'' کے وجود سے لاتعلق ہیں مجھے خطرہ ہے اگر یہ بے خبری یہ ناواقفیت اور یہ لاتعلقی ختم نہ ہوئی، نظریہ پاکستان، ملک سے محبت اور مٹی کے لیے کٹ مرنے کے جذبات چھوٹے شہروں سے نکل کر بڑے شہروں تک نہ پہنچے، لاغر بوڑھوں سے نوجوان نسل میں منتقل نہ ہوئے تو چند برس بعد صوبہ سرحد کا نام ''باچا سٹیٹ'' بھی رکھ دیا گیا تو شاید پورے ملک سے احتجاج کے لیے کوئی باہر نہ نکلے۔

سیانے کہتے ہیں اگر بھوسے میں چھپی چنگاریاں بروقت نہ بجھائی جائیں تو پورا گاؤں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

ویڈیو جنریشن

میرا دوست اپنے بچوں کی وجہ سے پریشان ہے۔

اس کا کہنا ہے اس کے بچے عجیب ہیں، ڈھیلی شرٹیں اور گھٹنوں تک بے ڈھنگے "کچھے" پہن کر پھرتے رہتے ہیں، رات ڈیڑھ دو بجے تک فلمیں دیکھتے ہیں، میوزک سنتے اور تاش کھیلتے ہیں، دن گیارہ بجے تک بستر پر پڑے رہتے ہیں، لیٹے لیٹے چائے کی "کلی" کرتے ہیں، نواسی کو "اپنی نائن" بولتے ہیں، انگریزی رسالے اور ننگی تصویروں والی کتابیں پڑھتے ہیں، برگر کھاتے ہیں اور چیری کی باتیں کرتے ہیں، فرینکفرٹ، لندن، پیرس اور واشنگٹن کا ذکر ایسے کرتے ہیں جیسے وہاں ان کی "پھپھی" رہتی ہے، باقاعدہ ویک اینڈ مناتے ہیں، کرسمس کا پروگرام بناتے ہیں اور "اپریل فول" کو عبادت سمجھتے ہیں۔

میرا دوسرا دوست بھی اپنے بچوں کی وجہ سے پریشان ہے۔

اس کا کہنا ہے اس کے بچوں نے بڑا ہو کر اسے ابا کے بجائے ڈیڈ کہنا شروع کر دیا ہے، وہ روپے کو ڈالر اور سینٹ کے سامنے کھڑا کر کے دیکھتے ہیں، لنکن، چرچل، ہٹلر، نپولین اور جارج ان کے لیڈر ہیں، نطشے، برنارڈ شا، رسل، کیٹس، کالرج اور شیکسپئر ان کے شاعر ہیں۔ جیکسن، میڈونا، آرنلڈ، وینڈیم، سٹون، راجر مور، ٹموتھی اور کوئین ان کے ہیرو ہیں۔ وہ پائن ایپل کھاتے ہیں، سلائس کا ناشتہ کرتے ہیں۔ لنچ اور ڈنر کرتے ہیں، شیمپئن، جانی واکر اور جن کا تذکرہ کرتے ہیں، کافی پیتے اور سوپ لیتے ہیں، انہیں درد نہیں "پین" ہوتا ہے، پریشانی نہیں "ڈپریشن" ہوتا ہے، وہ تنہائی نہیں "لونلی نیس" محسوس کرتے ہیں، وہ خوش نہیں ہوتے "انجوائے" کرتے ہیں، انہیں خدا نہیں "گاڈ" یاد آیا ہے، انہیں دکھ نہیں "اوئو" ہوتا ہے، وہ سلام نہیں "ہائے" کرتے ہیں۔

میرا تیسرا دوست بھی اپنے بچوں کی وجہ سے پریشان ہے۔

اس کا کہنا ہے اس کے بچے فردوسی کو خاتون سمجھتے ہیں، سعدی کو کپڑا بیچنے والا شیخ کہتے ہیں، غالب کو کوئی شاعر وائر، اقبال کو مولوی اور فیض کو سرخا کہتے ہیں، وہ قرآن مجید کو "بک" اور نماز کو "یوگا" سمجھتے ہیں، وہ مکہ مکرمہ کو مسلمانوں کا ویٹی کن کہتے ہیں، وہ نبی اکرم ﷺ کو "دی مسلم لیڈر" پکارتے ہیں، انہیں دوسرا کلمہ نہیں آیا، وہ نماز نہیں پڑھ سکتے، جنازے میں شریک نہیں ہو سکتے، وضو اور طہارت کے اصولوں سے نابلد ہیں،

کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہیں، گھوم پھر کر کھاتے ہیں، وہ جوتے پہن کر سوتے ہیں، وہ اخلاقی پابندیوں کو ''ہیومن رائٹس'' کی خلاف ورزی کہتے ہیں، وہ رشدی کو معصوم اور اسرائیل کو حق بجانب قرار دیتے ہیں۔

میرا ایک اور دوست بھی اپنے بچوں کی وجہ سے پریشان ہے۔

اس کا کہنا ہے اس کے بچے، بہوئی کو جیجاجی، مشکل کو کٹھنائی، معافی کو شما، خط کو پتر، مبارک کو بدھائی، وجہ کو کارن اور منظوری کو آشیرباد لکھ جاتے ہیں، وہ خ کو کھ بولتے ہیں، پھ کو ف، کہہ جاتے ہیں، انہیں دیوالی اور ہولی کی ساری رسمیں یاد ہیں، وہ سندور کو پوتر اور گلے کی زنجیر کو منگل سوتر سمجھتے ہیں، وہ ہاتھ باندھ کر نمستے کرتے ہیں، دھوتی اور ساڑھی کو قومی لباس سمجھتے ہیں، میرے چھوٹے بیٹے کو ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' پورا یاد ہے، میری بیٹی ماتھے پر بھی کبھار بندیا لگالیتی ہے، میرا بڑا بیٹا کبھی کبھار شغلاً ''اشلوک'' پڑھنا شروع کر دیتا ہے اور میرا سب سے چھوٹا بیٹا مجھ سے پوچھتا ہے ''پتاجی! کیا سارے مسلے راکھشس ہوتے ہیں؟''

میرا ایک اور بزرگ دوست بھی بڑا پریشان ہے۔

اس کے ایک بچے نے گیتا پڑھنا شروع کر دی ہے۔ دوسرا بائبل کا مطالعہ کر رہا ہے، تیسرا ہپی بن چکا ہے اور بیٹی ''نن'' بننا چاہتی ہے، سب کی گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز ہیں، سب ایک دوسرے کو وش کارڈ بھیجتے ہیں ''گفٹ'' پیش کرتے ہیں، دوستوں کو کنٹری سائیڈ پر پکنک پارٹیوں کی دعوت دیتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ملاتے وقت سمائل دیتے ہیں اور نتھی ہیں سب کچھ برداشت کرتے ہیں، کتے پالتے ہیں، ''راک اینڈ رول'' پر گھنٹوں ڈانس کرتے ہیں، ''واک'' پر جاتے ہیں، ڈائٹنگ کرتے ہیں، مساج کراتے ہیں، بال ڈائی کرتے ہیں، وگ لگاتے ہیں، میک اپ کراتے ہیں، پونیاں بناتے ہیں، پھٹی ہوئی بھدی اور غلیظ جینز پہنتے ہیں اور ایک پہیے پر موٹر سائیکل چلاتے ہیں۔

جی نہیں، آپ غلط سمجھ رہے ہیں، میرے ان تمام دوستوں کا تعلق، یورپ امریکہ اور بھارت سے نہیں، یہ سب پاکستانی ہیں، یہ سب پاکستان میں رہتے ہیں، ان سب کے بچے پاکستان میں پیدا ہوئے، ان سب کے بچوں نے کبھی یورپ اور امریکہ کی شکل نہیں دیکھی اور یہ سب لوگ کبھی واہگہ کے پار نہیں گئے ...... بس ان سے اتنی بھول ہوئی کہ ان لوگوں نے سول سروس جوائن کر لی، فوج میں کمیشن لے لیا یا بزنس شروع کر دیا اور اپنے بچوں کو چوہڑکانہ، کاہنہ کاچھا، ٹنڈو آدم، احمد پور شرقیہ اور لالہ موسیٰ سے کراچی، لاہور اور اسلام آباد لے آئے اور اس کے بعد جب جائز ناجائز پیسے کی ریل پیل ہوئی تو انہوں نے اپنے بچپن کی محرومیوں کی ''تلافی'' شروع کر دی۔ بچوں کو ٹاٹ سکولوں سے اٹھوا کر بیکن ہاؤس، امریکن سکول اور سٹی پبلک سکول میں داخل کرا دیا۔ ان کے ہاتھوں سے قاعدے اور سپارے لے کر انہیں آزاد انسان بنانا شروع کر دیا۔ ڈانٹ ڈپٹ کو ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی سمجھ کر ترک کر دیا، ان کے ہاتھ میں آکسفورڈ پریس اور پینگوئن کی کتابیں پکڑا دیں، انہیں وی سی آر اور ڈش کے سامنے بٹھا دیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس کلچر میں زیادہ لذت، زیادہ شہوت اور زیادہ

تھرل ہوتی ہے وہ کمزور، بوسیدہ اور پینڈو ثقافت کو نگل جاتا ہے لہٰذا آج ان کے بچے ان کے بچے نہیں رہے۔
جارج، فلپ اور ایلزبتھ کے بچے بن چکے ہیں، پاکستان کے نہیں بھارت ماتا کے سپوت بن چکے ہیں۔

جی ہاں ہم اپنی نسلوں سے ایک ایسی نسل پیدا کر چکے ہیں جو ہماری نہیں، بلکہ یہ کہا جائے یہ نسل کسی کی بھی نہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہنس کی چال چلنے والے کوؤں کو ہنس قبول کرتے ہیں اور نہ ہی کوے۔

ہوسکتا ہے یہ مسئلہ صرف میرے چند دوستوں کا ہوتا تو میں اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول جاتا لیکن میں پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں پروان چڑھتی نسل کو اسی آگ میں جلتے دیکھ رہا ہوں کیونکہ اب اسلام آباد اور ڈونگہ بونگہ کی ثقافت میں زیادہ فرق نہیں رہا۔ اب آپ چیچو کی ملیاں اور فورٹ عباس میں بھی میڈونا کے گانے سن سکتے ہیں، لمبی شرٹوں اور چھوٹے پچھوں میں ملبوس نوجوان دیکھ سکتے ہیں، لمبے بالوں اور پھٹی پتلونوں والی نسل کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

گارے کی دیوار

ایک دن کے لیے ہاں صرف ایک دن کے لیے ائیر کنڈیشنز کا سوئچ آف کر دیں، اپنی بڑی گاڑی گیراج میں بند کر دیں، منرل واٹر کی بوتل کو منہ نہ لگائیں، سلائس پر مکھن کی تہہ نہ جمائیں، کینیا کی کافی میں ہالینڈ کا دودھ نہ ملائیں، جاپانی مشینوں پر باریک سوتی دھاگے سے بنی کاٹن پر فرانس کی خوشبو نہ لگائیں، اٹلی کا جوتا نہ پہنیں، امریکی فارمولے سے بال ڈائی نہ کریں، برازیلی بید کی چھڑی پکڑ کر مارگلہ روڈ پر سیر نہ کریں، لمبے کانوں اور چھوٹی دم والے جرمن کتے سے گفتگو نہ کریں، امریکی دوستوں کے اصولوں کی ڈینگیں نہ ماریں۔ ہاں! صرف ایک دن کے لیے اپنے گھروں سے نکل کر چکوال، بہاولنگر، ننخو آدم، جیکب آباد، پنڈی کی ملیاں، مردان اور گوادر میں پھیل جائیں اور کھال میں اترتی گرمی، وجود سے اترتی حبس اور جسم سے جدا ہوتی زندگی کے درمیان کھڑے ہو جائیں، اپنے ہی کندھوں پر اپنے جنازے اٹھا کر پھرتے لوگوں کو مخاطب کریں، انہیں بتائیں وزیراعظم اسلام نافذ کرنے کا اعلان کر چکے ہیں، پھر وہ لوگ جو جواب دیں اسے باندھ کر واپس گھروں کو لوٹ آئیں اور پھر امریکی دوستوں کے اصولوں کی ڈینگیں مارتے ہوئے، اپنے جرمن کتوں سے گفتگو کرتے ہوئے، مارگلہ روڈ پر واک کے لیے نکلتے ہوئے، بال ڈائی کرتے ہوئے، نرم جوتا پہنتے ہوئے، خوشبو لگاتے ہوئے، گاڑی کے شیشے چڑھاتے ہوئے اور ائیر کنڈیشنز کے تھرموسیٹ کی ناب گھماتے ہوئے ایک لمحے کے لیے ہاں صرف ایک لمحے کے لیے سوچیں، کیا اربوں روپے سے تعمیر کردہ اس پارلیمنٹ کے یخ بستہ ہال میں پیش کیا جانے والا اسلام اس ملک کے ان 70 فیصد لوگوں کو پانی کا ایک صاف گلاس فراہم کر سکتا ہے جو صدیوں سے کیچڑ چھان کر پیتے آ رہے ہیں۔ ان ۱۴ کروڑ لوگوں کی پٹواریوں، تحصیل داروں، تھانیداروں اور محرروں سے جان چھڑا سکتا ہے جو پچاس برس سے گھروں میں دبکے بیٹھے ہیں، ان گیارہ لاکھ نوجوانوں کو ملازمتیں دلا سکتا ہے جو پانچ برس سے ڈگریاں ہاتھ میں لیے مارے مارے پھر رہے ہیں، ان ایک کروڑ مظلوموں کو انصاف دلا سکتا ہے جو برسوں سے ایک عدالت سے دوسری اور دوسری سے تیسری سرکار کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔

جی ہاں اپنی بید کی چھڑی، خوشبودار سگار اور جراثیم سے پاک گلاس سے پوچھئے کیا یہ اسلام پسینے سے

شرابور بدبودار انسانوں کو پارلیمنٹ میں داخلے کی اجازت دلا دے گا، پہلے، دوسرے اور تیسرے طبقے کے درمیان کھڑی دیواریں گرا دے گا، ایچی سن اور ٹاٹ سن کا درمیانی فاصلہ مٹا دے گا، بیمار کو گولی، ضرورت مند کو رقم اور مظلوم کو زبان دے گا، صدر کو چھوٹے گھر، وزیراعظم کو سڑک اور وزیر کو گلی محلے میں کھینچ لائے گا، سیکرٹریوں، ایڈیشنل سیکرٹریوں، ججوں، کمشنروں اور ایس پیوں کو بسوں ویگنوں اور تانگوں میں لا بٹھائے گا، دفتروں سے چقیں، اردلی، بیرے، جھنڈے، گیٹ، استقبالیے ختم کرا دے گا، گردنوں سے سریے، آوازوں سے ''ہم'' اور آنکھوں سے قہر خارج کر دے گا۔

جی ہاں اپنی کافی، اپنے سلاکس اور اپنی انگریزی سے پوچھئے کیا یہ اسلام پروٹوکول پنکچر کر دے گا، وی آئی پی لاؤنج ختم کر دے گا، ہوٹروں کا گلا دبا دے گا، چٹوں، ٹیلی فونوں اور بریف کیسوں کا زہر مار دے گا، نواز شریف اور نوازے کا فرق مٹا دے گا، بے نظیر اور مائی جیراں کو ایک صف میں لا کھڑا کرے گا، شہباز شریف اور شبازے کی تفریق اڑا دے گا، آصف علی زرداری اور آسو دس نمبری کو جیل کی ایک ہی گاڑی میں عدالت تک لے آئے گا، آچھو ۴۲۰ کو بھی زرداری کی طرح رجسٹرار کے دفتر میں بیگم سے ملاقات کی اجازت دلا دے گا، گاؤں کے جوہڑ پر ایک دوسرے کے منہ پر کیچڑ ملتے بلاول اور بختاور کو دوبئی کے سکولوں میں داخلہ دلا دے گا، حسین نواز اور حسینا بٹ کو ایک ہی رکشے میں بٹھا دے گا، شیخ رشید اور شیدے موچی کو ایک ہی قطار میں کھڑا کر دے گا، سرتاج عزیز اور تاجے حوالدار کی مراعات برابر کر دے گا اور مہتاب عباسی اور تابے تانبائی کو ایک ہی تھڑے پر لا بٹھائے گا۔

جی ہاں اپنے ایئر کنڈیشنرز، اپنی وارڈ روب اور اپنے بریف کیس سے پوچھئے، یہ اسلام جاگیرداروں کے ڈیروں پر بیٹھے ۶۰ لاکھ غلاموں کو آزادی دلا دے گا، کارخانوں کی بھٹیوں کو جسم کا ایندھن دینے والے کارکنوں کو وقت پر تنخواہ دلا دے گا، پتھریلی زمین پر ہل چلانے والے دریدہ دامن دہقانوں کو سال بھر کا آٹا دلا دے گا، دوزخ دوپہروں اور برف صبحوں میں روزی کے لیے گھروں سے نکلنے والے مزدوروں کی جھولی میں چند مٹھیاں گندم ڈال دے گا، روتے بچوں کے آنسو پونچھ ڈالے گا، بیواؤں کا خوف چوس لے گا، یتیموں کے سروں پر سایہ بن جائے گا، بے آسروں کو آسرا دے گا۔

جی ہاں اپنی پجیروز، اپنے سیکرٹری اور اپنی چیک بکس سے پوچھیں، کیا یہ اسلام مولویوں، طالب علموں اور پرائمری جماعتوں کے استادوں کو ارکان اسمبلی منتخب ہونے کی اجازت دے گا، سارے بدمعاش، ردسہ گیر، ڈاکو اور چور ارکان اسمبلی کو جیل بھجوا دے گا، سارے قبضے چھڑا دے گا، سارے کمیشنوں کا حساب بے باق کر دے گا، میرٹ واپس لے آئے گا، قانون کی عمل برداری کرا دے گا، اخلاقیات کو آئین بنا دے گا، تاجروں کو حضرت عثمان غنیؓ کا پیروکار بنا دے گا، اور حکمرانوں کو حضرت عمرؓ کا ''سختی'' بنا دے گا، عالموں کو وزیر اور پرہیزگاروں کو مشیر بنا دے گا، عوام کو آئین اور پیسے لوٹنے اور محروم لوگوں کو عہدیدار بنا دے گا، کیا یہ اسلام ۱۴ سو سال پرانا معاشرہ

پلٹ دے گا، زر پرستی اور عیش کوشی مٹی میں ملا دے گا، لبادے پھاڑ دے گا، تنی گردنیں کاٹ دے گا، مغرور زبانیں کھینچ لے گا، کاہل وجود نابود کر دے گا، گڈریوں اور اونٹ بانوں کو منصب دار اور سرداروں کو اونٹ بان اور گڈریے بنا دے گا۔

جی ہاں پوچھئے اپنے آپ سے سوال کیجیے ایک لمحے کے لیے منرل واٹر، سلائسوں، کافیوں، خوشبوؤں، جرمن کتوں اور امریکی فارمولوں سے باہر نکل کر سوچئے، کیا واقعی یہ وہی اسلام ہے۔ جس کی بنیاد آقا نامدار ﷺ نے رکھی تھی اور جسے بعد ازاں عمر فاروقؓ نے پوری دنیا میں پھیلایا تھا، پوچھئے اپنے آپ سے سوال کیجیے کیا آپ کا اسلام طبقاتی تفریق مٹاتا ہے، گورے اور کالے کی تمیز ختم کرتا ہے، عربی اور عجمی کی دیواریں گراتا ہے، انسان کو انسان سمجھتا ہے، مظلوم کی آہ سے ڈرتا اور خدا کے قہر سے کانپتا ہے، اگر نہیں تو پھر آپ کونسا اسلام نافذ کر رہے ہیں، آپ کا اسلام کیسا اسلام ہے جس کے دامن میں تازہ ہوا کا کوئی جھونکا نہیں، کوئی اصلاح، کوئی تبدیلی نہیں۔

میاں صاحب! خدا کے لیے میاں صاحب گارے کی دیوار کو سبز رنگ دے کر کنکریٹ بنانے کی کوشش نہ کریں کہ مٹی کی دیوار خواہ کتنی ہی مضبوط نظر کیوں نہ آئے، ہوتی آخر مٹی ہی ہے جسے چند بوندیں بھربھرا کر دیتی ہیں، جسے چند چھینٹے فنا کر دیتے ہیں۔

بھیڑیں

کہتے ہیں جب بھیڑیں سفر پر نکلتی ہیں تو سب سے کمزور، بیمار اور نحیف بھیڑ گلے کے آخر میں سر نیہوڑائے، زبان باہر نکالے، لنگڑاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی ہے، سفر کے دوران اگر خدانخواستہ سامنے سے کوئی آفت یا عذاب آجائے، راستہ بند ہو جائے، ناقابل عبور چڑھائی سامنے آکھڑی ہو یا کوئی درندہ ان پر حملہ آور ہو جائے تو سارا گلہ فوراً پلٹ جاتا ہے، جس کے بعد آخر میں چلنے والی وہی کمزور، نحیف اور لاغر بھیڑ "میر کارواں" بن جاتی ہے اور پھر ساری بھیڑیں اسے لیڈر مان کر سر جھکائے آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ تاوقتیکہ کوئی دوسری آفت انہیں پھر پلٹنے پر مجبور نہ کر دے۔

مجھے نہیں خبر وہ کون سی آفت، کون سا عذاب یا کون سا بانجھ پن تھا، جو ۱۳ کروڑ لوگوں کے اس ریوڑ پر اترا، انہوں نے اپنا رخ پلٹا اور ذہنی طور پر لولے، لنگڑے، بہرے اور نابالغ لوگ میر کارواں بن گئے، ورنہ اس خطے میں کیا کمی تھی۔

یہاں قائداعظم تھے، بات انگریزی میں کرتے اور سننے والے اردو تک سے نابلد ہوتے، لیکن ایک ایک شخص اٹھ کر گواہی دیتا، یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے۔ لیاقت علی خان تھے، جب مرے تو جیب میں چند روپے اور اچکن کے نیچے پھٹی ہوئی بنیان تھی۔ غلام محمد تھے۔ جن پر تمام تر غیر جمہوری رویوں کے باوجود کوئی شخص بے ایمانی، کند ذہنی اور تساہل کا الزام نہیں لگا سکتا۔ اخلاص، ایمانداری اور ذہانت کے مرقع چودھری محمد علی تھے۔ محمد علی بوگرا تھے، وزارت عظمیٰ ہاتھ سے نکلی تو دوبارہ سفارت قبول کرتے ایک منٹ نہ لگا۔ عبدالرب نشتر تھے، جن کے بچے گورنر ہاؤس سے پیدل سکول جاتے تھے، سکندر مرزا تھے، جن کی آخری عمر لندن کے ایک ہوٹل میں معمولی سی ملازمت کرتے گزری، ایوب خان تھے، جو ایوان صدر کے ایک ایک روپے کا حساب رکھتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو تھے، جو شرابی، متکبر اور سیکولر ہونے کے باوجود ذہانت، مطالعے اور خطابت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ضیاء الحق تھے، جن کی بردباری، پرہیزگاری اور مہمان نوازی کی گواہی کون نہیں دیتا۔

یہاں عبدالغفار خان جیسا سیاستدان تھا، لاکھ اعتراضات کے باوجود جسے پورے برصغیر میں یکساں

محبت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا، خان عبدالقیوم خان تھے، جنہوں نے کال دی تو عوام پاکستان کے طویل ترین جلوس کی شکل میں ان کے پیچھے چل پڑے۔ مولانا بھاشانی جیسے درویش تھے، قمیضی چپل اور دھوتی میں سٹیج پر چڑھتے تو جابر سے جابر سلطان ان کے کلمہ حق کی کاٹ سے نہ بچ سکتا۔ حسین شہید سہروردی تھے، جنہوں نے سیاست کو ایک نیا ہی رنگ روپ دیا۔ چودھری ظہور الٰہی جیسا دریا دل شخص تھا، جس کے احسانات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے سینکڑوں لوگ آج بھی آپ کو ملیں گے۔

یہاں مولانا مودودی جیسے عالم تھے جن کی فکر کی روشنی آج بھی لوگوں کو اندھیرے میں راستہ دکھاتی ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی تھے، جن کی باتیں دلوں پر لگی مہریں توڑ دیتی تھیں، مولانا احمد علی لاہوری تھے جن کی محفل پتھر کو پارس بنا دیتی تھی۔ احتشام الحق تھانوی تھے، جو بھٹکے ہوؤں کو شراب خانوں سے اُٹھا کر مصلے پر لا بٹھاتے تھے۔ مفتی محمود تھے، جنہوں نے مغربی یلغار کو ایک بازو کی قوت سے روکے رکھا۔ مولانا قمر الدین سیالوی تھے، جو مردہ روحوں کو زندہ کرنے کا کام کرتے تھے اور سید مظفر حسین شمسی تھے، جنہوں نے زندگی بھر شیعہ سنی کی تفریق پیدا نہ ہونے دی۔

یہاں فیض صاحب جیسا قلندر تھا، جوش جیسا صناع تھا، راشد جیسا لفاظ تھا، مجید امجد جیسا نباض تھا، منٹو جیسا سفاک افسانہ نویس تھا، آغا حشر جیسا ظالم مکالمہ نویس تھا، صوفی تبسم جیسا دلوں میں اتر جانے والا شاعر تھا، حفیظ جالندھری جیسا تر دماغ تھا، پروفیسر سلیم جیسا نقاد تھا، عابد علی عابد جیسا عمیق نظر دانشور تھا، حسن عسکری جیسا روشن سورج تھا، شہاب جیسا ہیرا تھا، میرا جی جیسا درویش تھا اور انشا جیسا حرارت بخش نظم گو تھا۔

یہاں آرٹ میں صادقین تھا یہاں مصوری میں چغتائی تھا۔ موسیقی میں خورشید انور تھا، راگ میں غلام علی اور روشن آرا تھی، سکرین پر سنتوش اور درپن تھا، یہاں کیا تھا، کون نہیں تھا۔

ہاں قارئین کرام! آپ ایک نسل پیچھے پلٹ کر دیکھیں، آپ کو زندگی کے ہر شعبے کے "ٹاپ" پر ایسے لوگ نظر آئیں گے، ظرف، ذہانت، فطانت، محنت اور ایمانداری میں جن کا کوئی ثانی نہیں تھا چھوڑیں، انہیں بھی چھوڑیں، آپ اپنے اردگرد دیکھیں ان بوڑھوں کو دیکھیں جنہیں آپ روز دیکھتے ہیں اور ان پر توجہ دیئے بغیر گزر جاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ اس نسل سے زیادہ پڑھے لکھے، ایماندار اور اعلیٰ ظرف نہیں؟ کیا ان کی زندگی میں اطمینان، سکون اور دھیما پن نہیں، چھوڑیں، انہیں بھی چھوڑیں۔ آپ دیکھیں آپ نے جن اساتذہ سے پرائمری کی تعلیم پائی، وہ آج کے اساتذہ سے بہتر، ذہین، محنتی اور ایماندار نہیں تھے۔ ہائی سکول اور کالج کے استاد کے آج کے استاد سے کہیں زیادہ عظیم اور اعلیٰ ظرف نہیں تھے، آپ نے چھوٹی سی عمر میں جتنی کتابیں پڑھ لی تھیں، جتنا علم آپ کی گرفت میں تھا، وہ آج آپ کے بیٹے کے پاس ہے؟ آپ نے ذاتی ایمانداری سے جو مواقع "ضائع" کیے، آج کا نوجوان بھی ایسی "بے وقوفی" کرے گا، نہیں، ہرگز نہیں۔

پھر یہ کیا ہوا، کوئی ایسا ادارہ نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے، کوئی ایسا شخص نہیں، جس کی بات اندھیرے

میں کرن کی طرح چمکے، کوئی ایسا لیڈر نہیں جس سے ہاتھ ملایا جائے اور ایک عرصے تک بدن میں سرور کی لہریں دوڑتی رہیں ...... یہ کیا ہوا، زمین اتنی بانجھ کیوں ہوگئی، اچھے، اعلیٰ ظرف اور ذہین لوگ اچانک ختم کیوں ہو گئے؟ ڈاکٹر اشفاق کہا کرتے تھے: ''جاوید اس معاشرے میں بڑے لوگوں کی اتنی کمی ہے کہ اگر ایک آدھ سال میں ایک آدھ بندہ مل جائے تو اس کے پاس سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا کہ اٹھے تو یہ دوبارہ نہیں ملے گا۔'' ہاں قارئین کرام! ہم لوگ کتنے بدقسمت ہیں، وقت کے اس تنہا، اداس اور ویران سفر میں ہمارے لیے کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو ہماری ہمت بندھا سکے، جو ہمیں تھپکی دے سکے، جو ہمیں اچھے اور برے کی تمیز سکھا سکے، جو ہماری راہبری کر سکے۔

جب میں اپنے بچے کی طرف دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں، اس کے لیے میں ''ماڈل'' ہوں تو ایک دکھ کی لہر سی اٹھتی ہے اور جاتے جاتے یہ کہہ جاتی ہے، جب قدرت ناراض ہوتی ہے تو انسانوں اور ان بھیڑوں میں کوئی فرق نہیں رہتا جو اپنے آگے چلنے والی ہر بھیڑ کو لیڈر مان لیتی ہیں خواہ وہ کتنی ہی کمزور اور نحیف کیوں نہ ہو۔

آف دی ریکارڈ

میرے بیٹے کو ابھی لفظوں کی صحیح پہچان نہیں، وہ ابا، اماں اور بابا آ اور بابا جا کو ہجے کر کے پڑھتا ہے لیکن ''ماڈرن ایج'' کے دوسرے بچوں کی طرح یہ کمی اس کے ابلاغ میں رکاوٹ نہیں بنی اس کے دماغ میں بھی درجنوں سوال پکتے رہتے ہیں، یہ کیا ہے، یہ کیوں ہے؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس نے ایسے کیوں کیا؟ وہ ایسے کیوں بول رہا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ وہ بولتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی ماں اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیتی ہے، لیکن وہ خوب سمجھتا ہے کہ آج کے والدین بہت بے بس، لاچار اور معذور ہیں، اپنے بچے کو بولڈ، منہ پھٹ اور سٹریٹ فارورڈ دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ چند لمحے کے توقف کے بعد ماما، کا نعرہ لگا کر ایک اور سوال داغ

دیتا ہے۔

مجھ سے اس کی ملاقات ہفتے میں صرف ایک بار ہوتی ہے اور وہ بھی چھٹی کے دن۔ باقی چھ دن معاملہ صرف منہ دکھائی تک محدود رہتا ہے۔ رات گئے جب میں گھر آتا ہوں تو وہ سو چکا ہوتا ہے، صبح سویرے میں اس کے اٹھنے سے پہلے ہی کام پر جت جاتا ہوں۔ لہٰذا وہ اٹھتا ہے، دور ہی سے ہاتھ ہلا کر سلام کرتا ہے، چپکے سے باتھ روم جاتا ہے اور پھر سکول جانے کی تیاری میں لگ جاتا ہے۔ ٹھیک آٹھ بج کر ۲۵ منٹ پر میں ''کلپ بورڈ'' اور لکھے ہوئے کاغذ ایک طرف رکھ کر اسے سکول چھوڑنے چلا جاتا ہوں۔ سکول کیونکہ قریب ہی ہے چنانچہ اس سے پانچ منٹ کی گفت وشنید ہوتی ہے جس میں وہ درجنوں سوال کرتا ہے، جن کا میرے پاس ''ہوں'' کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ اسے سکول چھوڑنے کے بعد میں دفتر جانے کی تیاری میں لگ جاتا ہوں، جہاں سے میں رات گئے واپس آتا ہوں تو وہ سو رہا ہوتا ہے۔ یہ روز کا معمول ہے۔

کل ۲۵ دسمبر کی چھٹی تھی۔ ایک عرصے بعد ہم نے کھل کر چھٹی منانے کا فیصلہ کیا۔ ہم چڑیا گھر چلے گئے، میرا بچہ اس ''تبدیلی'' پر بڑا خوش تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا، ہمارے آگے آگے دوڑتا، خوشی سے رقص کرنے لگتا، دوڑ کر باڑوں کے اوپر سے چھلانگ لگاتا، جانوروں سے بات چیت کی کوشش کرتا، خرگوش کو ''پاپ کارن'' کھلاتا میں اس کی ان حرکات سے لطف لیتا رہا۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ وہ اچانک شیروں کے پنجرے کے قریب رکا اور میری طرف مڑ کر بڑی سنجیدگی سے بولا: ''پاپا یہ آف دی ریکارڈ کیا ہوتا ہے۔''

میرے لیے اس کا یہ سوال بالکل غیر متوقع تھا، میں نے بھونچکا ہو کر پوچھا: ''بیٹے آپ نے یہ کہاں سے سنا؟'' اس نے شرارت سے بھرپور قہقہہ لگایا، پاپ کارن کی مٹھی بھری اور انہیں شیروں کی طرف اچھال کر بولا ''میں نے اخبار میں پڑھا ہے۔'' میں نے حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، وہ آہستہ سے مسکرائی اور بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی: ''اسے آج کل نیا شوق چرایا ہے، روز اخبار پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے مجھے آواز دے کر بلاتا ہے اور پھر انگلی کسی خبر پر رکھ کر کہتا ہے: ''ماما یہ کیا لکھا ہے، پڑھ دیں پلیز!'' اور میں سارے کام چھوڑ کر اسے خبریں سنانے بیٹھ جاتی ہوں۔''

میں نے دھوپ میں لیٹے ببر شیروں کے جوڑے پر نظریں جما کر پوچھا: ''پر یہ آف دی ریکارڈ کا کیا قصہ ہے۔''

''میں نے کل اسے ایک خبر پڑھ کر سنائی جس میں بار بار آف دی ریکارڈ آتا تھا، اس وقت سے یہ مجھ سے آف دی ریکارڈ کا مطلب پوچھ رہا ہے۔ اب مجھے کیا پتا آف دی ریکارڈ کیا ہوتا ہے؟'' میری بیوی بے چارگی سے بولی۔

اور ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا، اس ساری گفتگو کے دوران میرا بیٹا انگلی پکڑ کر حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی میری بیوی کو دیکھتا رہا، میں نے تفتیش مکمل ہوتے ہی پیار سے اس کے گال تھپتھپائے اور کہا:

''بیٹا جب کوئی بڑا شخص کوئی بات چھپوانا نہیں چاہتا تو وہ گفتگو کے ساتھ کہہ دیتا ہے، یہ پریس کے لیے نہیں ہے، ہم اسے آف دی ریکارڈ کہتے ہیں۔''

''پر وہ یہ بات کیوں نہیں چھپوانا چاہتا؟'' میرے بیٹے نے حیرت سے پوچھا۔

''شائد اس لیے کہ وہ بات چھپنے کے بعد اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کیوں، کیا وہ بات جھوٹی ہوتی ہے۔'' میرے بیٹے کی آواز میں تجسس کی کھنک تھی۔

''خیر، جھوٹی تو نہیں ہوتی، بلکہ اگر سچ پوچھو تو ساری گفتگو میں صرف یہی ایک بات سچ ہوتی ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اگر وہ بات جھوٹی نہیں ہوتی تو پھر آپ اسے اخبار میں کیوں نہیں چھاپتے'' میرے بیٹے نے میری انگلی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

''یار کہہ تو رہا ہوں بتانے والا اسے چھپوانا نہیں چاہتا۔'' میں نے پھر آہستہ سے کہا۔

''پاپا عجیب بات ہے'' اس نے مڑ کر دھوپ میں لیٹے شیروں کو دیکھا اور پھر ان پر نظریں گاڑ کر بولا ''عجیب بات ہے، سچ آپ چھاپتے نہیں اور جھوٹ چھاپ دیتے ہیں۔''

''بیٹے اخلاقیات بھی کوئی چیز ہے۔ کمٹمنٹ، وعدہ اور اعتماد بھی آخر کسی چیز کا نام ہے۔ ہم وہ بات

کیسے شائع کر سکتے ہیں جسے بتانے والا چھپوانا نہیں چاہتا۔'' میں نے جھلا کر کہا۔

''سچ سے بھی بڑی کوئی اخلاقیات، کمٹمنٹ، وعدہ اور اعتماد ہے؟'' اس نے بدستور شیروں پر نظریں جما کر کہا۔ آپ یقین کریں اس دلیل پر مجھے بہت غصہ آیا لیکن میں پی گیا کیونکہ میرا شمار بھی ان بے بس والدین میں ہوتا ہے جن کا خیال ہے بے جا ڈانٹ ڈپٹ سے بچوں کی دماغی گروتھ رک جاتی ہے آج کے بچے بھی والدین کی اس مجبوری سے واقف ہیں، لہٰذا وہ سوال کرتے ہوئے چوکتے ہیں، اور نہ ہی اصرار کرتے ہوئے، کچھ یہی صورتحال مجھے بھی درپیش تھی، کچھ دیر کے توقف کے بعد میرے بیٹے نے میری انگلی کو ایک اور جھٹکا دیا جب میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ بولا:

''لیکن پاپا! اگر اس شخص کو سچ سے ڈر لگتا ہے تو پھر وہ چپ کیوں نہیں رہتا، بولتا کیوں ہے؟''

''شاید اس لیے کہ ہم اسے کسی دوسرے موقع پر کسی دوسرے انداز سے شائع کر دیں۔'' میں نے بے زاری سے جواب دیا۔ ''کیا سچ بولنے کے بھی انداز اور مواقع ہوتے ہیں؟'' میرے بیٹے نے دوسرا سوال داغ دیا۔

''ہاں، ہوتے ہیں۔'' میں نے زچ ہو کر کہا۔

میرے بیٹے نے میری جھنجلاہٹ پر قہقہہ لگایا اور پھر میری انگلی کو زوردار جھٹکا دے کر بولا: ''پاپا، پاپا، میں بھی آپ کو ایک آف دی ریکارڈ بات بتاؤں۔''

''ہاں بتاؤ!'' میرے چلتے قدم رک گئے، میں خزاں زدہ املتاس درخت کے تنے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے آپ لوگ، آپ کے سارے بڑے لوگ اور آپ کے آف دی ریکارڈ نظام سے نفرت ہے، میں جب بڑا ہو جاؤں گا تو آپ سب کو گلیں مار کر باہر نکال دوں گا۔'' ساتھ ہی اس نے ہوا میں ککّ چلائی۔

یقین جانئے اس کی اس بات سے میرے کان تک سرخ ہو گئے اور میں بے بسی کے عالم میں پھٹے ہوئے خشک تنے پر مکے برسانے لگا۔ اس نے مجھے یوں بے بس دیکھا تو ایک مہین کھنکتا ہوا قہقہہ لگا کر بولا:

''پاپا آپ لوگ بہت گندے ہیں، سچ چھپا لیتے ہیں اور جھوٹ چھاپتے رہتے ہیں۔''

میں نے غصے، بے چارگی اور بے بسی کے ملے جلے احساسات کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا، سامنے پنجرے میں سرخ آنکھوں اور سرمئی پروں والے کبوتر آپس میں جوچیں لڑا رہے تھے، میں نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا:

''بیٹے میں تمہیں کیسے بتاؤں مسجد سے لے کر پارلیمنٹ تک، مدرسے سے لے کر سپریم کورٹ تک اور صدر سے لے کر صحافی تک ہم سب جھوٹ کے بیوپاری ہیں، جو بڑا جھوٹا وہ بڑا فنکار جو چھوٹا جھوٹا وہ چھوٹا فنکار ...... اور تم اگر غور سے دیکھو تو تمہیں ہم سب کے چہروں پر بنیوں کی مکاری اور ہمارے دانتوں سے مردار خوروں کی بدبو آئے گی۔''

ہاں، بیٹا جب ہم بوڑھے اور تم جوان ہو جاؤ گے تم ہر آف دی ریکارڈ کو آن دی ریکارڈ بنانے کے قابل ہو جاؤ گے اور پھر کبھی یونہی چلتے چلتے ہم سے پوچھو "بابا تم نے ہم جیسے بیٹوں کو سوال کرنے کی جرأت کیوں دی تھی۔" تو اس وقت ہم تمہیں بتائیں گے۔ "اس لیے بیٹا کہ تم وہ سوال بھی پوچھ سکو جو ہمارے دماغوں میں لاوے کی طرح ابلتے تھے لیکن جرأت اظہار کی کمی کے باعث نسوں کو جلا کر فنا ہو جاتے تھے۔"

ہاں بیٹا، ہم آخری سانسیں لیتے معاشرے کے کرم خوردہ ستون ہیں اور بیٹا جب معاشرے آخری سانس لیتے ہیں تو ہر سچ آف دی ریکارڈ اور ہر جھوٹ آن دی ریکارڈ ہو جاتا ہے۔

خانہ بدوش

میں گولڈن جوبلی منانے لگا تو بہت سی یادوں نے میرے ہاتھ جکڑ لیے۔

سڈنی کی فلائٹ سے چند لمحے پہلے مظہر بخاری نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا میں چند ہفتوں میں باپ بننے والا ہوں لیکن میری کوشش ہے میرا بچہ اس ملک میں آنکھ نہ کھولے، میں اسے اپنی طرح بے بس محروم اور لاچار نہیں دیکھنا چاہتا، مجھے معلوم ہے میں یہاں اچھا صحافی ہوں، میری عزت ہے، میری شناخت ہے اور وہاں میں سڈنی یا پرتھ میں گمنام زندگی گزاروں گا، پٹرول پمپ اور ہوٹلوں پر کام کروں گا، ٹیکسی چلاؤں گا۔ سامان لوڈ، ان لوڈ کروں گا سو بسم اللہ لیکن وہاں مجھے عدم تحفظ کا احساس تو نہیں ہو گا مجھے بخاری ہونے کے باعث قابل گردن زدنی قرار تو نہیں دیا جائے گا، میں بھی اپنے جونیئر کی طرح کسی اندھی گولی کا شکار تو نہیں بنوں گا...... ہاں جہاں تحفظ نہ ہو، عزت نفس کی ضمانت نہ ہو...... جہاں زیادتی سے بچنے کے لیے جیب میں پریس کارڈ رکھ کر باہر نکلنا پڑے اور جہاں زندہ رہنے کے لیے کسی بااختیار شخص کو دوست رکھنا پڑے وہ جگہ حساس لوگوں کے رہنے کے قابل کہاں ہوتی ہے؟

پنجاب یونیورسٹی کے ایک نمبر ہاسٹل میں جب حافظ عطاء الرحمن اپنا سامان پیک کر رہا تھا تو میں نے اسے ٹوک کر کہا، ایک دانشور پولیس جیسے ان پڑھ محکمے میں ایڈجسٹ ہو جائے گا؟ ہاں اس نے کولہوں پر ہاتھ جمائے اور سیدھا کھڑا ہو کر بولا ہاں، تم نے شاید وہ کہانی نہیں سنی جب شہر میں قتل عام ہو رہا تھا تو بہت سے شہری اپنی اپنی جانیں بچانے کے لیے جلادوں میں شامل ہو گئے! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے اگر میں پولیس میں شامل نہ ہوا تو کسی دن کسی بھی قاتل کا پھندا میری گردن پر کس دیا جائے گا یا مجھے 'پولیس مقابلے' میں مار دیا جائے گا۔

کھاریاں کا وہ اسسٹنٹ کمشنر جو رات بھر شراب پیتا رہا اور جب مدہوشی میں اس نے مغلظات بکنی شروع کر دی اور ایک تازہ مجسٹریٹ کے ٹوکنے پر اس نے پلیٹ میں قے کر دی تو میں اٹھ کر باہر کھلی فضا میں آ گیا وہاں چاند تھا، ہوا تھی اور ایک اذیت ناک خاموشی تھی وہاں کھڑے کھڑے میں نے خود سے پوچھا یہ شخص صبح اٹھ کر جب شرابیوں، زانیوں اور اخلاق باختہ مجرموں کو سزا سنائے گا تو کیا اس کا ضمیر ملامت نہیں کرے گا؟

''نہیں'' کہیں میرے اندر سے آواز آئی اور جب ایک روز میں نے اس سے یہی سوال کیا تو اس نے جمائی لے کر کہا شراب اور لڑکی میری ہابی ہے اور مجرموں کو سزا سنانا میری ذمہ داری اچھا مسلمان ہابی اور ذمہ داری میں توازن رکھتا ہے اور ساتھ ہی اس نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور مجھے یوں لگا جیسے میرا معدہ میرے حلق کی طرف اٹھ رہا ہے۔ میں کھلی فضا کی تلاش میں اس کے دفتر سے باہر آ گیا۔

اور میرا وہ دوست جو نائب تحصیلدار بننے کے لیے پروفیسری کو ''ٹھڈا'' مار کر آ گیا تھا۔ جب مجھے ملنے آیا تو بہت خوش تھا آخر وہ خوش کیوں نہ ہوتا اس کے گیراج میں ''زیرو میٹر'' گاڑی کھڑی تھی، شہر کے سب سے اونچے گھرانے میں اس کی شادی ہوئی تھی، گھر اپنا تھا، خرچ کرنے کے لیے نوٹ ہی نوٹ تھے بس اللہ تعالیٰ کا فضل ہی فضل تھا اور وہ جب اٹھ کر جانے لگا تو گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبا کر بولا تم یقین کرو اگر میں ''شاہ جی'' کے پاؤں نہ پکڑتا تو آج کسی دور افتادہ شہر کے دیہاتی کالج میں نالائق اور بدتمیز بچوں کو انگریزی سکھانے کی کوشش کر رہا ہوتا، ویگن پر کالج جاتا اور پیدل واپس آتا، سال میں ایک بار کپڑے سلواتا اور بندروں کی طرح بھنے چنے کھا کر زندگی بسر کرتا لیکن اب اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے۔

اور وہ سیاستدان جو مجھے تنہائی میں گھسیٹ کر لے گیا اور بولا ''مجھے بتاؤ اگر میں پارٹی بدل لوں تو کیا مجھے وزارت مل جائے گی؟'' اور میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا ''چوہدری صاحب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اربوں روپے دے رکھے ہیں، تین لاکھ لوگ آپ کے ووٹر ہیں آپ کی عزت ہے نیک نامی اور شہرت ہے پھر اس حماقت کی کیا ضرورت ہے۔'' تو وہ مسکرا کر بولا ''چوہدری صاحب جو نشہ اقتدار میں ہے وہ کسی دوسری چیز میں نہیں آپ کبھی وزیر بنے ہوتے تو آپ کو پتہ ہوتا؟''

اور بیکن ہاؤس کا وہ ننھا سا بچہ جس نے کتابوں کی دکان پر اپنی ماں کا پلو کھینچ کر انگریزی میں پوچھا یہ بوڑھا کون ہے؟ تو ماں نے تصویر پر ایک نگاہ غلط ڈال کر سرگوشی میں کہا قائداعظم! تو بچے نے حیرت سے کہا، یہ کیا ہوتا ہے؟ ماں نے ہاتھ میں پکڑے فیشن میگزین پر نظریں جمائے جمائے کہا، یہ پاکستان کا ابراہیم لنکن ہے، ''او، یس'' بچے کے منہ سے سسکی سی نکلی...... اور میرے دوست کا وہ بچہ جس کے سامنے جب تک ففٹی نائن نہ کہا جائے اسے انسٹھ کی سمجھ نہیں آتی...... اور سی ایس ایس کے لیے انٹرویو دینے والا وہ نوجوان جس کا دعویٰ تھا پاکستان محمد علی کلے نے بنایا تھا۔

اور میرے دوست کی ٹریول ایجنسی پر آنے والے وہ سینکڑوں لوگ جن کی آخری خواہش اس ملک سے فرار ہوتا ہے اور جو نوٹوں سے جیب بھر کر آتے ہیں اور خواب لے کر خالی ہاتھ واپس چلے جاتے ہیں اور جب میرے دوست نے مجھے آنکھ مار کر کہا تھا پاکستان میں دنیا کا سب سے آسان اور منافع بخش کاروبار لوگوں کو باہر بھجوانا ہے تم صرف اعلان کرو اور کروڑوں روپے کما لو۔

اور جب میں اپنے منشی بھائی کی جان بچانے کے لیے اسے یورپ جانے والے جہاز میں بٹھا رہا تھا

تو مجھے یقین آ گیا واقعی لکھنؤ کے نواب اپنے بچوں کو تہذیب سکھانے کے لیے طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجا کرتے تھے...... اور میرے والد جو اپنے پوتے کو اس لیے کسی اعلیٰ انگریزی سکول میں داخل کرانا چاہتے ہیں کہ ملک پر حکومت کرنے والے زیادہ تر لوگ انگریزی سکولوں کے پڑھے ہوتے ہیں۔

ہاں میں گولڈن جوبلی منانے لگا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں صدیوں کے جامد اور بدبودار پانی کی کائی پر کھڑا ہوں اور میرے آگے پیچھے تعفن کے ڈھیر لگے ہیں...... اور سرانڈ میرے دماغ کے سارے مثبت خیالات چاٹ چکی ہے۔

ہاں میں نے سوچا جس زمین کے ساتھ باسیوں کا کوئی رشتہ نہ ہو وہاں اجنبی بستے ہیں اور اجنبی جشن نہیں منایا کرتے۔

آپ نے کبھی خانہ بدوشوں کو گولڈن جوبلی مناتے دیکھا ہے؟

بے گناہ

میں ان دنوں بے روزگار تھا، پنجاب کی ایک بڑی جیل کی آفیسرز کالونی میں اپنے ایک دوست کے پاس رہتا تھا، میرا دوست اس جیل کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھا، انہی دنوں جیلوں پر کام کرنے والی ایک این جی او کو قیدیوں کی اخلاقی، ذہنی اور جذباتی زندگی پر تفصیلی رپورٹ کی ضرورت پڑی تو میرے دوست نے یہ پراجیکٹ مجھے لے دیا یوں مجھے جیل کی دنیا میں داخل ہونے اور وہاں بسنے والی ''مخلوق'' کے قریبی مشاہدے کا موقع ملا۔ میں وہاں ایک ماہ تک کام کرتا رہا، اس دوران جہاں مجھے مسجد سے جوتے چرانے والے ''پیشہ ور'' مجرموں سے ملاقات کا موقع ملا وہاں میں نے پندرہ پندرہ افراد کے قاتلوں سے بھی گفتگو کی، میں ان ۳۰ دنوں کو اپنی زندگی کے قیمتی ترین دن سمجھتا ہوں کیونکہ مجھے پہلی بار معلوم ہوا، پاکستان یا کم از کم پنجاب میں ہر قسم کے جرائم جولاہے، موچی، نائی، مصلی اور تیلی کرتے ہیں، کوئی فیوڈل لارڈ، مل اونر، سیاستدان، تاجر، بڑا مذہبی راہنما اور اعلیٰ سرکاری افسر کبھی کسی عدالت سے سزا پا کر جیل نہیں آیا، یقین فرمایئے مجھے ان تین ہزار قیدیوں میں اپر کلاس کا ایک بھی ''نمائندہ'' نہیں ملا، بی کلاس کے ایریئے میں چند ایک لوگ تھے لیکن وہ ابھی ملزم تھے ان میں سے کسی کا جرم ثابت نہیں ہوا تھا۔

ایک رات میں نے اپنا یہ تجزیہ اپنے دوست کے سامنے رکھا تو اس نے مسکرا کر کہا ''صرف یہ نہیں بلکہ تمہیں پاکستان کی کسی جیل میں بالائی طبقے کا کوئی شخص نہیں ملے گا'' میں نے وجہ دریافت کی تو اس نے تاش کے پتے پھینٹتے پھینٹتے جواب دیا۔ ''وجہ صاف ظاہر ہے ہمارے طبقۂ اشرافیہ کے لوگ جرم کے بعد تھانے میں کچھ دے دلا کر فارغ ہو جاتے ہیں، اپنی جگہ کوئی کمی، کوئی کارندہ پولیس کو پیش کر دیتے ہیں، ججوں سے رابطے کر لیتے ہیں اگر وہاں تک کوئی ترکیب کارگر نہ ہو تو دس بیس لاکھ روپے میں چوٹی کا وکیل کر لیتے ہیں، اگر یہ کمال بھی کام نہ آئے تو گواہوں کو خریدنا، شہادتیں ضائع کرنا اور متاثرہ پارٹی کو دھمکیوں اور برائیف کیسوں سے متاثر کرنا کہاں مشکل ہے لیکن اگر کبھی ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود کسی بڑے شخص کو سزا ہو جائے تو پھر سیاسی اثر و رسوخ کی مدد سے پھانسی کو عمر قید اور عمر قید کو قبل از وقت رہائی میں بدلنا تو ہرگز مشکل نہیں لہٰذا تمہیں پاکستانی جیلوں کی تاریخ میں ذوالفقار علی بھٹو (اب شیخ رشید کو بھی اس میں شامل کر لیں) کے سوا اپر کلاس کا کوئی نمائندہ

سزا کا شائبہ نظر نہیں آئے گا۔''

میرے دوست کی بات بڑی ہی لاجیکل تھی لہٰذا میں نے فوراً فائل کھولی اور اس کے پہلے صفحے پر یہ لکھ کر کہ "پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کوئی بڑا شخص کوئی جرم نہیں کرتا۔" رپورٹ اس کے حوالے کر دی، آنے والے دنوں میں مجھے این جی او کی طرف سے چیک بھی مل گیا لیکن یقین جانئے اس روز سے آج تک کوئی دن، کوئی رات ایسی نہیں گزری، جب مجھے ایک آدھ منٹ کے لیے ہی سہی اس جیل کے وہ قیدی یاد نہ آئے ہوں جو ان قلعہ نما دیواروں، ان ٹھنڈی بیرکوں اور ان مہیب کال کوٹھڑیوں میں اپنے گناہوں، اپنے جرموں کی بجائے اپنی غربت، اپنی کمزور سماجی پوزیشن اور اپنے ناقابل ذکر شجرہ نسب کی سزا بھگت رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا یہ لوگ بے گناہ ہیں، یہ لوگ واقعی مجرم ہیں، انہیں اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے، قیدیوں کو قید کاٹنی چاہیے، کوڑوں والوں کو ٹکٹکی کا ذائقہ چکھنا چاہیے اور پھانسی والوں کو پھانسی گھاٹ پر پہنچنا چاہیے لیکن آپ ان لوگوں کو تو کھلا چھوڑ دیں جو انسانوں کو اپنے ڈیروں پر کتوں کی طرح باندھتے ہیں، زمین میں گاڑ دیتے ہیں، پہاڑوں سے دھکے دے دیتے ہیں، بھٹوں کی چمنیوں میں پھینک دیتے ہیں، بھٹیوں میں پگھلا دیتے ہیں، جو انسانوں کو تلوے چاٹنے اور بول و براز پینے پر مجبور کر دیتے ہیں جو ۴۴۳ کی قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود ملک کے ۱۳۹ ارب روپے کھا جاتے ہیں، جو ہر سال ۹ ارب روپے کی غیر ملکی شراب پیتے ہیں، جو ۲۵ ارب روپے جوئے میں ہار جاتے ہیں، جو منشیات کے ۴۰ ہزار اڈوں کے مالک ہیں، جو ہر ماہ چالیس، پچاس کروڑ جگا ٹیکس وصول کرتے ہیں، جو آبروئیں لوٹتے ہیں، جو قبضے کرتے ہیں، جو ننگی خواتین کا مارچ کراتے ہیں، جو تھانے خریدتے اور چوکیاں بیچتے ہیں، جو بم رکھواتے اور طیارے تباہ کر دیتے ہیں لیکن مسجدوں سے جوتے چرانے، ڈنگر کھولنے، ہیروئن کی ایک پڑیا خریدنے، چند ہزار کا فراڈ کرنے، کسی گھر سے ریڈیو ٹی وی چوری کرنے یا اشتعال میں آ کر کسی کو قتل کر دینے والوں کو جیل میں محبوس کر دیں، ان سے چکیاں پسوائیں، انہیں کوڑے لگائیں، انہیں پھانسیاں چڑھائیں، یہ ظلم نہیں، کیا یہ زیادتی نہیں؟

مجھے کوئی اعتراض نہیں کراچی کی ملٹری کورٹس ببلی کو پھانسی چڑھا دیں یا بابر لودھی کو سزائے موت سنا دیں تو صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کم از کم آج کے منصف تو یہ دیکھیں کہ کہیں ان کی ساری مہارتیں بھی انہی لوگوں پر تو صرف نہیں ہو رہیں جو غربت کے باعث قانون کے شکنجے میں آ گئے تھے، جن کے پیچھے بھی اگر حسب نسب کی مضبوط فصیل ہوتی، جن کا بھی اگر کوئی حلقہ، کوئی جاگیر، کوئی مل، کوئی بزنس یا کوئی پارٹی ہوتی تو وہ بھی عینک لگا کر لندن میں بیٹھے ہوتے، اسمبلی میں ڈیسک بجا رہے ہوتے یا گھومنے والی کرسیوں پر جھول رہے ہوتے، میری تو بس اتنی درخواست ہے اس ملک میں کم از کم ایک تو ایسی عدالت ہو جو کسی ایک اصلی ظالم کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دے، اس کلاس کے چند ایک لوگوں کا حساب بے باق کر دے جو پچھلے پچاس برس سے ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر پھر رہی ہے جس کی وجہ سے محمد رفیع، ببلی بن رہے ہیں اور جس کے اشارے پر اشرف،

چاکر بن کر پھانسیوں پر جھول جاتے ہیں، اگر یہ ممکن نہیں، اگر پاکستان کے سارے ادارے ساری قوتیں ہی مجبور ہیں تو پھر کوئی ایک شخص ہی ایسا ہو جو انصاف کی کتاب پر کم از کم یہ فقرہ ہی لکھ دے۔

"پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کوئی بڑا شخص کوئی جرم نہیں کرتا۔"

مولوی ڈُلا

میں جب بھی سنتا ہوں اسلام اور معاشرے کے درمیان جاہل ملا کھڑا ہے، مولوی کی موجودگی میں ذہنی وسعت ممکن نہیں، ہم مولوی کو بدلے بغیر ترقی نہیں کر سکتے، تو مجھے بے اختیار مولوی دلا یاد آ جاتا ہے۔

مولوی دلا جب پیدا ہوا تو دائی کی غفلت سے اس کے سر پر پلنگ کا پایہ لگ گیا، چوٹ شدید تھی، لہٰذا اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا، اس کے والد چودھری شریف نے فوراً گاڑی منگوائی اور ''دلے'' کو سرکاری ہسپتال لے گئے، جہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ ٹیکے لگائے گئے، بوتلیں (گلوکوز) لگائی گئیں، منتیں مرادیں مانگی گئیں، دلے کی دادی بھاگ کر ''شاہ دولہ'' کی درگاہ پر ''بت'' بھی چڑھا آئی، خالہ نے بھی گاؤں کے بڑے مولوی صاحب سے تعویذ لکھوا کر کسی کے ذریعے ہسپتال پہنچا دیا۔ یہ ساری کوششیں کارگر ثابت ہوئیں، دلے کی جان بچ گئی، تاہم ڈاکٹروں نے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید دلا بڑا ہو کر نارمل بچوں جیسی زندگی نہ گزار سکے۔

یہ سن کر چودھری شریف اور اس کی بیوی کو دکھ تو بہت ہوا، لیکن دلے کی جان بچنے کی خوشی اس پر حاوی رہی۔

اگلے چند برسوں میں ڈاکٹروں کے خدشات درست نکلے۔ دلا واقعی ایک ابنارمل بچہ ثابت ہوا۔ اس نے آٹھ برس کی عمر میں بولنا شروع کیا۔ دس برس کا ہو کر اسے راستوں کی تمیز ہوئی اور بارہ تیرہ سال کی عمر تک پہنچ کر اسے سیدھا چلنے کا ڈھنگ آیا، لیکن زندگی گزارنے کے لیے اتنی ''مہارت'' کافی نہیں تھی، لہٰذا چودھری شریف اور ان کی دیہی بیوی اپنے بڑے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں پریشان رہنے لگے۔ اسی پریشانی میں انہوں نے ایک روز اپنے پیر ''شاہ جیونہ'' سے بات کی۔ شاہ جی نے سارا قصہ سن کر ''مراقبہ'' کیا، اللہ ہو کا نعرہ لگایا اور پھر چودھری شریف کے کندھے پر تھپکی دے کر بولے: ''چودھری مبارک ہو، تمہارا یہ پتر تمہاری سات پیڑھیوں (پشتوں) کی بخشش کا بندوبست کرے گا۔'' چودھری شریف کے چہرے سے خوشی کی لہر سی گزر گئی۔ شاہ جیونہ نے چند لمحوں تک توقف کیا اور پھر اپنی آواز میں جلال بھر کر بولے: ''شریف اس بچے کو میری درگاہ پر چھوڑ جاؤ، ہم اسے دینی علم سکھائیں گے، اس نے بڑے کام کرنے ہیں۔''

قصہ مختصر آدھ گھنٹے کی حیل و حجت کے بعد جب چودھری شریف اور ان کی بیوی آنکھیں پونچھتے ہوئے شاہ جی کے تکیے سے نکلے تو دلا ان کے ساتھ نہیں تھا۔

شاہ جی نے تکیے کے ساتھ ایک ''درس'' بنا رکھا تھا، جس میں دو اڑھائی سو طالب علم پڑھتے تھے، ولا بھی ان میں سے ایک تھا، درس گاہ میں قرآن مجید کی ناظرہ تعلیم کے علاوہ قرب و جوار کے دیہات سے لنگر کے لیے راشن جمع کرنا، گھر گھر جا کر طالب علموں کے لیے پرانے کپڑے اکٹھے کرنا، شام کو گاؤں سے روٹیاں مانگ کر لانا اور استاد کے غسل کے لیے کنویں سے پانی کھینچنا ولے کی ذمہ داری تھی، جو اس نے نہایت خشوع و خضوع سے گیارہ برس تک نبھائی۔ اس طویل عرصے میں اس نے قرآن مجید حفظ کیا، عام روز مرہ کے مسئلے مسائل سیکھے، جنت اور دوزخ کے احوال پر ساڑھے چار گھنٹے کی تقریر پکائی (زبانی یاد کی)، لوگوں کو چندہ دینے پر ابھارنے کے لیے وعظ تیار کیا اور قرآنی واقعات پر ایک طویل ''خطبہ'' ذہن نشین کیا۔

ٹھیک ۲۵ برس کی عمر میں اس کو ''سند'' مل گئی۔ اب وہ مولانا عبداللہ تھا، لیکن کیونکہ عوام الناس میں وہ ''ولے'' کے نام سے زیادہ مشہور تھا، لہٰذا لوگوں نے اس کے نام کے ساتھ ''مولوی'' جوڑ کر حسب توفیق اس کی عزت افزائی شروع کر دی۔ ایک آدھ برس کی ''بیروزگاری'' کے بعد اسے تھوڑی بہت کدو کاوش سے ایک گاؤں کی مسجد ''مل'' گئی۔ یوں اسے تیرہ چودہ برس کا سیکھا ہوا علم پھیلانے کا موقع مل گیا۔ ویسے تو اسے ''پرفارمنس'' کے دوران کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا کرنا نہیں پڑتا تھا، لیکن مہینے کا ایک آدھ دن (جب اسے مرگی کا دورہ پڑتا) اس پر بڑا کڑا گزرتا لیکن بہر حال وہ اپنی اس خامی پر بھی آہستہ آہستہ قابو پا گیا۔

مولوی ولے کا فیوچر بڑا برائٹ تھا، کیونکہ اس نے اپنے پیدائشی نقائص کے باوجود اگلے ایک سال میں نہ صرف اپنی تقریر چھ گھنٹے تک پھیلا لی، بلکہ دن رات کی محنت سے اب وہ اختلافی مسائل پر بھی چھوٹے موٹے مولوی کو منہ توڑ جواب دینے کے قابل ہو چکا تھا، لیکن بدقسمتی ملاحظہ کیجیے حاسدین کو اس کی یہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ایک آنکھ نہ بھائی، لہٰذا انہوں نے ایک سازش کے ذریعے مولوی ولے کو ایک ''اخلاقی جرم'' میں اندر کرا دیا (کم از کم مولوی ولے کا یہی موقف ہے) مقدمہ چلا، مولوی ولے کا وکیل ہار گیا، حاسدین کا تگڑا وکیل جیت گیا اور یوں ولے کو تین سال قید ہو گئی یہ مولوی ولا اب پنجاب کی ایک جیل میں نصف قید کاٹ چکا ہے۔

میں نے ایک روز ولے سے پوچھا: ''یار مولوی تم لوگ عام آدمی کو خدا سے اتنا کیوں ڈراتے ہو۔''

مولوی نے قہقہہ لگا کر کہا: ''اگر ہم ان لوگوں کو خدا سے نہ ڈرائیں تو یہ ہمارے قابو کہاں آئیں۔''

میں نے مسکرا کر کہا: ''لیکن یار یہ زیادتی نہیں؟'' مولوی سنجیدہ ہو گیا، چند لمحوں تک اوپر چھت کی طرف دیکھتا رہا پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا: ''جس بچے نے ٹکر جمع کر کے قرآن مجید پڑھا ہو، جسے تم اوئے مولوی کہہ کر پکارتے ہو، جسے تم کرکٹ میچ تک نہ دیکھنے دیتے ہو، جو تم لوگوں میں بیٹھ کر ڈائجسٹ نہ پڑھ سکتا ہو، ٹی وی نہ دیکھ سکتا ہو، ریڈیو نہ سن سکتا ہو، جو بازار میں گھوم نہ سکتا ہو، جو پتلون نہ پہن سکتا ہو، جو دھوپ کا چشمہ نہ لگا سکتا ہو، تم اس سے توقع کرتے ہو وہ تم سے بدلہ نہیں لے گا، تمہارے ساتھ میانہ روی برتے گا، تم لوگ بے وقوف نہیں ہو؟'' مجھے مولوی ولے کی بات میں وزن محسوس ہوا: میں نے اسے مزید کریدنے کے لیے پوچھا ''پر یار یہ

تو منفی رجحان ہے۔'' مولوی نے ہاں میں گردن ہلائی: ''ہاں ہے، پر ہم کیا کریں؟ ہماری محرومیاں ہمیں زندگی کے کسی دوسرے رخ پر سوچنے ہی نہیں دیتیں، میرے سامنے ایک واقعہ پیش آیا، چند لوگوں نے ریلوے پھاٹک کے چوکیدار سے گالی گلوچ کی، چوکیدار چڑ گیا، اس نے پھاٹک بند کیا اور چابی پل سے نیچے گرا دی، ساری ٹریفک بلاک ہوگئی، لوگوں نے لعن طعن کی تو وہ بڑے اطمینان سے بولا، صاحب چابی ہاتھ سے کھسک کر نیچے گرگئی، معافی چاہتا ہوں، اب بتاؤ لوگ اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے، بالکل یہی صورتحال مولوی کی ہے۔ تم لوگ اسے نفسیاتی، سماجی اور معاشرتی طور پر محروم رکھو گے، تو وہ بھی اپنا پھاٹک بند کر کے چابی گم کر دے گا، یا پھر اپنی مرضی کے لوگوں کو آنے جانے کا موقع دے گا۔''

''پر یار یہ تو بڑی خوفناک صورتحال ہے۔'' میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا: ''بالکل ہے۔'' وہ فوراً چلایا۔ ''بالکل ہے جب تم معاشرے کے سب سے مضبوط فریق کو، جس کے بغیر تم مردے تک دفن نہیں کر سکتے، جدید تعلیم سے محروم رکھو گے تو تم پر اس سے کہیں زیادہ بربادی آئے گی، تم مجھے دیکھو میرے دوسرے بہن بھائی انجینئر ہیں، ڈاکٹر اور وکیل ہیں، لیکن کیونکہ میں ذہنی طور پر ابنارمل تھا، لہٰذا میرے والدین نے مجھے ''درس'' میں جمع کرا دیا، جہاں سے میں معاشرے کے لیے مذہب لے کر آیا۔ اب مجھے ایمانداری سے بتاؤ کیا تم ایک ابنارمل شخص سے آپریشن کرا لو گے، ایک کند ذہن کو انجینئرنگ کی ڈگری دے دو گے، ایک معذور انسان کو جہاز کا کپتان بنا دو گے؟ نہیں لیکن تم ایک ایسے شخص کو بطور مذہبی رہنما ضرور قبول کر لو گے جو سکول میں چل نہ سکا، جو یتیمی یا کسی دوسری معاشی، معاشرتی اور جسمانی مجبوری کے باعث ''درس'' میں داخل ہو گیا جو سر پر ٹوپی رکھ کر مسجدوں میں آبیٹھا تم خود فیصلہ کرو ایسا شخص مسجد میں بیٹھ کر رنی رٹائی تقریروں کے ذریعے تم میں خوف نہیں پھیلائے گا تو کیا کرے گا.....''

میں نے پوچھا: ''یار مولوی اس کا کوئی حل ہے؟''

ہاں ہے۔ وہ بڑے برسان سے بولا: ''تم لوگ میڈیکل کالجوں اور انجینئرنگ یونیورسٹیوں کے طالب علموں کی طرح اپنا بہترین دماغ مدرسوں میں بھیجو، درسوں میں مولویوں کی جگہ پروفیسر تعینات کرو، معاشرے میں عالم کا مقام بحال کرو، اوئے مولوی کلچر ختم کرو۔''

میں جب بھی سنتا ہوں اسلام اور معاشرے کے درمیان جاہل ملا کھڑا ہے، مولوی کی موجودگی میں ذہنی وسعت ممکن نہیں، ہم مولوی کو بدلے بغیر ترقی نہیں کر سکتے تو مجھے بے اختیار ''مولوی دلا'' یاد آ جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں۔ ۱۴ کروڑ لوگوں کی جس اسلامی نظریاتی ریاست میں صرف ۱۳ پی ایچ ڈی عالم دین ہوں، جس کے ۹۰ فیصد مولانا جدید تعلیم سے بے بہرہ ہوں، جس میں معذور بچے دین کے رکھوالے ہوں، اس ملک میں اسلام اور معاشرے کے درمیان مولوی دلے نہ کھڑے ہوں تو کون کھڑا ہو۔

سوال یہ نہیں کہ مولوی نے ہمیں کیا دیا، سوال یہ ہے ہم نے مولوی کیا دیا۔

موہنجوداڑو کے کلرک

شہر سے باہر پتھر کی اونچی چوکیوں پر درجنوں چکیاں تھیں اور ان چکیوں کے سامنے غلاموں کی طویل بیرکیں تھیں۔

گائیڈ نے پراسرار انداز سے شکستہ دیواروں اور گری چھتوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہاں ان بیرکوں میں آٹا پیسنے والے غلام رہتے تھے، ہر صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کوڑا بردار سپاہی ان بیرکوں میں داخل ہوتے اور انہیں اٹھا کر چکیوں کے سامنے پٹخ دیتے جہاں یہ لوگ رات گئے تک چکی کا ہینڈل گھماتے رہتے اور ایک روٹی صبح اور ایک روٹی شام اس طویل مشقت کا معاوضہ پاتے، جسے وہ دو پیالے پانی کے ساتھ نگل جاتے ...... اور جب رات گہری ہو جاتی اور سارے دیئے اندھیروں میں تحلیل ہو جاتے اور تھکن سے چور غلام چکیوں پر گر جاتے تو سپاہی ان کی پشتوں پر کوڑے برساتے جو چیخ اٹھتا، اسے دوبارہ مشقت پر لگا دیا جاتا اور جس کے منہ سے کوئی سسکی نہ نکلتی اسے گھسیٹ کر بیرک میں ڈال دیا جاتا جہاں اس لمحے سیاہ گھور اندھیرے، بول و براز کی سڑاند اور زخموں سے رستی سسکیوں کے سوا کچھ نہ ہوتا ...... یہ صدیوں کی مشقت تھی جس نے ان کے بازوؤں کو حرکت کا اس قدر عادی بنا دیا تھا کہ ان کے ہاتھ نیند میں بھی دائرے میں گھومتے رہتے تھے جبکہ طویل عرصے تک بیٹھے رہنے سے ان کے گھٹنوں کے جوڑ پتھر ہو چکے تھے، پنڈلیاں سوکھ چکی تھیں اور پاؤں بے حس ہو چکے تھے چنانچہ انہیں بیرکوں سے اٹھا کر لایا جاتا اور کام ختم ہونے پر اسی حالت میں واپس رکھ دیا جاتا، یہ عمل مدتوں سے جاری تھا، وہ کون تھے؟ وہ کہاں سے آئے؟ وہ کب سے یہ سب کچھ کر رہے ہیں؟ اور انہیں کس جرم کی سزا مل رہی تھی؟ وہ کچھ نہیں جانتے تھے، وہ جانتے بھی کیسے کیونکہ وہ انہی بیرکوں میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو چکی کے سامنے پایا تھا، وہ چکی کی کھوں کھوں اور کوڑے کی شراپ کے سوا کوئی آواز شناخت نہیں کر سکتے تھے اور وہ روٹی کے سوا کوئی لفظ ادا نہیں کر سکتے تھے۔

یہ لوگ موہنجوداڑوں کے غلام تھے۔

گائیڈ کی آواز شکستہ گلیوں اور بھربھری دیواروں میں جذب ہو گئی تو ہم نے دیکھا ہمارے سامنے ایک شہر پانچ ہزار برس کی خاموشی اوڑھے لیٹا تھا جس کے شکستہ در و بست سے حسرت ٹپکتی تھی اور جس کی گری

چھتوں، نیم ایستادہ دیواروں اور چھوٹی اینٹوں کے فرش سے عبرت رستی تھی اور جس کی گلیوں میں قضا کی آہٹ سنائی دیتی تھی، ''نہ جانے ادھر سے کس عذاب کا گزر ہوا کہ شہر ویران ہو گیا، عمارتیں ڈھے گئیں، تہذیب دفن ہو گئی۔'' ہم سب نے اپنے آپ سے پوچھا لیکن کسی کو کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

ہم سب مختلف ٹھیکریوں پر بیٹھ کر دیر تک اپنی بے بس عقل سے لڑتے رہے۔

جب شام اجڑی گلیوں سے اپنی بکھری کرنیں سمیٹ رہی تھی تو ہم ایک بار پھر غلاموں کی بیرکوں میں داخل ہوئے وہاں ملگجا اندھیرا اور ہڈیوں میں اتر جانے والی خنکی تھی، قریب کھڑے پولش سیاح نے مجھ سے پوچھا ''یہ شہر کیوں برباد ہوا؟'' میں نے ناخن سے بیرک کی دیوار کھرچتے ہوئے جواب دیا ''اس لیے کہ یہاں کے لوگوں کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا اور بے مقصد لوگوں کو زمین زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتی۔''

ہم تہذیب کے اس عظیم قبرستان سے باہر نکلے تو زندہ دور کے سینکڑوں زندہ موہنجو داڑو ہمارے سامنے کھڑے تھے، ایسے موہنجو داڑو جن کا ہر گھر غلاموں کی بیرک تھا اور جس سے سورج کی دستک کے ساتھ ہی لاکھوں غلام باہر آ جاتے ہیں، کوئی پیدل، کوئی سائیکل، کوئی موٹر سائیکل، کوئی بس اور کوئی کار پر چکی کی طرف چل پڑتا ہے اکثریت کی کنپٹیوں پر برف جمی تھی، اکثریت کی کھوپڑی ننگی ہو چکی تھی، اکثریت کی گردن چینڈولم کی طرح ہلتی تھی، اکثریت کے کندھے جھکے تھے، اکثریت کی آنکھوں پر ''کھوپے'' چڑھے تھے، اکثریت کی سانس اکھڑتی، اکثریت کے حلق میں بلغم کا ساز بجتا اور اکثریت کی پیشانی پر شکنوں کا جال تھا...... ان میں سے کچھ ایک سے سولہ گریڈ تک آٹا پیتے ہیں اور کچھ سترہ سے بائیس گریڈ تک، کچھ چکیاں لے کر دوکانوں پر بیٹھے ہیں اور کچھ کارخانوں میں، یہ سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں، یہ سب ایک جیسے ہیں یہ سب بے مقصد، بے حس اور لاتعلق ہیں، یہ سب آٹا پیسنے والے ہیں۔ یہ سب ۲۲ لاکھ نہیں ۱۵ کروڑ ہیں، ان میں خوانچہ فروش، مزدور، کسان، دوکاندار، تاجر، کمیشن ایجنٹ، استاد، مستری، ڈرائیور، کارخانے دار، رکن پارلیمنٹ اور حاکم شامل ہیں۔ یہ سب کلرک ہیں، سب غلاموں کی بیرکوں کے قیدی ہیں، ان میں سے کسی کو خبر نہیں وہ کہاں سے آیا، کب سے یہاں ہے اور یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہے؟ کس کے لیے کر رہا ہے؟ یہ لوگ بیرکوں میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو چکی کے سامنے پایا اور اب یہ روز صبح اٹھ کر چکی پر آ جاتے ہیں اور شام کو چند روٹیاں باندھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔

آپ نے ایسا شخص دیکھا جو کلرک بھرتی ہوا اور صدر بن کر ریٹائر ہوا، نہیں لیکن میں نے دیکھا ہے، جب وہ ''چکی'' سے فارغ ہو کر جا رہا تھا تو نہ صرف اس کے ہاتھ خالی تھے بلکہ روز ناکام کی تلخی بھی اس کے چہرے پر لکھی تھی، جو چند روٹیاں کمائیں آدھی عزیز کھا گئے، آدھی اولاد کو دے دیں اور خود پنشن کو بڑھاپے کی لاٹھی بنا کر راستہ ٹٹولنے لگا...... آپ نے پشاور کا محنت اور مشقت سے بنا یہ شخص تو نہیں دیکھا لیکن آپ نے اس کے وہ ہزاروں لاکھوں بھائی بند ضرور دیکھے ہوں گے جنہیں سوسائٹی ایک خاص عمر پر فارغ کر دیتی ہے، آپ

ان کے پاس بیٹھیں، ان کی محنت، مشقت اور سخت کوشی کی داستانیں سنیں یہ لوگ چراغ کی روشنی میں کیسے پڑھے؟ انہوں نے کیسے چند روپوں سے ترقی کا سفر شروع کیا؟ یہ کیسے ۲۰،۲۰ گھنٹے کام کرتے رہے؟ آپ سنتے جائیں سنتے جائیں اور آخر میں خود سے سوال کریں اس شاندار ماضی کے باوجود آج یہ لوگ معذوری کی زندگی گزار کیوں رہے ہیں، تاریخ ان کے نام تک سے کیوں واقف نہیں، ان کی اولاد انہیں شناخت کرنے سے کیوں انکاری ہے۔ مجھے یقین ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب نہیں ملے گا۔

مجھے موہنجوداڑو سے اٹھتی ٹھنڈی ہوا نے بتایا ''جو لوگ زندگی پر احسان نہیں کرتے وہ چکیاں چلانے والے لوگ ہوتے ہیں، آٹا پیسنے والے لوگ ہوتے ہیں، وہ روٹیاں بونے اور روٹیاں کاٹنے والے لوگ ہوتے ہیں، کلرک ہوتے ہیں، غلام ہوتے ہیں اور بے مقصد لوگوں کو، خود کو زندہ رکھنے کی دوڑ میں لگے لوگوں کو زمین زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا کرتی۔''

مجھے خاموش گلیوں نے بتایا ''جن بستیوں میں اپنی ذات کے لیے محنت کرنے والے لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے انہیں قضا چاٹ جایا کرتی ہے۔'' مجھ سے گری چھتوں اور جھکی دیواروں نے کہا ''جہاں اپنی ہی ذات کے گرد گھومنے والے لوگ رہتے ہوں وہاں بھربھری دیواریں، ٹوٹی چھتیں اور کچی پکی اینٹیں انسانوں سے زیادہ قیمتی ہو جاتی ہیں، وہاں وقت اینٹ اور گارے کی دیواروں کو اگلے دور کے لوگوں کے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔''

مجھ سے پولش سیاح نے پوچھا ''تم لوگ اتنے تھکے ہوئے، چڑچڑے، بیزار اور مردہ دل کیوں ہو۔'' میں نے ناخن سے بیرک کی دیوار کھرچتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے کہ ہمارے سامنے کوئی مقصد نہیں، ہم روٹیاں بونے اور روٹیاں کاٹنے والے لوگ ہیں، ہم ایک کھانے سے دوسرے کھانے کی طرف سفر کرتے ہیں، ہم سب کلرک ہیں، ہم سب موہنجوداڑو کے کلرک۔''

کیریمٹ فارمولا

آئزن ہاور کو کسی مشیر نے بتایا "ایران کا ڈاکٹر مصدق اسلامی دنیا کا ہیرو بن کر ابھر رہا ہے۔" صدر نے گالف کی سٹک کندھے پر رکھی اور پوچھا "کیسے؟"

"اس میں کردار ہے، علم ہے، فراست ہے، وہ دلوں کو مسخر کر دینے والی شخصیت کا مالک ہے اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے مذہب سے مخلص ہے۔" مشیر نے جواب دیا۔

"ہوں" آئزن ہاور نے چند قدم اٹھائے، گیند کے قریب پہنچا، سٹک ہوا میں لہرائی اور زوردار ہٹ لگا کر بولا "تو ڈاکٹر کو بتا دو آئزن ہاور گالف کا کتنا اچھا کھلاڑی ہے۔"

"سر" مشیر نے ہاتھ دل پر رکھا، تھوڑا سا جھک کر سلام کیا اور دور تک سبزے کو روندتا ہوا باہر چلا گیا۔

اگلے روز تھیوڈور اور روز ویلٹ کے شاطر دماغ پوتے کیریمٹ روز ویلٹ کو سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں طلب کر کے "چینج دی ورلڈ" نامی منصوبہ دے دیا گیا، اس نے ایک ملین ڈالر میں ڈاکٹر مصدق کو ہٹا کر تمام اختیارات شاہ ایران کے حوالے کرنے تھے، کیریمٹ نے فائل دیکھی، سگار کا ایک طویل "سوٹا" لگایا اور ٹھہر ٹھہر کر بولا: "ہو جائے گا۔"

اور پھر تاریخ نے دنیا کو ادھر سے ادھر ہوتے دیکھا۔ وہ مصدق جو اسلامی دنیا میں امام کعبہ جتنی عزت و توقیر کا مالک بنتا جا رہا تھا گلیوں میں رسوا ہوا، چوراہوں میں اس کی تصویروں کو جوتوں کے ہار پہنائے گئے، اس کی گاڑی کے پیچھے "اوئے اوئے" کے نعرے لگائے گئے، دیواروں پر "مرگ بر مصدق" کے کلمات لکھے گئے جب کیریمٹ واپس واشنگٹن پہنچا تو "چینج دی ورلڈ" کی فائل پر "دی ورلڈ ہیز چینجڈ" لکھا جا چکا تھا۔ ایئر پورٹ پر خوش آمدید کہنے والے جنرل نے اسے سلیوٹ کر کے پوچھا "سر اب آپ کیا چاہتے ہیں" اس نے بڑھی ہوئی شیو کھجاتے ہوئے جواب دیا "نیند، جسے میں نے پانچ ماہ تک اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔"

دو روز بعد کیریمٹ روز ویلٹ وائٹ ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں آئزن ہاور کو اپنی کامیابی کی داستان سنا رہا تھا، سی آئی اے کا چیف ایلن ڈلس اور اس کا امور خارجہ کا وزیر بھائی فاسٹر ڈلس بھی وہیں موجود تھے۔ جب کیریمٹ شاہ ایران سے اپنی آخری ملاقات پر پہنچا تو اس نے ایک لمبا سانس لیا اور آئزن ہاور کو

مخاطب کر کے بولا:

''جناب صدر میں نے یہ عظیم کارنامہ تو سرانجام دے دیا لیکن میں ایک بات گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ کیا؟'' آئزن ہاور چھری اور کانٹا ایک طرف رکھ کر بولا:

''دنیا کے کسی بھی بڑے آپریشن سے پہلے ہمیں اپنی حدود و قیود کا اندازہ کر لینا چاہیے کیونکہ ہم چاہے کتنے ہی ریسورس فل کیوں نہ ہوں ہم کسی صورتحال سے فائدہ تو اٹھا سکتے ہیں لیکن کوئی صورتحال پیدا نہیں کر سکتے۔ ایرانیوں کے اس ہیرو کو کیریمٹ روز ویلٹ نے نہیں خود ایرانیوں نے مارا خدا کی قسم اگر ایرانی نہ چاہتے تو تہران میں دنیا کا کوئی کیریمٹ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، خواہ آئزن ہاور دنیا کی تمام فوجوں کے ساتھ خود ہی وہاں کیوں نہ چلا جاتا'' ...... اس نے کانٹا اٹھایا اور پورے اطمینان سے پلیٹ پر جھک گیا۔

اور اس کے بعد کیریمٹ کے یہ الفاظ امریکن ڈپلومیسی میں ''کیریمٹ فارمولا'' کے نام سے لکھ دیئے گئے۔

جی ہاں، یہ ۱۹۵۴ء کا واقعہ ہے، جب دوسری جنگ عظیم کے سارے زخم ابھی ہرے تھے، برما کے محاذوں پر توپوں کا نشانہ بننے والے گورے فوجیوں کی بیوائیں لندن، پیرس اور برن میں عصمت فروشی کا دھندا کرتی تھیں، جرمنی کی فیکٹریوں کی چمنیوں میں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ جاپان، ناگاساکی اور ہیرو شیما کے کھنڈرات سے عبرت کی راکھ چن رہا تھا۔ چین افیونچیوں کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ عرب صحرا میں کھوئے اونٹ تلاش کر رہے تھے اور روس اپنے عوام کو قطار بنانے کا آرٹ سکھا رہا تھا۔ جی ہاں، میرے محترم قارئین! اس وقت امریکہ دنیا کے ساٹھ فیصد جی ڈی پی کا مالک تھا۔ اس کی سڑکیں شیشے کی طرح چمکتی تھیں، اس کی عمارتیں آسمان کو بوسہ دیتی تھیں اور اس وقت امریکی صدر صحیح معنوں میں دنیا کا مالک تھا لیکن اس طاقت کے باوجود اس کا شاطر ترین مشیر مسلم ورلڈ کو ایک سو سال پیچھے دھکیلنے کے بعد بڑے دعویٰ سے کہتا ہے،

"We cannot creat a situation we only exploit a situation"

اور پھر دنیا کی سفارتی تاریخ نے گواہی دی، مشرق سے مغرب تک حکمرانی کرنے والا امریکہ سمندری چٹانوں پر کھڑے چھوٹے سے ''کیوبا'' کو فتح نہ کر سکا، صحرا کی ریت میں ہواؤں کے رحم و کرم پر قائم لیبیا کو اپنی پوری طاقت کے باوجود مسخر نہ کر سکا۔ انقلاب کے بعد اپنے تمام تر جبر کے باوجود ایران کو سرنگوں نہ کر سکا اور اپنی ساری عسکری طاقت کے باوجود ویت نام کے نہتے جنگلیوں کو قابو نہ کر سکا اور جب ان تمام فائلوں پر سرخ ربن چڑھانے کا وقت آیا تو ان کے اوپر لکھ دیا گیا۔ ''کیریمٹ فارمولا کے مطابق ہم کوئی صورتحال پیدا نہیں کر سکتے۔''

اور ہاں میرے دوستو! مجھے جب کوئی سیاستدان بتاتا ہے ''بہت جلد تبدیلی آنے والی ہے، امریکہ نے گرین سگنل دے دیا ہے۔'' جب کسی مسجد میں بم دھماکے کے بعد حکمران کہتے ہیں ''یہ سب ''را'' کا کیا دھرا

ہے۔'' ٹرین حادثے کے بعد انکشاف ہوتا ہے'' ملک میں موساد کے ایجنٹ داخل ہو چکے ہیں۔'' اور اندھے قتلوں کے بعد اعلان کیا جاتا ہے'' خاد کے درندے ملک میں آ چکے ہیں۔'' تو مجھے فوراً کیریمٹ روز ویلٹ یاد آ جاتا ہے اور میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کیا دنیا کی کوئی طاقت کسی ملک کو اندر سے کمزور کر سکتی ہے، تو مجھے جواب ملتا ہے'' نہیں'' میں پوچھتا ہوں'' کیوں؟'' تو جواب آتا ہے: '' جس بدن میں صحت مند خون دوڑ رہا ہو، اس پر کبھی وائرس کا حملہ کامیاب نہیں ہوتا لیکن جس چوکھٹ کو دیمک چاٹ چکی ہو، اس کے کواڑ دستک تک برداشت نہیں کرتے۔''

ہاں ملک اندر سے کھوکھلا ہو تو وہ اپنی ہی ذات میں کیریمٹ ہوتا ہے، اسے تباہی کے لیے کسی بیرونی کیریمٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

گوادر

ذوالفقار علی بھٹو جب سربراہ مملکت کی حیثیت سے پہلی بار امریکہ گئے تو صدر نکسن نے اوول آفس کے دروازے پر ان کا استقبال کیا، دونوں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا، مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا، ایک دوسرے کی سمارٹنس کی تعریف ہوئی اور پھر دونوں ون ٹو ون ملاقات کے لیے میٹنگ روم میں چلے گئے۔ دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور نکسن نے گردن باہر نکال کر جذباتی لہجے میں کہا "مسٹر کسنجر اینڈ مسٹر شلسنگر (ہنری کسنجر ان دنوں میں وزیر خارجہ اور جیمز آر شلسنگر وزیر دفاع تھے) کیا آپ میری مدد کریں گے۔" دونوں وزراء اٹھے، اپنی اپنی ٹائیاں درست کیں اور میٹنگ روم میں چلے گئے۔ دروازہ بند ہوا تو پاون منٹ بعد کھلا، بھٹو صاحب باہر آئے تو بہت ڈپریس اور تھکے تھکے تھے۔

اس رات آخری پہر جب پاکستانی سفارتخانے کی سرگرمیاں مدھم پڑ چکی تھیں، زیادہ تر ملازمین آرام کے لیے جا چکے تھے تو ڈائننگ ٹیبل پر صرف بھٹو صاحب، فارن سروس کے چار سینئر اور ایک جونیئر آفیسر رہ گئے۔ بھٹو صاحب نے پاؤں ٹیبل کے نیچے پھیلائے اور ذرا سی ترش روئی سے بولے "یہ احمق امریکی بیل کی عقل لے کر پیدا ہوئے ہیں۔" آفیسرز نے چونک کر اوپر دیکھا، بھٹو صاحب کی آنکھوں میں خلاف معمول تھکن، بیزاری اور کوفت تھی۔ حاضرین سے نسبتاً سینئر نے آہستہ سے پوچھا "اینی پرابلم سر" بھٹو صاحب نے ٹانگیں تہہ کیں، سیدھے ہو کر بیٹھے اور ٹیبل پر مکا مار کر بولے "میں نے نکسن کو آفر دی تم گوادر میں اپنا نیول بیس بنا لو، یہ کبھی مشرق کی کنجی بنے گا، لیکن بزدل روسیوں سے ڈر گیا۔" بھٹو کے یہ فقرے سفارتکاروں پر بم کی طرح پھٹے اور ان کے منہ حیرت سے کھل گئے، بھٹو صاحب تھوڑے سے توقف کے بعد پھر بولے۔ "کسنجر بھی بالکل گدھا ہے، جب شلسنگر نرم ہوا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا، امریکہ پچھلے برس سے (۷۲ء سے) روس کو ایک ایسی حد بندی پر قائل کر رہا ہے جس سے وہ آگے بڑھے اور نہ ہم اسے پار کریں، ان حالات میں اگر ہمارا بحری بیڑا پرشین گلف (خلیج فارس) کے قریب پہنچا تو ایک بڑی جنگ شروع ہو جائے گی۔" بھٹو صاحب ذرا سا رکے اور سامنے پڑے کپ سے کافی کا تلخ گھونٹ بھر کر بولے "لیکن تم لوگ لکھ لو، ان امریکیوں نے آج میری جو آفر ٹھکرائی، انہیں یہ بالآخر قبول کرنا پڑے گی۔" وہ ذرا سے رکے دایاں ہاتھ کھول کر ہوا میں لہرایا اور بولے

''پانچ برس بعد'' پھر کھول کر ہوا میں لہرایا اور بولے ''حد بیس برس بعد امریکی گوادر ضرور آئیں گے۔''

اس گہری ہوتی رات سے ٹھیک چار برس بعد جب ملک میں پی این اے کی تحریک زوروں پر تھی، سڑکوں، گلیوں اور چوراہوں سے ''بھٹو کتا ہائے ہائے'' کی صدائیں اٹھ رہی تھیں تو امریکہ میں پاکستانی سفارتخانے کی ٹیبل کا وہ جونیئر آفیسر جو بھٹو، نکسن ڈیل کا گواہ تھا، فارن آفس کے سب سے سینئر آفیسر کے گھر داخل ہوا، شی کر کے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور اسے باہر لان میں لا کر بولا ''مجھے یقین ہے اب کوئی شخص ہماری گفتگو نہیں سن سکتا۔'' سینئر آفیسر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی بھاری عینک درست کی اور آہستہ سے بولا ''شیور، شیور'' جونیئر آفیسر نے سراسیمگی سے آگے پیچھے دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا ''آغا جی بھٹو روس سے گوادر کا سودا کر چکا ہے، اگر آپ ملک بچا سکتے ہیں تو بچا لیں۔'' سینئر آفیسر پر یہ الفاظ قہر کی طرح ٹوٹے اور چکرا کر بولا ''لیکن اس انفارمیشن کا سورس کیا ہے؟'' جونیئر آفیسر ذرا سا مسکرایا اور پھر عادتاً پتلون کی جیب میں ہاتھ دے کر بولا ''سر اس کا سورس میں خود ہوں، بھٹو نے میرے سامنے روسی سفیر کو بلا کر کہا۔'' آپ اپنے صدر کو مطلع کر دیں، اگر روس مجھے امریکیوں سے بچانے کے لیے ٹرینڈ گارڈز فراہم کر دے تو میں انہیں گرم پانیوں کا خزانہ دے دوں گا۔'' سینئر آفیسر نے ہاتھ باندھ کر بے چینی سے لان کا چکر لگایا اور پھر گلاب کی کیاریوں کے قریب رک کر بولا ''لیکن روسی گارڈز ہی کیوں۔'' جونیئر آفیسر دوبارہ مسکرایا اور بولا ''یہ سوال روسی سفیر نے بھی بھٹو سے کیا تھا۔'' سینئر آفیسر نے چونک کر اوپر دیکھا جونیئر آفیسر نے ایک لمبا سانس لیا اور گویا ہوا ''بھٹو صاحب نے جواب دیا، ''جس طرح سوئٹزر لینڈ کے فوجی روم آ کر پوپ کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح میں بھی چاہتا ہوں، روس میری حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لے، کیونکہ مجھے محسوس ہوتا ہے میں چاروں اطراف سے امریکی ایجنٹوں میں گھر چکا ہوں، یہاں تک کہ اگر کارٹر اشارہ کرے تو شاید میرا باورچی ہی مجھ پر سبزی کاٹنے والی چھری سے حملہ کر دے۔''

اور پھر اس رات جب سارے پہرے دار میٹھی نیند سو رہے تھے وہ سینئر آفیسر غلام اسحاق خان کے گھر گیا، انہیں کھینچ کر لان میں لایا اور ساری واردات ان کے گوش گزار کر دی۔ غلام اسحاق خان وقت ضائع کیے بغیر آرمی چیف ہاؤس گئے اور دیر گئے تک وہاں مصروف رہے۔ اس ملاقات سے ٹھیک ایک ہفتے بعد جنرل ضیاء الحق نے امریکی سفیر کو اپنی رہائش گاہ پر عشائیہ دیا اور لان کے ایک ویران کنج میں اسے ہاتھوں کے اشاروں سے گھنٹہ بھر بریفنگ دیتے رہے۔

۴ جولائی ۱۹۷۷ء کی رات جب وزیراعظم ہاؤس کے ڈائننگ ٹیبل پر جنرل ضیاء الحق کور کمانڈرز کی موجودگی میں ذوالفقار علی بھٹو سے گفتگو کر رہے تھے اور بار باران کے منہ سے ''وی سر، وی سر'' نکل رہا تھا اور بھٹو ''معاملات جلد حل ہو جائیں گے۔'' کی یقین دہانی کرا رہے تھے تو اچانک جنرل ضیاء الحق نے پوری عاجزی سے سینے پر ہاتھ رکھا، تھوڑے سے آگے جھکے اور بولے۔ ''سر وفادار گارڈز کی موجودگی میں نئے گارڈز

کی ضرورت نہیں ہوتی ہم آپ کے خادم ہیں، آپ ہم پر کھلا اعتماد کر سکتے ہیں۔" ذوالفقار علی بھٹو کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اگلی صبح جب پاکستان کے عوام کی آنکھ کھلی تو "وفادار" گارڈز حفاظت کی ذمہ داری سنبھال چکے تھے، اسی روز نئے حکمران نے ایک آرڈر جاری کیا اور فارن آفس کے اس سینئر ترین آفیسر اور غلام اسحاق کی پروموشن ہو گئی، کچھ عرصے بعد ان میں سے ایک وزیر بن گیا اور دوسرا ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا صدر۔ ادھر ٹھیک بیس برس بعد ۱۹۹۳ء میں امریکی قونصل خانہ (کراچی) کا ایک آفیسر گوادر پہنچا اور ٹہلتا ہوا ان چٹانوں پر جا رکا، جہاں سے بندر عباس کی روشنیاں زیادہ دور نہیں تھیں۔ سامنے تانبے جیسا سورج سیاہ فام مچھیروں کی بوسیدہ کشتیوں کی اوٹ میں ڈوب رہا تھا جبکہ پیچھے اسلام آباد میں فارن آفس کا ایک سینئر آفسر امریکی ٹیم کے دورے کا شیڈول تیار کر رہا تھا۔ یکم سے تین تاریخ تک کراچی، تین سے سات تاریخ گوادر، سات سے نو تاریخ تک چٹانوں کا جائزہ، ہوا کے دباؤ کی پیمائش، پانی کے نمونے اور مچھیروں کی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر مفصل رپورٹ، وغیرہ وغیرہ۔

اور اس کے بعد ۹۳ء سے ۹۶ء تک کیا ہوا؟ کون کون گوادر گیا؟ کس کس نے زمین کے ایک ایک انچ کا معائنہ کیا؟ بھٹو کی بیٹی نے سلطان قابوس کی آڑ میں امریکیوں کو کیا کیا سہولیات دیں؟ سلطان قابوس واپس کیوں بھاگ گیا، یہ سب تاریخ کا حصہ ہے، جس پر بحث وقت کا ضیاع ہے کیونکہ اب تو صرف وقت کی دیوار پر لکھی تحریر پڑھنے کا وقت ہے اور دیوار پر لکھا ہے "اگر کوئی گوادر خریدنا چاہتا ہے تو مول لگائے اور لے لے۔"

ہاں تاریخ کے ان بدترین لمحات میں جب ایران امریکہ کے سامنے پورے قد سے کھڑا ہے، چینی بحیرہ ہند میں اتر چکے ہیں، بھارت پاکستان کی سرحدوں پر مہلک ترین میزائل نصب کر چکا ہے اور دنیا کے تمام بڑے جنگی ماہرین پاکستان کو ایک بدترین جنگ میں جلتا دیکھنے کے متمنی ہیں، مجھے محسوس ہوتا ہے، جیسے بھٹو صاحب پاکستانی سفارتخانے کی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہاتھ لہرا لہرا کر کہہ رہے ہیں "امریکہ ضرور گوادر آئے گا، پانچ برس بعد، شاید دس برس بعد، حد بیس برس بعد۔" لیکن ٹھہریئے! شاید بھٹو صاحب آخری بار ہاتھ لہرا کر "پچیس برس بعد" کہنا بھول گئے تھے۔

(نوٹ: میرا یہ کالم ۹ جنوری ۹۸ء کو شائع ہوا جب مسٹر قابس نے پاکستان سے تازہ تازہ رابطے شروع کیے تھے آج جولائی کے وسط تک صورتحال یہ ہے کہ گوادر پر امریکی جھنڈا لہرا رہا ہے، وہ کام جو بھٹو صاحب نہ کر سکے، ان کی بیٹی سرانجام نہ دے سکی، میڈ ان امریکہ معین قریشی سے نہ ہو سکا، وہ نواز شریف نے چار ماہ میں بڑی آسانی سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔)

خربوزے کی چھریوں سے دوستی

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے، جن کا پچا ممبئی میں بیٹھ کر آج تک اس وقت کا انتظار کر رہا ہے، جب وہ پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر پشاور آسکے، جن کی بیویاں ہندو تھیں، جنہوں نے بھارت سے ۱۲ لاکھ کی تھیلیاں لیں، جنہوں نے پاکستان کی مٹی میں دفن ہونا تک پسند نہیں کیا اور جنہوں نے ''پاکستان ازاے فیل سٹیٹ'' کا نعرہ لگایا...... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے مسلم لیگ کو انگریز کی پارٹی کہا، جنہوں نے مسلم لیگ کو کانگریس کی مزاحمت روکنے والی ریت کی بوری کہا، جنہوں نے پاکستان کو انگریزوں کی سازش قرار دیا، جنہوں نے پاکستان کو روس کا دباؤ روکنے کے لئے ترکی سے چین تک انگریزوں کا بنایا قلعہ قرار دیا، جنہوں نے مسلم لیگی رہنماؤں کو ہندوؤں کے بچے کہا...... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے ببانگ دہل کہا تھا: ''سرحد میں مسلم لیگ کی بنیاد انگریز گورنر جارج کننگھم نے ملاؤں کے ذریعے رکھی تھی۔'' جنہوں نے کہا تھا: ''قائداعظم نے سکندر مرزا کے ذریعے سرحد میں فرقہ وارانہ فسادات کرائے تھے۔'' جنہوں نے کہا تھا: ''پاکستان مسلم لیگ نے نہیں انگریزوں نے بنوایا تھا۔'' جنہوں نے کہا تھا: ''قائداعظم کی بغلوں کے نیچے انگریزوں کی بیساکھیاں نہ ہوتیں تو وہ کچھ نہ ہوتے۔'' جنہوں نے کہا تھا: ''انگریزوں نے اپنی بندوق قائداعظم کے کندھے پر رکھ کر چلائی تھی۔''...... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے کہا تھا: ''مسلم لیگ نے ہندوستان نہیں مسلمانوں کو تقسیم کیا۔'' جنہوں نے کہا تھا: ''مسلم لیگ کو ۱۹۴۶ء کا الیکشن انگریزوں نے جتوایا تھا'' جنہوں نے کہا تھا: ''اگر انتخابات میں دھاندلی نہ ہوتی تو پاکستان کبھی نہ بنتا۔'' جنہوں نے کہا تھا: ''مسلم لیگ کے اکابرین کا کوئی دین تھا اور نہ ہی ایمان۔'' جنہوں نے کہا تھا: ''پاکستان...... انگریز اور مسلم لیگ دونوں کا مشترکہ مفاد تھا۔''...... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے کہا تھا: ''مسلم لیگ سرحد کے لیڈر

انسانیت کے دائرے ہی سے خارج ہیں۔" جنہوں نے کہا تھا: "آج پاکستان پر ایسی جماعت (مسلم لیگ) حکمران ہے جس نے آزادی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔" جنہوں نے کہا تھا: "لیاقت علی خان تو پاکستان کی شکل میں ریگستان تک قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلم لیگ پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو چکی تھی، یہ تو انگریزوں نے انہیں تھپکی دے کر کھڑا کیا۔" ......تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے کہا تھا: "انڈین نیشنل کانگریس تمام فرقوں اور مذہبی گروہوں کی نمائندہ جماعت تھی۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلمانوں نے صرف اپنے نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلم لیگ ایک بے بنیاد جماعت ہے۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلمانوں میں کاسہ لیسوں کی کوئی کمی نہیں۔" جنہوں نے کہا تھا: "اگر کانگریس انگریزوں کو للکارتی تو مسلم لیگ کھل کر انگریزوں کا ساتھ دیتی۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلمان رہنماؤں کے ذہن میں پاکستان کا کوئی واضح نقشہ نہیں تھا۔" جنہوں نے کہا تھا: "انگریز ہندوستان میں اسلام کو سیاسی فائدے کے لیے استعمال کرتا رہا۔" جنہوں نے کہا تھا: "انگریز کے اشارے پر دین فروش ملا خدائی خدمت گاروں کے مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔" جنہوں نے کہا تھا: "انگریزوں نے ہی مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنایا۔" ......تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے کہا تھا: "عبدالرب نشتر نے مسجد مہابت خان (پشاور) میں جناح کو گالیاں دیں۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلم لیگ نے ارکان اسمبلی کی حمایت کے لیے ناجائز کاروبار شروع کر دیا۔" جنہوں نے کہا تھا: "قائداعظم ضدی اور بے اصول تھے۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔" جنہوں نے کہا تھا: "ہم مسلم لیگ کی ظاہری شرافت، اسلامی جذبے اور اپنی سادگی سے دھوکہ کھا گئے۔" جنہوں نے کہا تھا: "مملکتوں کے ٹکڑے کرنا اور ان کے حصے بخرے کرنا مسلم لیگیوں ہی کا کام ہے۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلم لیگی نہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے لڑے، کوئی تحریک چلائی اور نہ ہی انگریزوں کا مقابلہ کیا، چنانچہ اگر انگریز نہ ہوتے تو پاکستان نہ ہوتا۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلم لیگ فرقہ وارانہ سیاست کرتی رہی۔" جنہوں نے کہا تھا: "قائداعظم طبعاً اقتدار پرست تھے، اسی لیے انہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے چھوٹی کرسی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔" ......تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جو پاکستان کو اپنا نہیں مسلمانوں کا وطن کہتے ہیں، جو خود کو مسلمان نہیں سیکولر کہتے ہیں، جو اسمبلی کا حلف اٹھاتے ہوئے لفظ پاکستان چھوڑ جاتے ہیں، جو پوری زندگی خود کو گاندھی کہتے رہے، جو روسی ٹینکوں کو پنجاب کے میدانوں میں اترنے کی دعوت دیتے رہے، جو پاکستان کے خلاف کام کرنے والی ہر طاقت کے ساتھی رہے، جو کرکٹ میچ میں بھارت کی شکست پر ساری

بتیاں بجھا دیتے ہیں، جو اپنی نجی محفلوں میں پاکستان کو گالیاں دیتے ہیں...... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جو کارلفٹر تھے، فوج کے بھگوڑے تھے، جو روسی جیپ میں بیٹھ کر جلال آباد چلے گئے، جو روسی کیمپوں میں دہشت گردی کی ٹریننگ لیتے رہے، جو افغانستان سے بموں کے تحفے بھیجتے رہے اور جنہوں نے پاکستان میں سینکڑوں افراد کی ہلاکت پر کہا تھا: ''جب افغانستان میں مجاہدین بھیجیں گے تو آپ کو بھی بموں ہی کے تحفے ملیں گے، گلدستے نہیں۔''...... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جو افغانستان سے بھاگ کر آنے والے پشتونوں کے حسب نسب پر رشک کرتے تھے، جو روسیوں کے خلاف لڑنے والے افغانوں کو غدار کہتے تھے، جو افغان، پختونوں کو رائفلوں کے بٹوں سے مارتے تھے، جو پوری افغان وار کے دوران ''کارمل ولی بھائی بھائی'' کے نعرے لگاتے رہے، جو روسی فوج کو پاکستان پر حملے کے لیے اکساتے رہے اور جو آج بھی کہتے ہیں، ہم پنجاب کے ذریعے پاکستان تڑوائیں گے،...... تو ایسا تو ہوگا!

جی ہاں، جب آپ لکڑی کی حفاظت کی ذمہ داری آگ کو سونپ دیں گے، جب آپ سانپوں کو آستینوں کی گرمائش دیں گے، جب آپ کاغذ کے دستانوں سے سلگتے کوئلے اٹھانے کی کوشش کریں گے، جب آپ کانچ کے فرش پر ہاتھی کا رقص دیکھنے کی خواہش کریں گے...... تو ایسا تو ہوگا!

جی ہاں، چھریوں سے دوستی کرنے والے خربوزے اسی طرح کٹتے ہیں، موم کے موزے پہن کر گھروں سے نکلنے والے لوگ اسی طرح تلوے جلا بیٹھتے ہیں اور پانی پر چلنے کے خواہش مند اسی طرح ڈوبتے ہیں۔

ہاں، ہاں یہ لوگ بھی کتنے بے وقوف ہیں، جنہوں نے بین توڑ دی اور سانپوں کو گلے میں ڈال لیا۔

(نوٹ: اس کالم کے تمام حقائق ولی خان کی کتاب ''حقائق حقائق ہیں۔'' باچا خان کی پرانی تقریروں اور اے این پی کے رہنماؤں کے بیانات سے اخذ کیے گئے اور یہ کالم ۹۸ء میں اے این پی کی مسلم لیگ سے علیحدگی پر لکھا گیا۔)

موٹی

گلی میں کوئی کتا بھونکتا ہے، اندھیرے میں کسی بلی کی آنکھیں چمکتی ہیں یا کوئی پرندہ رزق کی تلاش میں منڈیر پر آبیٹھتا ہے تو مجھے کیتھی یاد آجاتی ہے، نیلی آنکھوں، بھورے بالوں اور سرخ رنگت والی ''چھ فٹی'' کیتھی جس کا بچپن نیو یارک کی افراتفری اور جوانی آسٹریلیا کے نیم گرم ساحلوں پر گزری لیکن جب جذبات کا ''کاروان یوسف'' جسم کے کنعان سے نکل گیا تو وہ اپنے سدا کے ست، کاہل اور بیزار خاوند کے ساتھ اسلام آباد آگئی جہاں شام کو اپنے ریچھ نما جرمن کتے، برازیلی بلی اور آسٹریلین طوطے کو ٹہلانا اس کی ذمہ داری ہوگئی جس سے وہ مسلسل پانچ برس تک عہدہ برآ ہوتی رہی۔ شاید اب بھی اس کا یہی معمول ہو لیکن میں اس کے بارے میں پورے وثوق سے پیشین گوئی نہیں کر سکتا کیونکہ کیتھی کو اسلام آباد چھوڑے چھ دن ہو چکے ہیں۔

کیتھی سے میری ملاقات ایک ''ڈنگر ڈاکٹر'' دوست کے کلینک پر ہوئی، میرا یہ دوست بھی کم دلچسپ انسان نہیں، اس نے ویٹرنری ڈاکٹر کا کورس کیا، سرکاری نوکری کی، سکالرشپ لیا، امریکہ گیا وہاں سے پالتو جانوروں کے مزمن امراض میں سپشلائزیشن کی، امریکیوں سے تھوڑی بہت عقل مت لی، پاکستان آیا اور سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے کر یہاں اسلام آباد میں پالتو جانوروں کی ایک علاج گاہ بنا لی، جہاں صبح سے شام تک غیر ملکی خواتین و حضرات اور ان کے کتوں، بلوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور میرا دوست پاکستان میں رہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے خوب ڈالر سمیٹتا ہے۔ اسے یہ کلینک کھولے بمشکل دو برس ہی ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل اور گوروں کے کتوں کی مہربانی سے وہ آج حاملہ بلیوں کے لیے میٹرنٹی، پلوں کے لیے ایمر جنسی، زکام، کھانسی اور بال جھڑ جیسے مہلک امراض کے شکار کتوں کے لیے ان ڈور اور ذرا متمول غیر ملکیوں کے نازک اندام جانوروں کے لیے وی وی آئی روم بنانے کے قابل ہو چکا ہے۔ انشاء اللہ وہ آنے والی سردیوں میں اس منصوبے پر عملدرآمد شروع کر دے گا۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کیتھی سے میری پہلی ملاقات اس ''ڈنگر ڈاکٹر'' دوست کے کلینک پر ہوئی، کیتھی اپنا جرمن کتا دکھانے آئی تھی اس کا خیال تھا کتا بال جھڑ جیسے مہلک مرض کا شکار ہے کیونکہ وہ جب بھی اسے برش کرتی ہے کتے کے بیسیوں بال برش میں پھنس جاتے ہیں، ڈاکٹر نے مشورہ دیا'' آپ شیمپو استعمال کر کے دیکھیں۔'' کیتھی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا ''سارے

شیمپو استعمال کر چکی ہوں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا'' ڈاکٹر نے پوچھا '' آپ نے انڈوں کی زردی کا تیل لگایا'' کیتھی ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑ کر بولی ''ہاں یہ جتن بھی کر دیکھا لیکن مونٹی (کتے کا نام) ٹھیک نہیں ہوا۔'' '' آپ نے بالوں کا لیبارٹری ٹیسٹ کرایا؟'' ڈاکٹر نے کتے کو گدگدا کر پوچھا جو گز بھر لمبی زبان لٹکائے ہم '' ان کلچرڈ بلیک پیپلز'' کو حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ ''ہاں، ہاں میں نے بالوں کے نمونے امریکہ بھجوائے تھے، ان حرامیوں نے نیگیٹو رپورٹ دے دی۔'' کیتھی نے سلگتے لہجے میں جواب دیا۔ ''پھر تو کتا ٹھیک ہی ہوگا، آپ خوامخواہ پریشان ہیں۔'' میرے دوست نے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ سجا کر کہا، کیتھی کو فوراً غصہ آ گیا اس نے کتے کی زنجیر کو جھٹکا دیا، نفرت سے ڈاکٹر کو گھورا اور چلا کر بولی '' بے وقوف شخص مونٹی تندرست کیسے ہو سکتا ہے میں نے صبح ہی بال گنے تھے برش سے پورے تیرہ بال نکلے، خدا کی پناہ مونٹی کے بال اس طرح گرتے رہے تو یہ تو ایک ہی مہینے میں کوجک بن جائے گا۔'' ڈاکٹر نے فوراً معذرت کی اور لیمپ جلا کر مونٹی پر جھک گیا۔

اس کے بعد میں جب بھی ''ڈنگر ڈاکٹر'' کے کلینک گیا کیتھی کو مونٹی سمیت وہیں پایا، کبھی وہ مونٹی کو بینچ پر بٹھائے، اس کے بالوں میں زیتون کا تیل لگا رہی ہوتی، کبھی اسے آملوں کے عرق سے نہلا رہی ہوتی اور کبھی صندل کی کنگھی سے اس کے بال سنوار رہی ہوتی، کئی بار کے آمنے سامنے سے ہم ایک دوسرے سے شناسا ہو گئے چنانچہ ڈیڑھ دو ماہ بعد جب بات ہیلو ہائے سے مونٹی کی عیادت تک پہنچی تو وہ مجھے ہر ملاقات پر کتے کی بہتر ہوتی صحت کا مژدہ سناتی، صندل کی خوبصورت خوشبودار ڈبیا سے بال نکالتی اور فخر سے دکھا کر کہتی ''دیکھیے آج صرف پانچ بال گرے ہیں، مونٹی اب صحت مند ہو رہا ہے، ایک آدھ ماہ کی مزید مالش سے بال گرنا بند ہو جائیں گے۔'' میں ایک سمجھدار اور با اخلاق شخص کی طرح کتے کی صحت اور کیتھی کی محنت کی داد دیتا جس پر وہ کھل اٹھتی، چھوٹے بچوں کی طرح اچھل اچھل کر تالیاں پیٹتی اور میرے حسن ذوق اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو خوب سراہتی، اس بے تکلفی میں ایک روز انکشاف ہوا صرف مونٹی ہی کیتھی کا ڈارلنگ نہیں، اس کے گھر میں ایک بلی اور ایک آسٹریلین طوطا بھی ہے، میں نے پوچھا '' آپ انہیں ساتھ کیوں نہیں لاتیں؟'' دکھی لہجے میں بولی ''بلی حاملہ ہے اس حالت میں اسے اتنا لمبا سفر کرانا زیادتی ہے، رہا طوطا تو اسے پولن الرجی ہو جاتی ہے یہاں اس شہر میں شہتوت بھی تو بہت ہیں آپ لوگ ان کا صفایا کیوں نہیں کرتے، کیا آپ لوگوں کے طوطے بیمار نہیں ہوتے؟'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''نہیں ہمارے طوطے اس کے عادی ہو چکے ہیں۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا لیکن اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتی مونٹی کو اس کا یوں غیر محرم سے بے تکلف ہونا اچھا نہ لگا لہٰذا اس نے غرا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

واشنگٹن روانگی سے ایک روز قبل مارگلہ روڈ پر اچانک کیتھی سے ملاقات ہو گئی، وہ مونٹی کو ٹہلا رہی تھی، میں نے احوال پوچھا تو وہ اسامہ بن لادن کو گالیاں دینے لگی، میں نے حیرت سے وجہ پوچھی تو غصے سے بولی ''اس کی وجہ سے ہمیں یہاں سے جانا پڑ رہا ہے مونٹی کا علاج بھی مکمل نہیں ہوا، راستے میں اسے کچھ ہو گیا تو، ہی

ازا ے...... ''کیا موتی بھی آپ کے ساتھ جائے گا؟'' میں نے موضوع بدلنے کے لیے پوچھا لیکن میرے یہ الفاظ ماچس کی ڈبیہ پر تیلی کی رگڑ ثابت ہوئے ''تو، تو تمہارا خیال ہے میں موتی، مالی (بلی کا نام) اور جمی (طوطے کا نام) کو اس وحشی کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤں گی کہ وہ آئے اور آ کر انہیں سلاٹر کر دے۔ شوٹ کر دے، وحشی قوم کا وحشی انسان، ہی ازا ے......'' اس روز کیتھی کے اندر بارود بھرا تھا وہ بات بات پر آتش فشاں کی طرح پھٹتی اور لاوے کی طرح بہتی تھی لہٰذا میں نے سلام کر کے کھسکنے ہی میں عافیت جانی۔

اگلے روز کیتھی اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ ڈی سی ۱۰ جہاز میں سوار ہو کر امریکہ چلی گئی، مجھے یقین ہے اس کا موتی مالی اور جمی بھی ان پچاس پالتو جانوروں میں شامل ہوں گے جنہیں حفاظت کے نکتہ نظر سے امریکی سفارتکار ساتھ لے گئے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے وہ بھی دوسرے لاکھوں امریکی جانوروں کی طرح افغانستان اور اسامہ سے ہزاروں میل دور محفوظ ہاتھوں میں ہوں گے لیکن کل نہیں، کل نہیں تین دن پہلے جب خوست سے چند جلی کٹی اور مسخ نعشیں پاکستان پہنچیں اور میں نے ایک ایسا سانس لیتا مردہ دیکھا جس کے جسم پر آبلے اگے تھے تو کیتھی کا موتی میرے سامنے کھڑا ہو گیا میں نے اس سے ان لوگوں کا جرم پوچھا تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا ''کیا یہ جرم کافی نہیں یہ انسان ہیں کتے نہیں، یہ مسلمان ہیں موتی نہیں۔''

وہاں کوئی ٹم نہیں تھا

پچھلے برس اسی موسم میں سان فرانسسکو میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے پورے امریکی معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا، لوگ گھروں کے باہر آ گئے، انتظامیہ چیخ اٹھی اور قانون و انصاف کے ادارے تلافی کے لیے دوڑ پڑے، واقعہ بہت ہی دلچسپ تھا، ایک گھر میں تین "افراد" رہتے تھے، ۳۲ سالہ بل، اس کا آٹھ برس کا بیٹا جم اور ان دونوں کا مشترکہ کتا ٹم، ایک اتوار کو بل اور ٹم (کتا) کرکٹ کھیل رہے تھے، بل شارٹ لگاتا، ٹم بھاگتا ہوا جاتا اور بال منہ میں اٹھا کر لے آتا، بل اسے پھر ٹھوکر مارتا اور ٹم گیند کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوتا، کھیل ہی کھیل میں کسی بات پر ٹم ناراض ہو گیا، اس کی حیوانی خصلت بیدار ہو گئی، اس نے بال کے پیچھے بھاگنے سے انکار کر دیا اور لان میں ایک طرف بیٹھ کر غرانے لگا، اسی اثناء میں ننھا جم گھر میں داخل ہوا اور حسب معمول کتے کو "کس" کرنے کے لیے اس کی طرف بھاگا، ٹم بری طرح چڑا بیٹھا تھا، جوں ہی جم ٹم کے قریب پہنچا، کتے نے چھلانگ لگائی اور اپنے تیز نکیلے دانت جم کے گال پر گاڑ دیئے، بچے نے دلدوز چیخ ماری، بل بلا لے کر فوراً اس کی طرف دوڑا لیکن اس کے پہنچنے تک ٹم جم کا ایک گال چبا چکا تھا، بل آخر باپ تھا، بیٹے کا زخم برداشت نہ کر سکا، ایک ہی لمحے میں اس کی پدرانہ محبت کتے کی انسیت پر غالب آ گئی، اس نے اشتعال میں بلا ہوا میں لہرایا اور ٹم کے سر پر دے مارا، کتے کے منہ سے عف کی آواز نکلی، وہ فرش پر گرا، اس نے ٹانگیں پھیلائیں، چند تیز، تیز سانسیں لیں اور جان دے دی۔

بل کا ہمسایہ باڑ کے پیچھے سے یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس نے فوراً مجاز اتھارٹیز کو فون کیا، ابھی بل بیٹے کے زخم ہی دھو رہا تھا، پولیس موقع واردات پر پہنچ گئی، جائے وقوعہ کی تصاویر لیں، آلہ قتل برآمد کیا، مجرم کے فنگر پرنٹس لیے، زخمی بچے کو ہسپتال داخل کرایا اور بل کو گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا، اگلے روز جب یہ واقعہ اخبارات میں شائع ہوا تو پورا امریکی معاشرہ سراپا احتجاج بن گیا، جانوروں کے حقوق کی تنظیموں نے جلوس نکالے، عوام نے قاتل کو پھانسی چڑھانے کا مطالبہ کیا جبکہ اخبارات نے اس ظلم پر اداریے لکھے، آنے والے دنوں میں یہ احتجاج اتنی بڑی تحریک بن گیا کہ امریکی انتظامیہ سارے کام چھوڑ کر "بل ٹم کیس" نمٹانے میں مصروف ہو گئی، عدالت میں بل اور ٹم کے وکلا نے دلائل کے انبار لگا دیئے، بل کا ذہنی معائنہ کرایا گیا، انسانی جذبات اور

اشتعال کے ماہرین سے رائے لی گئی، گواہوں کے طویل بیانات ریکارڈ ہوئے جس کے بعد جیوری نے بل کو نفسیاتی مریض قرار دے کر معاف کر دیا تاہم اسے باقی زندگی کتوں کے حقوق کے لیے وقف کرنے کی ہدایت کر دی گئی۔

اس سارے کیس کا سب سے خوبصورت پہلو کیلیفورنیا کے ایک اخبار کا وہ سروے تھا جس میں سٹیٹ کے چار لاکھ شہریوں نے حصہ لیا، اخبار کے مطابق سروے میں شریک ۳ لاکھ ۱۶ ہزار ۱۱۳ افراد کا کہنا تھا، وہ اس سانحے کے بعد بے خوابی کا شکار ہو چکے ہیں کیونکہ وہ جونہی آنکھیں بند کرتے ہیں، ان کے تخیل میں ٹم آ جاتا ہے اور اس کی یاسیت سے بھری آنکھیں ان سے سوال کرتی ہیں، میرا جرم تو اتنا خوفناک نہیں تھا، مجھے کیوں مارا گیا، کیا اس ملک میں جانوروں کے لیے لڑنے والا کوئی شخص نہیں بچا؟

جب امریکہ میں بل ٹم کیس چل رہا تھا تو میں نے سان فرانسسکو میں مقیم اپنے ایک دوست سے اس کی تفصیلات منگوائیں، اس نے مہربانی کرتے ہوئے مجھے نہ صرف مقتول ٹم کی تصاویر بھجوا دیں بلکہ ان دلائل کی کاپیاں بھی ارسال کر دیں جو ٹم کے وکیل نے بل کو قاتل ثابت کرنے کے لیے عدالت میں دیے تھے، میں یہ سارا مواد اپنی کتابوں کی الماری میں رکھ کر بھول گیا، آج صبح میں نے سال بعد عراق پر امریکی حملوں کے بارے میں کسی رپورٹ کی تلاش میں الماری کھولی تو آنجہانی ٹم کی تصویر پھسل کر میرے قدموں میں آ گری، میں نے اٹھا کر دیکھا واقعی ایک سال بعد بھی ٹم کی نیم وا آنکھوں میں سینکڑوں سوال تھے، اس کی ڈھلکی ہوئی گردن آج بھی انسانیت کے اجتماعی ضمیر پر ضرب لگا رہی تھی، اس کے حلق سے ٹپکتا لہو آج بھی درد دل رکھنے والوں کے لیے تازیانے کا کام کر رہا تھا، میرے ہونٹوں سے آنجہانی ٹم کے لیے ایک آہ سی نکلی لیکن اس سے قبل کہ یہ آہ ہوا میں تحلیل ہو جاتی ایک خیال برقی رو کی طرح آیا اور میرے ذہن کا سرکٹ ہلا کر چلا گیا، مجھے یاد آیا اسی الماری میں مقتول عراقیوں کی ایسی سینکڑوں تصاویر پڑی ہیں جن کی رگوں سے امریکی بارود نے زندگی اس طرح اڑا دی تھی جس طرح گرم الاؤ پانی کو بھاپ بنا دیتا ہے، ان کتابوں، بوسیدہ رسالوں اور چھپی پرانی ادھوری رپورٹوں تلے عراقی بچوں کی ایسی درجنوں تصویریں دبی ہیں جنہیں گزشتہ آٹھ برسوں میں کھانے کے لیے مناسب خوراک اور چیخیں ضبط کرنے والی درد کش ادویات نہیں ملیں، اسی الماری میں کاغذوں کے نیچے عراق کی ایسی خواتین کی بیسیوں تصویریں دفن ہیں جن کے کٹے پھٹے اعضاء، جن کے جلے بجھے جسم اور جن کے چیختے چلاتے زخموں میں سینکڑوں سوال ہیں، جن کی ڈھلکی گردنیں اجتماعی ضمیر پر ضرب لگاتی ہیں، جن کا ٹپکتا ہوا لہو تازیانہ ہے لیکن ۵۲ امریکی ریاستوں میں ایک بھی ایسی تنظیم نہیں، ایک بھی ایسا اخبار نہیں، انسانوں کا ایک بھی ایسا گروہ نہیں جو ان کے لیے پلے کارڈ اٹھا سکے، جو ان کے لیے نعرے لگا سکے، جو ان کے لیے انصاف طلب کر سکے جو ان کے بل کا مواخذہ کر سکے۔

میں نے ٹم کی نیم وا آنکھوں سے پوچھا۔ ''یار ٹم ۴۸ گھنٹوں میں عراق پر ۲۰۰ حملے ہوئے بی ون

طیاروں سے بغداد کے گھروں اور ہسپتالوں پر دو ہزار بم گرائے گئے، برطانوی جہازوں نے مظلوم، کمزور اور نہتے شہریوں پر ۵ سو کروز میزائل پھینکے، سینکڑوں لوگ مر گئے، سینکڑوں ہی زخمی ہوئے لیکن سان فرانسسکو سے نیویارک تک اور واشنگٹن سے لاس اینجلس تک کسی بھی شخص نے احتجاج نہیں کیا، کسی نے شیم شیم کے نعرے نہیں لگائے، کیوں، آخر کیوں؟'' ٹم نے پلکیں اٹھائیں، اس کی مردہ پتلیوں میں روشنی کوندی، اس کی ڈھلکی گردن میں حرکت پیدا ہوئی، اس نے اپنے پنجے سیدھے کیے اور ایک قہقہہ لگا کر بولا ''اس لیے میرے دوست کہ عراق میں اب تک صرف انسان مرے ہیں کوئی ٹم نہیں مرا، وہاں اب تک مسلمان مارے گئے ہیں کوئی کتا ہلاک نہیں ہوا۔''

کینگرو پھر جنگلے سے باہر تھا

آسٹریلیا کے کسی چڑیا گھر میں کینگرو کا ایک جوڑا رہتا تھا، ایک رات ان میں سے ایک کینگرو کسی خفیہ راستے سے ہوتا ہوا جنگلے سے باہر آ گیا، انتظامیہ کو خبر ہوئی تو وہ معائنے کے لیے موقع واردات پر پہنچ گئی، جنگلے کے دروازے، کنڈی اور تالے کا جائزہ لیا گیا، تینوں صحیح سلامت تھے، جنگلے کی جالی میں بھی کوئی سوراخ نہیں تھا سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے طویل غور و خوض اور لمبی بحث وتمحیص کے بعد جیوری اس نتیجے پر پہنچی کہ کینگرو جنگلے کی دیوار پر پھاند کر باہر نکلا ہے لہٰذا فوری طور پر جالی کی اونچائی بڑھا دی جائے، اسی وقت مستری بلائے گئے جنہوں نے چند ہی گھنٹوں میں جالی دو فٹ اونچی کر دی، اگلے روز منتظمین چڑیا گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کینگرو نہ صرف جنگلے سے باہر نکل چکا ہے بلکہ بنچ پر بیٹھ کر دھوپ سینک رہا ہے، انتظامیہ نے جالی مزید دو فٹ اونچی کر دی لیکن اس اقدام کے بعد کینگرو گیٹ کیپر کے کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر پائپ پیتا پایا گیا، اس روز بھی جالی میں دو فٹ اضافہ کر دیا گیا، اگلے روز انتظامیہ آئی تو کینگرو منیجر کے دفتر کے سامنے اخبار کھول کر بیٹھا تھا اب کینگرو اور انتظامیہ میں ٹھن گئی، وہ روز جالی کی اونچائی میں اضافہ کرتے لیکن وہ اگلے روز کود کر باہر آ جاتا یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ ایک روز انتظامیہ تھک گئی اور دیوار نے بھی مزید اونچا ہونے سے انکار کر دیا، اس وقت کسی نے مشورہ دیا ''آپ لوگ کینگرو ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے'' جناب آپ کو کیا تکلیف ہے آپ روز باہر کیوں تشریف لے آتے ہیں۔'' آئیڈیا شاندار تھا، منتظمین فوراً کینگرو کے حضور حاضر ہو گئے۔ کینگرو نے غور سے ان کی بات سنی اور پھر قہقہہ لگا کر بولا ''حضرات معاف کیجیے گا آپ بھی بڑے ہی چغد ہیں آپ دیوار تو اونچی کر دیتے تھے لیکن جنگلے کا دروازہ کھلا چھوڑ جاتے تھے اور اگر دروازہ کھلا ہو تو بے وقوف سے بے وقوف کینگرو کو بھی دنیا کی کوئی طاقت باہر آنے سے نہیں روک سکتی۔''

پچھلے بائیس ماہ کے ٹریک ریکارڈ سے مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے ہماری حکومت سے بھی منصوبہ بندی کے دوران کوئی نہ کوئی دروازہ کھلا رہ جاتا ہے جس کے نتیجے میں جنگلہ خواہ گولڈن ہینڈ شیک کا ہو یا ملٹری کورٹس کا ہر بار کینگرو بنچ پر دھوپ سینکتا دکھائی دیتا ہے، ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر پائپ پیتا ہوا ملتا ہے یا پھر اخبار کھول کر جناب جمیل الدین عالی کے کالم کے مطالعے میں مستغرق پایا جاتا ہے، آپ میرے دعوے پر نہ جائیں حالات کا

خود جائزہ لیں، حکومت نے گولڈ ہینڈ شیک سکیم کا اعلان کیا جب لاکھوں سرکاری ملازمین نے درخواستیں داخل کیں تو پتہ چلا ملازمین کو یک مشت ادائیگی کے لیے ۴۵ ارب روپے چاہئیں جبکہ حکومت کے پاس اس مد میں صرف ایک ارب روپے ہیں لہٰذا اگلے ہی روز کینگرو جنگلے سے باہر تھا، حکومت نے احتسابی عمل کا ڈول ڈالا جناب سیف الرحمن نے دن رات لگا کر، کروڑوں روپے خرچ کر کے سوئٹزر لینڈ سے بے نظیر کے خفیہ اکاؤنٹس کی نقول حاصل کیں جب وہ یہ چوٹی سر کر چکے تو پتہ چلا پاکستانی عدالتیں تو فوٹو سٹیٹ کاپیوں کو ثبوت ہی تسلیم نہیں کرتیں لہٰذا اگلے ہی روز کینگرو جنگلے سے باہر تھا۔ وزیراعظم نے ٹی وی پر پوری دنیا کو مخاطب کر کے کالا باغ ڈیم بنانے کا اعلان کر دیا جب فائل حرکت میں آئی اور کام عملی سطح پر شروع ہوا تو پتہ چلا جہاں ڈیم بننا ہے وہاں کے لوگ راضی ہیں اور نہ ہی اس پراجیکٹ کے لیے خزانے میں رقم ہے لہٰذا اگلے ہی روز کینگرو جنگلے سے باہر تھا، وزیراعظم نے خلفائے راشدین کی یاد تازہ کرنے کے لیے پرائم منسٹر سیکرٹریٹ خالی کر دیا جب سارا ساز و سامان منتقل ہو چکا تو پتہ چلا ایک ارب ۷۰ کروڑ سے بننے والی اس عمارت کا تو کوئی خریدار ہی نہیں لہٰذا اگلے ہی روز یہ کینگرو بھی جنگلے سے باہر تھا، حکومت نے ملک کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کے لیے بیرون ملک آباد پاکستانیوں سے امداد کی اپیل کی جب تشہیر پر کروڑوں روپے صرف ہو چکے تو پتہ چلا اس کے لیے تو بیرون ملک اکاؤنٹس ہی نہیں کھولے گئے لہٰذا اگلے ہی روز یہ کینگرو بھی جنگلے سے باہر تھا نادہندگان کے خلاف کارروائی کا اعلان ہوا، بینکوں نے ایک کروڑ روپے خرچ کر کے فہرستیں تیار کیں جب ۶۴۳ ڈیفالٹرز کی لسٹیں بن گئیں تو پتہ چلا قانون میں تو نادہندگان کی گرفتاری کے لیے کوئی قطعی شق ہی نہیں لہٰذا اگلے ہی روز یہ کینگرو بھی جنگلے سے باہر تھا، حکومت نے نفاذ شریعت کا اعلان کر کے پوری دنیا میں تھرتھلی مچا دی جب بل تیار ہو گیا، قومی اسمبلی نے اس کی منظوری دے دی تو پتہ چلا حکومت کے پاس تو سینٹ میں مطلوبہ ووٹ ہی نہیں لہٰذا اگلے ہی روز یہ کینگرو بھی جنگلے سے باہر تھا اور اب آخر میں حکومت کے ''کمانڈنٹ'' کرنل مشتاق طاہر خیلی کے شاندار آئیڈیاز اور جناب خالد انور (وزیر قانون) کی شاندار انگریزی کے اتصال سے کراچی میں ملٹری کورٹس تشکیل پا گئیں اور ان عدالتوں نے دو مجرموں کو پھانسی پر بھی چڑھا دیا تو پتہ چلا حکومت تو آئین کی دفعہ ۲۴۵ کے تحت ملٹری کورٹس بنا ہی نہیں سکتی لہٰذا یہ کینگرو بھی اب دوسرے کینگروؤں کی طرح جنگلے سے باہر بیٹھ کر دھوپ سینک رہا ہے۔

میرا خیال ہے اگر کبھی چلتے چلتے سرِ راہ میری ملاقات حکومت کے ان کینگروؤں سے ہو جائے اور میں ہمت کر کے ان سے جنگلے میں نہ ٹکنے کی وجوہات پوچھ بیٹھوں تو میرا اندازہ ہے ان کا جواب آسٹریلیا کے اس شریر کینگرو سے مختلف نہیں ہوگا، یہ بھی یقیناً فرمائیں گے ''یہ لوگ دیوار تو اونچی کر دیتے ہیں لیکن جنگلے کا دروازہ کھلا چھوڑ جاتے ہیں۔'' تو میرے پاس کیا جواب ہوگا، کیا میرے اندر اتنی ہمت ہوگی کہ میں اسے مخاطب کر کے کہہ سکوں ''یار کینگرو جن لوگوں کے فیصلے ان کی عقل نہیں ان کی جلد بازی کیا کرتی ہے، ان کے جنگلوں کے دروازے اسی طرح کھلے رہتے ہیں اور ان کی بدقسمتی کے کینگرو اسی طرح صحن میں سرگشت کرتے رہتے ہیں۔''

علاج

جب سر کا درد نا قابل برداشت ہو گیا، بینائی کمزور ہو گئی، کانوں میں ٹرین کی آواز سنائی دینے لگی اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تو بچے بابا جی کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے مریض کا معائنہ کیا، ایکسرے کرائے، سی ٹی سکین کرائی، ای سی جی اور سونو گرافی کرائی اور پھر ساری رپورٹیں ملاحظہ کر کے نہایت دکھی انداز میں کہا: ''بابا جی کے سر میں ٹیومر ہے، اگر فوراً آپریشن ہو جائے تو ان کے بچنے کا دس فیصد امکان ہو سکتا ہے، بصورت دیگر ہر گزرنے والا دن انہیں موت کی طرف لے جائے گا؟'' بچوں نے فوراً بابا جی کو اٹھایا اور ہومیو پیتھی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے بھی ایکسرے کرائے، سی ٹی سکین کرائی، ای سی جی اور سونو گرافی کرائی، ساری علامتیں سنیں اور پھر پر اعتماد لہجے میں بولا: ''میرا خیال ہے ہم اس ٹیومر کو دواؤں سے غائب کر سکتے ہیں، آپ جرمنی سے یہ دوائیں منگوا لیں۔'' بچوں نے بابا جی کو پھر اٹھایا اور ''تیلے حکیم'' کے پاس لے گئے۔ حکیم نے مریض کی نبض پکڑی، پتلیاں اٹھا کر آنکھیں دیکھیں، علامتیں سنیں اور پھر اپنی کمزور ''تیلے'' جیسی گردن ہلا کر بولا: ''میرا خیال ہے بابا جی کو قبض ہے، اگر یہ رفع ہو جائے تو سارے مرض دور ہو جائیں گے۔ اگر اجازت دیں تو جمال گھوٹہ دے دوں۔''

بچوں نے بابا جی کو پھر اٹھایا اور سنیاسی کے پاس لے گئے۔ سنیاسی نے مریض کی جلد کا رنگ دیکھا، منہ کھلوا کر ملاحظہ کیا، انگلی سے ریڑھ کی ہڈی پر دستک دی اور پھر بقراطی لہجے میں بولا: ''جناب عالی اگر یہ جونک لگوا لیں تو سارا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔'' بچوں نے بابا جی کو پھر اٹھایا اور گھر چل پڑے، جہاں انہیں دعاؤں کے سہارے چھوڑ دیا، رات کو اچانک بابا جی نے چیخ ماری اور اچھل کر ناچنا شروع کر دیا۔ سارے گھر میں بھگدڑ مچ گئی، سب اپنے اپنے لحاف چھوڑ کر بابا جی کے گرد جمع ہو گئے۔ بابا جی نے تالی بجائی اور خوشی سے اعلان کیا ''میرے سر کا درد ختم ہو چکا ہے، اب نظر بھی صاف آتا ہے اور سنائی ٹھیک دے رہا ہے، سانس بھی ہموار اور رواں ہے، میں بالکل صحت مند ہوں۔'' بچوں نے حیرت سے بابا جی سے پوچھا: ''لیکن کیسے؟'' بابا جی ہنس کر کہنے لگے ''میں نے لیٹے لیٹے اپنے کالر پر اپنا ہاتھ پھیرا تو وہ مجھے ذرا تنگ سا محسوس ہوا۔ بس میں نے کالر کا بٹن کھول دیا اور تسلی ہو گیا۔ میرا خیال ہے آئندہ مجھے پندرہ کے بجائے سولہ سائز کا کالر پہننا چاہیے۔''

ہماری بوڑھی اقتصادیات کا سر بھی پچھلے کئی برسوں سے دکھ رہا ہے، بینائی اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ اب سامنے پڑی چیزیں تک نظر نہیں آتیں، آنے والے خطرات کا شور اتنا بڑھ چکا ہے کہ اب بانسری کی آواز بھی ٹرین کی چھک چھک محسوس ہوتی ہے، رہا سانس تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب گیا تو کبھی واپس لوٹ کر نہیں آئے گا، لہٰذا ''بابا جی'' کی اس خراب صورتحال کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بعض جلد باز بچے گورکن کو قبر کھودنے کا آرڈر دے چکے ہیں، کفن خرید لیا گیا ہے اور دیگیں منگوا کر صحن میں رکھ لی گئی ہیں، جبکہ آخری وقت تک ناامید نہ ہونے والے بعض بچے بابا جی کو اٹھائے پھر رہے ہیں، کبھی اس سرجن کے پاس، کبھی اس سپیشلسٹ کے کلینک پر، کبھی اس مہنگے ہومیوپیتھی ڈاکٹر کی دکان پر، کبھی اس ''تیلے حکیم'' کے مطب پر، کبھی اس سنیاسی کے اڈے پر اور کبھی اس سیانے کے پاس، لیکن سب ڈاکٹر، حکیم اپنی اپنی تشخیص کر رہے ہیں، کوئی آپریشن کا مشورہ دے رہا ہے، کوئی مہنگی دوائیں کھلانے، کوئی جمال گھوٹہ دینے اور کوئی جونک لگوانے کا مشورہ دے دیا ہے۔

جی ہاں، اس بوڑھی اقتصادیات کے ہاتھوں ساری صنعتیں زمین بوس ہو چکی ہیں، خزانہ خالی ہو چکا ہے، ملازمین کی تنخواہوں کے لیے پیسہ نہیں رہا، ملک کے ۹۰ فیصد ترقیاتی کام بند ہو چکے ہیں۔ واپڈا سے ٹائم بم کی ٹک ٹک نشر ہو رہی ہے، پی ٹی وی کا خسارہ بڑھتا جا رہا ہے، ریلوے سفید ہاتھی کی طرح پوری معیشت کو روندتا ہوا گزر رہا ہے، گندم ناپید ہو چکی ہے، کپاس کی فصل تباہ ہو چکی ہے، سٹاک ایکسچینج بیٹھ چکی ہے، روپیہ آخری سانس لے رہا ہے، ریونیو کا گراف تیزی سے گر رہا ہے، لوگ اپنی سکت سے زیادہ ٹیکس دینے سے انکار کر چکے ہیں اور پیسہ حکومتی گرفت سے نکل کر چند ہاتھوں میں جمع ہو رہا ہے حکومت مریض کو بچانے کے لیے کبھی ۱۸ لاکھ روپے ماہانہ پر معین الدین پکڑ لاتی ہے، کبھی ۱۶ لاکھ والے زبیر سومرو، شوکت ترین اور کبھی عالمی مارکیٹ سے ۱۲، ۱۴ لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ پر ۸ سفید ہاتھی خرید لاتی ہے۔ یہ سب لوگ آتے ہیں، ایکسرے کراتے ہیں، سی ٹی سکین، ای سی جی اور سونوگرافی کراتے ہیں، رپورٹیں پڑھتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، اپنی فیس لیتے ہیں اور ''اب مریض کو دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہے۔'' کا مشورہ دے کر چلتے بنتے ہیں۔

جی ہاں، محترم قارئین، ان آخری لمحوں میں جب قبر تیار ہے، سفید دودھیا لٹھے کا کفن کمرے میں دھرا ہے، مشک بو، لوبان اور گلاب کی پتیاں آیا ہی چاہتی ہیں، ''مولوی'' شام کی تیاری کر رہا ہے اور صحن میں نائی دیگیں ''کھڑکا'' رہا ہے، بابا جی کو ہمت سے کام لے کر اپنے کالر کا بٹن خود ہی کھولنا ہوگا کہ معین الدین، شوکت ترین اور زبیر سومرو اور ان جیسے ڈیڑھ درجن دوسرے مہنگے ڈاکٹر، حکیم اور سنیاسی ان کے سر درد، بینائی، سماعت اور سانس کا علاج نہیں کر سکتے۔

ہاں محترم قارئین، باغیرت قوموں کو زندہ رہنے کے لیے اپنے اپنے کالر خود ہی کھولنے پڑتے ہیں کیونکہ غیر تو صرف آپریشن کیا کرتے ہیں، کڑوی کسیلی گولیاں کھلایا کرتے ہیں، جمال گھوٹہ دیا کرتے ہیں اور جونکیں لگایا کرتے ہیں۔

''پچی پچی ٹھک''

فردوس عالم ہمارے بزرگ دوست ہیں، سی ایس پی آفیسر ہیں، سات برس تک ایوان صدر میں اقتدار کی مونچھ کا بال رہے، تین چار برس زکوۃ و عشر کے ذمہ دار افسر رہے۔ اس سے پہلے متعدد حساس پوزیشنوں پر عمر عزیز کا طویل حصہ بے دریغ خرچ کیا، دماغ میں ادب کا کیڑا ابھی ہے، جس نے چند برسوں میں ریشم کے جتنے ٹوٹے بنے وہ ''ہوائیاں'' کے نام سے منصۂ شہود پر ظہور پذیر ہو چکے ہیں، لیکن ان کی اصل وجہ شہرت ان کی ''بزرگی'' ہے افسر شاہی اور نہ ہی ''ہوائیاں'' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی ذاتی گاڑی کے حوالے سے جس نیک نامی، شہرت اور عزت سے نواز رکھا ہے وہ شاید انہیں ان کی افسری، ذاتی ایمانداری اور

انشائیے عمر بھر کی تپسیا کے بعد بھی ''فراہم'' نہ کر سکتے۔

اس میں قطعاً مبالغہ نہیں، آپ اسلام آباد کی کسی شاہراہ پر کھڑے ہو جائیے، آگے پیچھے دیکھئے آپ کے دائیں یا بائیں جو اجنبی کھڑا ہے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف متوجہ کیجیے (واضح رہے یہ اجنبی خاتون نہیں ہونی چاہیے)۔ جب وہ پوری طرح آپ کی طرف متوجہ ہو جائے تو آپ اس سے پوچھئے ''بھائی آپ نے فردوس عالم کو تو نہیں دیکھا۔'' اجنبی کی بجھی زرد آنکھوں میں روشنی آ جائے گی، باچھیں کھل جائیں گی، چہرے پر جوانی کا تازہ خون ٹھاٹھیں مارنے لگے گا اور وہ ایک قہقہہ لگا کر بلند آواز میں کہے گا: ''اب تو پتا نہیں، لیکن صبح آٹھ بجے اپنے ٹینک پر شاہراہ دستور سے آبپارہ کی طرف مارچ کر رہے تھے۔''

اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں اسلام آباد کے باسی فردوس صاحب اور ان کی گاڑی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اگر کسی روز یہ دونوں گھر سے نہ نکلیں تو میلوڈی کے آگے پیچھے رہنے والے زیادہ تر بچوں کا سکول ''خطا'' ہو جاتا ہے جبکہ صاحب لوگ دفتر سے لیٹ ہو جاتے ہیں، پوچھا جائے ''جناب آپ خلاف معمول تاخیر سے تشریف لائے، خیریت تو تھی۔'' صاحب جمائی لے کر کہتے ہیں: ''آج فردوس صاحب کی گاڑی ہی سٹارٹ نہیں ہوئی، آنکھ ہی نہیں کھلی۔'' اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس روز یہ عفیفہ شرف دیدار بخشنے کے لیے شہر نہ نکلے تو ''فریادی'' خود ہی آنکھیں سینکنے کے لیے فردوس صاحب کے گھر جمع ہو جاتے ہیں اور ایک آدھ بار تو ایسا بھی ہوا کہ موصوفہ تین روز تک گیراج ہی میں استراحت فرماتی رہیں، تو شہر بھر سے زائرین کے جلوس

''کلمہ شہادت'' کا ورد کرتے ہوئے جائے حادثہ کی طرف چل پڑے جبکہ چند قریبی دوست تو فردوس صاحب کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو بھی پڑے، لیکن فردوس صاحب نے یہ کہہ کر ماتمی جلوس کو تسلی دی: ''بھائیو! جی ہلکان نہ کرو موصوفہ تا حال بقید حیات ہیں، بس میری طبیعت ہی کچھ دنوں سے بھاری بھاری تھی، دوا لے رہا ہوں جونہی من سنبھلا انہیں لے کر حاضر ہو جاؤں گا'' اور جلوس خوشی کے شادیانے بجاتا ہوا منتشر ہو گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، فردوس عالم صاحب اسی گاڑی پر سیر گشت کے لیے نکلے، جونہی وہ آزاد کشمیر ہاؤس کے قریب سے ہوتے ہوئے مارگلہ روڈ پر پہنچے تو انجن سے چی چی ٹھک، چی چی ٹھک کی اضافی آوازیں آنے لگیں، ابھی فردوس صاحب اس آواز پر پوری طرح پریشان بھی نہیں ہو پائے تھے کہ چرمیں کی ایک اور آواز گونجی اور ایک جھٹکے سے گاڑی رک گئی، انجن بند ہو گیا، پورے شہر کی فضا میں سکوت مرگ طاری ہو گیا، ہوا میں اڑتے بے چین پرندے واپس درختوں پر آ بیٹھے، شہر سے فرار ہوتے گیدڑ اور لومڑ بھی واپس پلٹ آئے، اعصابی مریضوں نے کانوں سے روئی نکال لی اور بچے بیسویں صدی کے آخری معجزے کے نظارے کے لیے گھروں سے نکل آئے۔

گاڑی خراب ہو چکی تھی، فردوس صاحب بونٹ کھول کر باری باری سارے پرزوں پر پھونکیں مار چکے تھے، سیلف دینے سے پہلے سورۃ الناس کا ورد بھی کر کے دیکھ لیا، بچوں سے ایک کلومیٹر تک دھکا بھی لگوالیا۔ مارگلہ روڈ کے زیادہ تر ڈرائیوروں نے بھی اپنے اپنے ٹوٹکے آزمالیے لیکن گاڑی اڑیل ٹٹو کی طرح ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مکینک لائے گئے، انہوں نے بھی سارے جتن کر لیے، لیکن گاڑی چی چی ٹھک ...... چی چی ٹھک کے بعد بند ہو جاتی۔ جب شام کے سائے لمبے ہو گئے اور گیدڑ مارگلہ کی پہاڑیوں سے اتر کر تماش بینوں میں شامل ہونے لگے تو فیصلہ ہوا اسے کسی دوسری گاڑی کے پیچھے باندھ کر ورکشاپ پہنچایا جائے، ترکیب لاجواب تھی، لہٰذا فوراً عملدرآمد شروع ہو گیا۔ یوں پہلی بار ایسا ہوا کہ فردوس صاحب کی گاڑی چلی لیکن درختوں سے پرندے اڑے نہ ہی بچوں نے ڈر کر کانوں پر ہاتھ رکھا۔

فردوس صاحب کی اپنی روایت کے مطابق مکینک رات گئے تک فالٹ ٹریس کرتے رہے، آدھے سے زیادہ انجن کھول کر دیکھ لیا، سیلف کھول کر دیکھ لیا، بیٹری چیک کر لی، ہر چیز درست تھی، مکمل تھی مگر گاڑی پھر بھی سٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ فردوس صاحب نے زچ ہو کر گاڑی ورکشاپ پر چھوڑی اور سکندر کی طرح خالی ہاتھ واپس جانے کا فیصلہ کر لیا، لیکن ابھی وہ بنچ سے پوری طرح اٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ انجن سے چی چی ٹھک ...... چی چی ٹھک کی آواز آئی اور پوری فضا جاگ اٹھی، پرندے درختوں سے اڑ گئے، گیدڑ پہاڑوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور لوگ ہڑبڑا کر بستروں میں بیٹھ گئے۔ فردوس صاحب کی باچھیں کھل اٹھیں، مکینک نے بونٹ گرایا، ٹاکی سے ہاتھ صاف کیے اور فردوس صاحب کے قریب آ کر بولا: ''صاحب اگر آپ پھر پٹرول ڈالے بغیر گاڑی چلانے کی کوشش کریں گے تو اسی طرح چی چی ٹھک ...... چی چی ٹھک کی آوازیں

آتی رہیں گی، گاڑی اسی طرح بند ہوتی رہے گی، آپ بھی اسی طرح خوار ہوتے رہیں گے۔''

بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ملک فردوس عالم کی گاڑی سے مختلف نہیں، یہ بھی عین بیچ سڑک بند ہو چکا ہے اور اب یہ پیچھے سرکتا ہے اور نہ ہی آگے بڑھتا ہے۔ ہم نے دھکا لگا کر دیکھ لیا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، ہم نے بار بار سیلف مار کر دیکھ لیا، ایک آدھ بار چی چی ٹھک ...... چی چی ٹھک کی آواز آئی لیکن دوبارہ خاموشی طاری ہوگئی۔ ہم نے مکینک بدل کر دیکھ لئے، آدھے سے زائد انجن کھل گیا، بیٹری میں نیا پانی ڈلوایا، الیکٹرک سپلائی کی ساری تاریں بدل دیں، پرانے پرزوں کی جگہ نئے ڈال دیئے، کئی بار نیا رنگ روغن کرایا، سیٹوں کے کشن بدلے، نئے نئے ڈرائیور رکھے، نمبر پلیٹیں تک بدل کر دیکھ لیں، لیکن گاڑی سے چی چی ٹھک ...... چی چی ٹھک کی آوازوں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ پہیے میں ذرا بھر حرکت نہیں ہوئی، انچ بھر مسافت طے نہیں ہوئی۔ ہم نے سارے جتن کیے، باڈی کو ٹھڈے تک مارے، کمپنی کو بنانے والوں کو، چلانے والوں کو گالیاں تک دیں، لیکن کبھی پٹرول ٹینک کا ڈھکن کھول کر نہیں دیکھا، کبھی پٹرول کی زنگ آلود خشک نالیوں کی جانچ نہیں کی۔

ہم یہ بھول گئے، جب تک یہ خشک نالیاں ہری بھری نہیں ہوں گی، ٹینک پٹرول سے نہیں چھلکے گا، دنیا کا کوئی مکینک چی چی ٹھک ...... چی چی ٹھک کی آوازیں نہیں روک سکتا، گاڑی کو چلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

ہاں ایمانداری، فرض شناسی اور ملک سے محبت قوموں کے لیے پٹرول کا درجہ رکھتی ہے، یہ نہ ہوں تو قومیں قومیں نہیں ہوتیں، چی چی ٹھک ...... چی چی ٹھک ہوتی ہیں۔

کچھ وقت تو لگے گا

اکثر محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سب کسی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہیں، ایسی ڈائننگ ٹیبل پر جس پر پانی کے خالی جگ اور چند گلاسوں کے سوا کچھ نہیں۔ ہم بے چینی سے کچن کی طرف دیکھتے ہیں، نوکروں کو دروازے کی طرف لپکتے اور پھر باہر نکلتے دیکھتے ہیں، برتن کھڑکنے کی آواز سنتے ہیں، ڈوئیاں چلنے، تڑکے لگنے اور پتیلے سرکنے کی آوازیں سنتے ہیں۔ ہم قورمے، مرغ پلاؤ اور حلیم کی خوشبو سونگھتے ہیں، دہی بڑے، سیخ کباب اور قیمے کی خوشبو بھی گھیر لیتی ہے، ہمیں روٹیاں پلٹنے، نان گرم کرنے اور سلاد بنانے کی آوازیں بھی آتی ہیں۔

ہاں ہم ہر آواز، خوشبو کے ہر جھونکے اور آنے جانے والی ہر ڈش کی جھلک سے خوش ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں، مسکراتے ہیں اور دوبارہ گفتگو میں الجھ جاتے ہیں، تھوڑی دیر بعد جب موضوع کشش کھو بیٹھتا ہے، زبان تھک جاتی ہے اور فقروں کے وقفے بڑھنے لگتے ہیں تو ہم چونک کر میزبان کی طرف دیکھتے ہیں، وہ مسکرا کر کچن کی طرف دیکھتا اور پھر ہماری طرف مڑ کر کہتا ہے، فکر نہ کریں ''کڑی'' کے لیے پکوڑے تلے جا رہے ہیں، کھانا بس آیا ہی چاہتا ہے، دراصل آپ آئے بڑی تاخیر سے ہیں، اب کچھ وقت تو لگے گا۔

یہ تماشا صبح تک جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ کچھ مہمان نقاہت سے وہیں میز پر اوندھے ہو جاتے ہیں، چند اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور باقی ماندہ آس کا دامن تھامے اسی طرح پر امید بیٹھے رہتے ہیں جبکہ اندر، کچن کے اندر اسی طرح برتن کھڑکتے رہتے ہیں، آوازیں اٹھتی رہتی ہیں، روٹیاں پکتی رہتی ہیں اور نوکر آتے جاتے رہتے ہیں۔

میں جب بھی حکومت کے فعال پرزوں سے گفتگو کرتا ہوں تو انہیں مطمئن اور مسرور پاتا ہوں، انہیں فائلیں لہراتے، بازو تھپتھپاتے، اعداد و شمار کے پہاڑ کھڑے کرتے اور دعوؤں کے انبار لگاتے دیکھتا ہوں تو میں انہیں ٹوکتا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے خیالی دنیا سے باہر قدم رکھنے کی درخواست کرتا ہوں، وہ رکتے ہیں ایک لمحے کے لیے رکتے ہیں تو میں عرض کرتا ہوں ''یارو کچھ خیال کرو، عام آدمی کی حالت بڑی پتلی ہے، ۲۶ روپے کلو پیاز کون خریدے گا، بجلی کے پچاس یونٹ کا بل پانچ سو روپے کون دے گا، گیس کا بل چار ہزار روپے

کس کی جیب سے ادا ہوگا، کون اپنے بچوں کی فیسیں دے گا، یہ لوگ کیسے زندہ رہیں گے" وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں، فائل کھولتے ہیں، کاغذ کے ایک پرزے پر انگلی پھیر کر کہتے ہیں، انشاء اللہ اس برس ٹیکسوں کی آمدنی میں ۵۰ بلین کا اضافہ ہوگا، ۲۱ بلین کی ایکسپورٹس بڑھیں گی، ہم ۹ بلین کا چاول بیچیں گے، ہمیں آئی ایم ایف ۲۲ بلین ڈالر کی امداد دے گا اور ہم دفاعی بجٹ میں ۲ بلین کی کمی کریں گے، بس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، مہنگائی کم ہو جائے گی، گیس، بجلی اور پٹرول کی قیمتیں گر جائیں گی، تنخواہیں بڑھ جائیں گی۔

میں ان سے کہتا ہوں دوستو، کچھ امن و امان پر توجہ دو، مسجدوں کو فرقہ واریت سے پاک کرو، ٹرینوں کا حفاظتی نظام بہتر بناؤ، ناجائز اسلحے کی بڑھتی ہوئی مقدار پر قابو پاؤ، بموں کا راستہ روکو، کلاشنکوفیں پکڑو، دہشت گردی کا نیٹ ورک توڑو، کچھ تو ان مظلوم لوگوں کا خیال کرو، وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں، فائل کھولتے ہیں، کاغذوں کا دستہ نکالتے ہیں اور پھر پورے یقین سے کہتے ہیں: "جناب آپ سمجھیں اب تو ہر مسئلہ ہی ختم ہوگیا، بس ایلیٹ فورس آنے کی دیر ہے، سارے دہشت گرد بھاگ جائیں گے، خدمت کمیٹیاں اپنے اپنے علاقے میں امن و امان کی بحالی کی کوشش کریں گی، خفیہ ادارے فرقہ واریت کا زور توڑ دیں گے، پولیس کے لیے وضع کردہ نیا نظام لا اینڈ آرڈر کی ساری صورتحال درست کر دے گا اور سرسری عدالتیں مجرموں کو عبرت کی علامت بنا دیں گی۔ بس اللہ اللہ خیر صلا۔"

میں ان سے کہتا ہوں صاحبو! کچھ سرحد پار کی صورتحال پر بھی توجہ کرو، دشمن حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں، امریکہ جنوبی ایشیا میں اپنے مہرے بدل رہا ہے، افغانستان کی آگ اب ادھر بھی دھواں دے رہی ہے، بھارت مقبوضہ کشمیر میں کشمیری آبادی کی "ڈاؤن سائزنگ" کر رہا ہے، سرحد پار سے سینکڑوں جاسوس ادھر گھس آئے ہیں، وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں، کوئی دوسری فائل نکال کر دکھاتے ہیں، مسکراتے ہیں اور پھر دعویٰ سے کہتے ہیں، نہیں جنگ نہیں ہوگی، پینٹاگون کے ماہرین کا کہنا ہے بھارت کبھی سرحد عبور کر کے پاکستان میں گھسنے کا رسک نہیں لے گا، رابن رافیل کا بھی یہی خیال تھا، البرائٹ بھی یہی کہہ رہی ہے، کچھ ہم بھی کیل کانٹے سے لیس ہیں، اب تو ہمارے پاس غوری بھی ہے، تم فکر نہ کرو۔

میں ان سے کہتا ہوں، حضرت اس ملک میں ۴۵ ارب روپے صرف حکومت چلانے پر خرچ ہوتے ہیں۔ مہربانی فرما کر حکومتی اخراجات کم کرو، ایوان صدر، وزیراعظم ہاؤس، پرائم منسٹر سیکرٹریٹ، گورنر ہاؤسز، وزیراعلیٰ ہاؤسز، ایم این اے اور ایم پی اے ہاسٹل کی نج کاری کرو، وزیروں، مشیروں اور چیئرمینوں کے خرچے کم کرو، سرکاری گاڑیوں کی تعداد گھٹاؤ، پٹرول کی حد مخصوص کرو، نوکروں چاکروں کی چھٹی کراؤ، سادگی اختیار کرو، وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں، فائل نکالتے ہیں، انگلی پھیرتے اور کہتے ہیں صدر نے ایک ماہ میں اتنے ملازمین فارغ کیے، پرائم منسٹر سیکرٹریٹ سے اتنے لوگ دوسرے محکموں میں کھپائے گئے، ان ان

خرچوں پر پابندی لگائی گئی، یہاں یہاں ضرب لگانے کا منصوبہ ہے، ادھر ادھر سے اخراجات سمیٹے جائیں گے۔

میں ان سے کہتا ہوں آقاؤ! ان غلاموں کے لیے اس نظام کی چند کھڑکیاں ہی کھول دو، ہوا کے چند جھونکے تو اندر آنے دو، انصاف سستا کرو، ظلم روک دو، تعلیم عام کرو، قانون کو نرم اور سیدھا بنا دو، عدالتوں کو دکانیں بننے سے بچالو، تھانوں کو عقوبت خانوں سے دور کر دو، پولیس کانسٹیبل کو قصاب نہ بننے دو، ناپ تول کا نظام ہی ٹھیک کر دو، کسی کو جاگیردار سے بچالو، اور ملک کو فارن انویسٹروں کے چنگل سے آزاد کرالو، وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں، فائل نکالتے ہیں اور کاغذ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، نئے آئینی پیکیج سے لوگوں کو ان کے دروازوں پر انصاف ملے گا، حکومت ۲۰۰۳ء تک پورے ملک میں تعلیمی انقلاب لے آئے گی، لوگوں کو تھانیداروں کا احتساب کرنے کا موقع ملے گا، عدالتوں میں ہر شخص کو پورا پورا حق دیا جائے گا، ناپ تول میں بے ایمانی کرنے والوں کو کڑی سزا دی جائے گی، خوراک میں ملاوٹ کرنے والے قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے، حالات بہت جلد درست ہو جائیں گے۔

یقین فرمایئے میں جب بھی حکومت کے ان پرزوں سے بات کرتا ہوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے لوگ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے بھوک کو بہلاوے دے رہے ہیں اور اندر برتن کھڑک رہے ہیں، ڈوئیاں چل رہی ہیں، تڑکے لگ رہے ہیں، پتیلے پتیلیاں سرک رہی ہیں، قورمے، مرغ پلاؤ اور حلیم کی خوشبو اڑ رہی ہے، دہی بڑے، سیخ کباب اور قیمے کی مہک آ رہی ہے، روٹیاں پکتی جا رہی ہیں، نان گرم، کیے جا رہے ہیں اور سلاد کاٹا جا رہا ہے لیکن باہر کچھ نہیں آ رہا، میز پر بدستور ایک خالی جگ اور درجن بھر گلاس دھرے ہیں۔ کچھ مہمان نقاہت سے اوندھے ہو چکے ہیں چند اٹھ کر جا چکے ہیں اور باقی ماندہ لوگ پیٹ پر ہاتھ باندھے پر امید بیٹھے ہیں اور میزبان بار بار کہہ رہا ہے معاف کیجیے گا کڑی کے لیے پکوڑے تلے جا رہے ہیں، کھانا بس آیا ہی چاہتا ہے، دراصل آپ آئے بڑی تاخیر سے ہیں۔ اب کچھ وقت تو لگے گا۔

مکمل سوال

جونہی ٹرین اوسلو سے باہر نکلی، مجھے محسوس ہوا دروازے کے قریب کھڑا نارویجن مجھے ''واچ'' کر رہا ہے، مجھے بڑی حیرت ہوئی، مجھے یہ حیرت ہونی بھی چاہیے تھی کیونکہ نیویارک کے ایک گمنام ڈاکٹر میں نارویجن لوگوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور ڈاکٹر بھی وہ، جو ناروے میں ایک ہفتے سے زیادہ قیام کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو، میں نے سوچا پھر وہ نیلی آنکھوں، بھورے بالوں اور سرخ رنگت والا نارویجن ''لمبو'' مجھے کیوں گھور رہا ہے، مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل کیوں نہیں ہونے دیتا۔

ٹرین میں چھ سو مسافر تھے، ان میں اونٹ جتنے لمبے آسٹریلین بیوپاری تھے، ان میں سرخ رنگت اور جھلسی ہوئی آنکھوں والے امریکی تھے، ان میں مٹی کی پرانی ہنڈیا جیسے سیاہ لیکن برگد کے درخت جیسے لمبے، گھنے اور مضبوط افریقی تھے، ان میں پست ناک والے زرد رو جاپانی بھی تھے۔ ان میں اک آدھ تبتی اور انڈین بھی تھا، لیکن وہ شخص صرف مجھے ہی گھور رہا تھا۔ اس سلوک پر مجھے بڑی بے چینی ہو رہی تھی، میں نے دھیان ہٹانے کے لیے پہلو بدلا اور اپنا چہرہ کھڑکی کے شیشے سے چپکا دیا۔

باہر پورا ناروے ہوا کے دوش پر اڑ رہا تھا، سبز مخملی کھیت، کھیتوں میں چرتی صحت مند گائیں، سفید چاندنی جیسی ندیاں، ندیوں کے کنارے آباد صاف ستھرے گھر، گھروں کے صحنوں میں پھرتی صحت مند لڑکیاں اور لڑکیوں کے قریب کھیلتے سرخ گالوں اور بھورے بالوں والے بچے، سب تیزی سے پیچھے کھسک رہے تھے۔ میں نے سوچا خدا نے اس خطے کو کس فراخ دلی سے حسن سے نوازا ہے اور کیا حسن کی یہ تقسیم وسیع نہیں ہو سکتی؟ کیا افریقہ کے گھور جنگل اور غربت کی چکی میں پستے ایشیا میں ایسے منظر طلوع نہیں ہو سکتے۔ میں نے سوچا اور انسان صرف خوبصورتی دیکھنا چاہتا ہے...... اور...... اچانک میری نظر کھڑکی سے اڑ کر دروازے پر کھڑے جاسوس پر جا گری اور میری سوچ کا دھارا پتھر پر گرتی آبی لکیر کی طرح چھینٹے بن کر اڑ گیا، وہ مشکوک نارویجن مجھے بدستور گھور رہا تھا، میں نے بے چینی سے پھر پہلو بدلا، بنچ میں لرزش سی ہوئی تو میرے پہلو میں بیٹھے بلغارین بوڑھے نے چہرے سے اخبار کھسکا کر مجھے گھور کر دیکھا، میں جھینپ گیا۔

ٹرین کسی غیر اہم سٹیشن پر رکی، دروازے کھلے اور چند لوگ اخبارات، ٹفن اور بیگ لے کر پلیٹ فارم

پر کود گئے، اگلے چند سیکنڈ میں دروازے بند ہوئے، پہیوں نے درد کی سسکاری لی اور منظر پھر تیزی سے پیچھے دوڑنے لگے۔ کمپارٹمنٹ میں رش بڑی حد تک کم ہو چکا تھا، جاسوس نے کلائی سیدھی کی، قمیض کا کف سرکایا، وقت دیکھا، گردن ہلائی اور پورے اطمینان سے میری طرف بڑھنے لگا۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

جاسوس میرے قریب کھڑا ہوا، جیب میں ہاتھ ڈال کر سرکاری کارڈ نکالا اور میرے سامنے لا کر بولا: ''سر میں امیگریشن آفیسر ہوں، آپ کے سامان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں؟'' میں فوراً گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''مگر کیوں سر؟'' میری آواز میں حیرانی اور غصہ دونوں تھے۔ ''بی کاز یو آر اے پاکستانی سر'' مجھے جھٹکا سا لگا اور میں نے چلا کر کہا: ''نہیں میں پاکستانی نہیں ہوں، میں امریکن ہوں، بائی برتھ امریکن'' اس نے اپنی دونوں ٹانگوں پر پورا وزن ڈالا اور آواز میں ایک مصنوعی بھاری پن لا کر بولا: ''ہو سکتا ہے، آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں، لیکن میں اس کے باوجود آپ کے کاغذات دیکھوں گا، سامان کی تلاشی لوں گا۔'' میرا دماغ اس امتیازی سلوک پر آتش فشاں کی طرح چٹخنے لگا، میں نے غصے سے جیکٹ کی جیب سے سارے کاغذ نکالے اور اس کے ہاتھ میں تھما دیئے اس نے میرا امریکن پاسپورٹ کھول کر دیکھا، ایک ایک مہر، ایک ایک نقش کو بلب کے سامنے رکھ کر پرکھا، میرا گرین کارڈ چیک کیا، میری قامت، میرے شناختی نشانات کی تصدیق کی، ناروے کے ویزے کی پڑتال کی، میرا ٹکٹ چیک کیا، جب مکمل اطمینان ہو گیا تو مجھے کاغذات واپس کرتے ہوئے بولا: ''مسٹر احمد تھینک یو ویری مچ، اب آپ اپنا سامان دکھائیں گے۔'' میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے بیگ اس کی طرف دھکیل دیا، اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور زپ کھول کر بیگ فرش پر الٹ دیا، ٹھک ٹھک کی کئی آوازیں گونجیں اور پرفیوم، آفٹر شیو اور سافٹ ڈرنکس کے ڈبے فرش پر لڑھکنے لگے، سارے مسافر نشستوں سے اٹھے اور جم کر تماشا دیکھنے لگے، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے ناک پر ٹشو رکھا اور اپنا چہرہ دوبارہ کھڑکی کے شیشے سے چپکا دیا، منظر اسی طرح، پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔

جاسوس نے میری گندی پتلون کی جیبیں الٹ کر دیکھیں، صاف شرٹوں کے بارڈر ٹٹول کر دیکھے، کتابیں جھاڑ کر تسلی کی، آفٹر شیو اور پرفیوم کی خوشبو سونگھ کر تخمینہ لگایا، چاقو سے بیگ کے استر ادھیڑ کر معائنہ کیا، جب کچھ نہ ملا تو مجھے مجرموں کی طرح کھڑا کر کے میرے جسم کے سارے حصے ٹٹول کر دیکھے۔ جب اس میں بھی بری طرح ناکامی ہوئی تو مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا، تکلیف کے لیے معافی مانگی اور نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا دوبارہ دروازے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، ٹرین اسی طرح فراٹے بھر رہی تھی، مسافر اسی طرح سیٹوں پر بیٹھے تھے، بلغارین بوڑھا بھی چہرے پر اخبار اوڑھے اسی طرح اونگھ رہا تھا، لیکن میرا پورا جسم غصے، نفرت اور توہین کی آگ میں جل رہا تھا۔

اس رات میں نے اپنے میزبان سے اس سلوک کے بارے میں پوچھا تو وہ غمگین لہجے میں بولا: ''ناروے حکومت نے امیگریشن کے عملے کو پاکستانیوں پر نظر رکھنے کا حکم دے رکھا ہے۔'' ''پر کیوں؟'' ''اس

لیے میرے شہزادے کہ ناروے میں ۸۵ فیصد جرائم کے پیچھے پاکستانیوں کا ہاتھ ہوتا ہے، اوسلو کے ۱۵ ٹاپ کلبز میں سے ۵ پاکستانیوں کے ہیں، جن میں لڑائی جھگڑا، دنگا فساد اور قتل معمول بن چکا ہے، جبکہ منشیات اور عصمت فروشی کے دھندوں پر بھی بڑی حد تک پاکستانیوں کی ''مناپلی'' ہے۔ لہٰذا نارویجن گورنمنٹ جہاں نئے پاکستانیوں کی آمد کو ''ڈس کرج'' کرتی ہے وہاں ہر نئے پاکستانی پر کڑی نظر بھی رکھتی ہے۔'' میزبان نے ایک ہی سانس میں سارا کچا چٹھا سنا دیا۔ ''لیکن میں تو پاکستان سے نہیں، نیویارک سے آیا ہوں، بائی برتھ امریکن نیشنل ہوں، میری ساری گروتھ نیویارک میں ہوئی۔ میں نے ایجوکیشن نیویارک سے پائی، میرا حلیہ بھی امریکن تھا، پھر چھ سو مسافروں میں سے اس نے صرف مجھے ہی شناخت کیوں کیا۔ اس نے صرف میری ہی تلاشی کیوں لی۔'' میرے لہجے میں بدستور غصے کی آنچ تھی۔ ''اس لیے ایمی ڈیئر'' میزبان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ بچی تھی۔ ''اس لیے ایمی ڈیئر کہ امیگریشن والوں کے لیے صرف گندمی رنگت، سیاہ آنکھیں اور السلام علیکم ہی کافی ہوتا ہے۔''

ایمی نے یہ ساری واردات سنا کر آخر میں پوچھا: ''آخر ہمارا کیا قصور ہے، ہم لوگ پچھلی ایک نسل سے پاکستان سے مفرور ہیں۔ پانچ سال بعد اسلام آباد، لاہور یا کراچی کا چکر لگاتے ہیں۔ ہمارا سارا لائف سٹائل امریکن ہے، ہم اردو بول سکتے ہیں اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم جہاں بھی جاتے ہیں، ہمیں پاکستانی ہی کی حیثیت سے ٹریٹ کیا جاتا ہے، اسی طرح ہمارا سارا سامان کھولا جاتا ہے، ہمارے کپڑوں، ہمارے جسم کی تلاشی لی جاتی ہے۔ ہمیں ڈرٹی پاکی کہا جاتا ہے، ہمیں چور، سمگلر اور قاتل سمجھا جاتا ہے، کیوں، آخر کیوں؟''

میں نے ایمی کا سوال سنا تو خاموش ہو گیا، مجھے یقین ہے، آپ بھی میری طرح ایمی کے اس سوال پر خاموشی اختیار کریں گے کہ بعض سوال اپنے جوابوں سے زیادہ، جامع، زیادہ مکمل اور زیادہ بلیغ ہوتے ہیں۔

تو کیا ہوگا؟

برسوں پہلے برلن میں دو پاکستانی طالب علم جوہری تعلیم حاصل کر رہے تھے، تحصیل علم کے بعد ان میں سے ایک امریکہ چلا گیا جہاں اس نے ایٹمی توانائی کے ایک ادارے میں ملازمت کر لی، نوجوان محنتی تھا لہٰذا دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا یہاں تک کہ اس کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے سائنس دانوں میں ہونے لگا جبکہ دوسرا نوجوان واپس پاکستان آ گیا جہاں اس نے ایٹمی پلانٹ کی بنیاد رکھی، غیر سائنسی ماحول میں دن رات کام کیا اور آنے والے دس پندرہ برس میں ڈاکٹر عبدالقدیر بن کر طلوع ہوا، کمبوڈیا سے کیپ کینورل اور اسلام آباد سے تل ابیب تک اس کے تذکرے ہونے لگے، جب اس کی یہ شہرت اڑتی ہوئی پہلے "نوجوان" تک پہنچی تو اس نے ڈاکٹر عبدالقدیر کو خط لکھا، جس میں مبارکباد کے بعد پیشکش کی "میں بھی آپ کی طرح پاکستان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، مجھے مشورہ دیں کیا کروں؟" ڈاکٹر عبدالقدیر نے انہیں مشورہ دیا "پاکستان فلاحی کاموں میں بہت پیچھے ہے آپ کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نواز رکھا ہے، آپ خدا کے دیے میں سے کچھ پاکستان کی سماجی بہبود پر بھی خرچ کر دیا کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو بہت اجر دے گا۔" کچھ عرصے بعد ڈاکٹر عبدالقدیر کو اس "نوجوان" کا ایک اور خط موصول ہوا جس میں اس نے بڑے جذباتی انداز میں اعلان کیا "قدیر تمہارے مشورے نے میری آنکھیں کھول دیں، میں نے سوچا یہ دنیا کا مال ہے اس نے دنیا ہی میں رہ جانا ہے، میں اگر اس میں سے کچھ اپنے ہم وطنوں پر خرچ کر دوں گا تو اس سے بڑی سعادت کیا ہوگی، چنانچہ میں نے امریکہ میں ایک اسلامی مدرسہ کو پورے پچیس (۲۵) ڈالر کا چیک بھجوا دیا ہے، ویسے تو نیکی کی تشہیر نہیں کرنی چاہیے لیکن تم غیر تھوڑے ہو لہٰذا تمہیں بتا رہا ہوں کسی دوسرے سے ذکر نہ کرنا کہیں میری نیکی غارت نہ چلی جائے میں اس مدرسے کو ہر سال اتنی ہی رقم ڈونیٹ کیا کروں گا۔"

یہ واقعہ فقط ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس پر ہم جتنا چاہیں ماتم کریں کم ہے کیونکہ یہی وہ المیہ ہے جس میں ہماری پسماندگی کی ساری جڑیں پیوست ہیں، آئے روز ڈاکٹر مرتضیٰ آرائیں جیسے حضرات شکاگو سے پاکستان تشریف لاتے رہتے ہیں ہمیں ہماری کم مائیگی، پسماندگی، جہالت، بیماری، بد اخلاقی، کرپشن اور غیر جمہوری روایات کا احساس دلاتے رہتے ہیں، "انسان بن جاؤ ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔"

کی وعید سناتے ہیں، دعوتیں اڑاتے ہیں، تالیاں بجواتے ہیں اور واشنگٹن، لندن، بون، سڈنی اور زیورخ واپس چلے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو ہماری اصلاح کے لیے، ہماری کم مائیگی، پسماندگی، جہالت، بیماری اور کرپشن دور کرنے کے لیے یہاں رک جائے دوسری طرف ہماری بدقسمتی دیکھیے ہم سر جھکا کر ان کے یہ طعنے سن لیتے ہیں، خود کو لبرل اور براڈ مائینڈڈ ثابت کرنے کے لیے مناسب موقعوں پر تالیاں بھی پیٹ لیتے ہیں لیکن انہیں کبھی ٹوک کر نہیں کہتے "جناب جس ملک کے ۲۲ ہزار ۳ سو ۴۴ ڈاکٹر (صرف امریکہ میں ۶ ہزار پاکستانی ڈاکٹر ہیں) ملک سے باہر ہوں اس میں بیماری نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۱۷ ہزار ۵ سو ۱۸ انجینئر کوالالمپور سے لاس اینجلس تک غیروں کی بھٹیاں جھونک رہے ہوں اس کے پانچ چھ ہزار صنعتی یونٹ بند نہیں ہوں گے تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ساڑھے چار ہزار زرعی ماہرین کینیڈا، آسٹریلیا اور امریکہ کی بنجر زمینوں میں رزق بو رہے ہوں، اس کی لاکھوں ایکڑ اراضی پر قحط کاشت نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۲۱ ہزار دماغ مڈل ایسٹ، فارایسٹ، یورپ، آسٹریلیا اور امریکہ کی فیکٹریاں، کارپوریشنز اور بزنس فرمیں چلا رہے ہوں، اس کے ہاتھ میں کشکول نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۳۲ ہزار بینکار ٹوکیو، سنگاپور، دوبئی، لندن، زیورخ اور واشنگٹن میں بیٹھ کر یہودیوں کے لیے سرمایہ جمع کر رہے ہوں، اس میں اقتصادی بحران جنم نہیں لیں گے تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۸۱ ہزار بزنس مین دنیا کی بڑی بڑی مارکیٹوں میں میڈ ان یو ایس اے بیچیں گے اس کی صنعت کو زوال نہیں آئے گا تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے اڑھائی ہزار اساتذہ غیر ملکی اداروں میں غیر ملکی طالب علموں کو ترقی کا درس دیں گے اس میں ناخواندگی کا اندھیرا نہیں پھیلے گا تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۷ سو ۵۰ ماہرین غیر ملکی ایئر لائنز چلا رہے ہوں اس کے ۱۲ طیارے کباڑ نہیں بنیں گے تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۸ سو ۱۲ بہترین دماغ دنیا کی ۱۱ شپنگ کمپنیاں چلا رہے ہوں، اس کے ملاحوں کے چپو نہیں ٹوٹیں گے تو کیا ہوگا؟ اور جس ملک کے ۱۰ لاکھ کارکن امریکہ، ۲۳ لاکھ یورپ، ۲ لاکھ آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ، ۷ لاکھ جاپان، ملائیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ اور سنگاپور میں ہوں گے، جس کے ۲۰ لاکھ ہنرمند مشرقی یورپ، متحدہ عرب امارات، وسطی ایشیا اور جنوبی افریقہ کی مٹی کو سونا بنا رہے ہوں گے اس میں پسماندگی، غربت اور کرپشن نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟

عقل سوال کرتی ہے جب ایک ڈاکٹر عبدالقدیر اس ملک کو جو ۲۱ ویں صدی کے دروازے پر کھڑا ہو کر سائیکل کا چین اور بیرنگ تک باہر سے منگواتا ہے، دنیا کی ساتویں نیوکلیئر طاقت بنا سکتا ہے تو ملک سے باہر بیٹھ کر اس کی بربادی کا تماشا دیکھنے والے ایک لاکھ ۹۰ ہزار ڈاکٹر عبدالقدیر، پچاس ساٹھ لاکھ کام کرنے والے ہاتھ اور اتنے ہی سوچنے والے دماغ واپس آ کر اسے جاپان، سنگاپور اور کوریا نہیں بنا سکتے؟

ظلم یہ نہیں کہ ہم بہت پیچھے ہیں ظلم یہ ہے کہ ہم اس ٹیلنٹ کے باوجود پیچھے ہیں جو پوری دنیا کی اقتصادیات چلا رہا ہے، اگر آنے والے چند برسوں میں یہ ٹیلنٹ واپس نہ آیا تو کیا ہوگا؟ اس کا انداز جناب مرتضیٰ آرائیں جیسے دانشور بھی لگا سکتے ہیں اور ہم ان کلچرڈ، بیک ورڈ، پورٹیبل بھی۔

جاگنے والے

بھارت کی لوک سبھا نے جب یہ بل پاس کیا تو میں ٹیلیویژن کی آواز بند کر کے اخبار پڑھ رہا تھا۔ خبر کے آخر میں جہاں باقی صفحہ ۷ بقیہ ۳۹ لکھا تھا، پہنچ کر میں نے غیر شعوری طور پر سکرین پر نظر ڈالی تو مجھے سفید کرتوں، سفید دھوتیوں اور سفید ٹوپیوں میں ملبوس ارکان اسمبلی کے چہرے پر غیر معمولی چمک نظر آئی، زیادہ تر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے، کچھ ہاتھ ہلا ہلا کر مبارکبادیں دے رہے تھے اور چند ایک حضرات شوخی میں شاید نعرہ بازی کر رہے تھے، ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا شاید یہ لوگ بھارت کی پارلیمانی تاریخ کا کوئی اہم فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے پنجاب کے سکھوں کے حقوق بحال کر دیئے گئے ہوں، تامل علیحدگی پسندوں کے مطالبات مان لیے ہوں، ناگالینڈ کا مسئلہ حل ہو گیا ہو، بنگالیوں کے خلاف ریاستی نفرت ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہو۔ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دینے کا فیصلہ ہو گیا ہو یا مسلم کش فسادات کے خلاف کوئی سخت قانون پاس ہو گیا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال مجھے ریموٹ کنٹرول تلاش کرتے جتنی دیر لگی، میرا دماغ اتنی دیر طرح طرح کے مفروضے تراشتا رہا لیکن جب میں نے "ریموٹ" کا بٹن دبا کر ٹیلیویژن کی گویائی اسے لوٹا دی تو یہ سن کر حیران رہ گیا کہ لوک سبھا کے ممبران بھی پاکستانی ارکان پارلیمنٹ کی طرح اپنی تنخواہوں میں چار سو گنا اضافے پر جشن منا رہے تھے۔ مجھے حلق میں پتھر سے گرتے محسوس ہوئے۔ میں نے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ڈش کا ریسیور آف کرنے کے لیے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا، لیکن اس سے قبل کہ خفیف سے جھماکے کے ساتھ شیشہ بے رنگ ہو جاتا، سکرین پر ارکان پارلیمنٹ کی پرانی اور نئی تنخواہوں کا چارٹ آ گیا۔

جی ہاں مضبوط اقتصادی بنیادوں پر کھڑے اس ملک میں، جس کی بندرگاہوں سے روزانہ کروڑوں ڈالر کا سامان عالمی منڈیوں کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے، جس کے ڈیڑھ لاکھ بڑے صنعتی یونٹوں کی بھٹیاں پورا سال گرم رہتی ہیں، جس کے بارہ بارہ ایکڑ کے فارم دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار دیتے ہیں، جس کے گنگا اور جمنا جب جوش میں کناروں سے باہر نکلتے ہیں تو دور دور تک زرخیزی پھیلاتے جاتے ہیں، جو دنیا کا چوتھا بڑا سیاحتی مرکز ہے، جو دنیا کا ساتواں بڑا صنعتی زون ہے اور جو قدرتی وسائل کے حوالے سے دنیا کا بارہواں بڑا ملک ہے، اس کا رکن قومی اسمبلی (لوک سبھا) ۲ ستمبر ۹۷ء تک صرف پندرہ سو روپے ماہانہ تنخواہ

وصول کرتا تھا اور ان لوگوں نے ۱۵ سو سے ۶ ہزار روپے ماہانہ تک ''پروموشن'' کے لیے کتنے عرصے تک کندھے سے کندھا ملا کر جدوجہد کی۔ اپنی اپنی پارلیمانی پارٹیوں میں کتنی طویل آئینی جنگ لڑی تھی۔ پارلیمنٹ میں کب تک اپنے ''حق'' کے لیے ''یدھ'' لڑا، صرف یہ لوگ جانتے ہیں یا بھارت کی پارلیمانی تاریخ، کیونکہ ان لوگوں نے جب اپنی تنخواہوں میں اضافے کا سوال اٹھایا، انہیں جواب ملا، جس ملک کے ۴ کروڑ عوام فٹ پاتھوں پر سوتے ہوں، جس ملک کے سات صوبوں میں جنگ ہو رہی ہو، جس ملک کے پچاس فیصد عوام غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہوں، جس ملک میں بیروزگاری اپنی انتہائی حدوں کو چھو رہی ہو، جس ملک میں عصمت فروشی سب سے بڑی انڈسٹری ہو، جس ملک کی زیادہ تر پنچتیں مہلک بیماریوں سے جنگ میں صرف ہو رہی ہوں اور جس ملک کا ہنرمند اوسطاً ۸ روپے روزانہ کماتا ہو، اس ملک کے رکن پارلیمنٹ کے لیے ۵۰ روپے روزانہ کم نہیں........ یہ تو خیر ہو آئی کے گجرال کی، سوا درجن سیاسی پارٹیوں پر مشتمل یونائیٹڈ فرنٹ کی کمزور حکومت کی اور ''را'' کے اس خفیہ سروے کی جس میں خدشہ ظاہر کیا گیا کہ اگر ارکان پارلیمنٹ کی تنخواہیں نہ بڑھیں تو آسمان کو چھوتی مہنگائی ان لوگوں کو کرپشن پر مجبور کر دے گی، لہٰذا ان کی تنخواہیں ۴ سو گنا اضافے کے بعد ۶ ہزار روپے ماہانہ کر دی گئیں۔

ٹی وی کے سامنے سے اٹھتے ہوئے مجھے وہ پاکستانی سفیر یاد آ گیا، جس نے بھارت سے واپسی پر مجھے بتایا تھا: ''لوک سبھا میں ابھی تک ایسے ممبران کی تعداد کم نہیں، جو رکشوں اور ٹیکسیوں پر اجلاس میں شرکت کے لیے آتے ہیں، مانگ کر اخبار پڑھتے ہیں، سودا ادھار لیتے ہیں، بارش میں بوسیدہ چھتری لے کر گھروں سے نکلتے ہیں، جوتے بغل میں دبا کر کیچڑ سے گزرتے ہیں اور گلی کے نل سے پانی بھر کر لاتے ہیں۔''

اور مجھے وہ پاکستانی سیاستدان بھی یاد آیا، جس نے بڑے دعویٰ سے کہا تھا:

''پاکستان کی پارلیمنٹ میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جس کے پاس ذاتی گھر، گاڑی اور بینک بیلنس نہ ہو، جس کا روزانہ کا خرچ کم از کم پانچ ہزار نہ ہو، جس کے بچے مہنگے ترین اداروں میں نہ پڑھتے ہوں، جو بچوں کی شادی میں پچاس ساٹھ لاکھ روپے خرچ نہ کرتا ہو، جس کے الیکشن کے اخراجات تیس چالیس لاکھ سے کم نہ ہوں اور جو اپنے باڈی گارڈز کو ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ نہ دیتا ہو۔''

اور مجھے وہ سابق سپیکر بھی یاد آ گیا، جس نے ایک نجی محفل میں کہا تھا:

''پاکستان کی پارلیمانی تاریخ میں ارکان اسمبلی کی تنخواہوں میں اضافے کے بل واحد ''ایشوز'' تھے جن پر کسی رکن اسمبلی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، جبکہ ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جس کے لیے دس بیس ہزار کوئی ناگزیر رقم ہو۔''

اور مجھے وہ اقتصادی ماہر بھی یاد آ گیا، جس نے بڑے دکھ سے کہا تھا:

''کیا وہ ملک اقتصادی موت نہیں مر رہا جس کے کھیتوں میں صرف بھوک اگتی ہو، جس کے دریا

صرف سیلاب لاتے ہوں، جس کے کارخانے صرف سرمایہ داروں کے ٹیکسال ہوں اور جس کی پارلیمنٹ صرف چوروں، سمگلروں اور نادہندوں کی محافظ ہو۔"

اور مجھے وہ ریٹائرڈ جنرل بھی یاد آ گیا، جس نے بڑے دکھ سے کہا تھا:

"دو اذیتیں ہیں، جو مجھے چین نہیں لینے دیتیں، اول پاکستانی سیاستدان جو سیاست تو پاکستان کی کرتا ہے لیکن خود پاکستانی نہیں، دوم ہندوستانی سیاستدان، جو سیاست تو بین الاقوامی کرتا ہے، لیکن خود بری طرح ہندوستانی ہے۔"

اور مجھے وہ عالم بھی یاد آیا جو ساری رات دنیا بھر کے کافروں کو جہنم کی آگ میں جلاتا رہا اور نماز فجر کے بعد جب میں نے اس سے پوچھا زمین، نیکی، اچھائی اور امن پھیلانے والے کافر کی درازی عمر کے لیے دعا گو ہوتی ہے یا ایک بدنیت، بدطینت اور عمل سے خالی "مومن" کے لیے؟ تو اس نے غصے سے کہا روز حشر کافروں کے حامی بھی کافروں کے ساتھ ہی اٹھائے جائیں گے۔

ہاں ٹی وی کے سامنے سے اُٹھتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے سوال کیا...... عمل عظیم ہے یا خواب؟

تو جواب آیا جاگنے والے کے لیے عمل اور سونے والوں کے لیے خواب۔

پوچھنے والا کوئی نہیں

یہ شاید ۹۷ء جون کی بات ہے، بھارت کو اپنی اقتصادی پوزیشن کو سنبھالا دینے کے لیے ۵۰ ارب روپے کی ضرورت پڑی۔ کابینہ کا اجلاس ہوا تو ایک وزیر نے آئی ایم ایف سے مختصر مدت کے لیے قرضہ لینے کا مشورہ دیا۔ دوسرے نے قومی املاک بیچ کر رقم حاصل کرنے کی تجویز پیش کی۔ تیسرا بولا کیوں نہ کسی ''برادر'' ملک سے چند ماہ کے لیے ادھار پکڑ لیا جائے۔ چوتھے کا مشورہ عجیب تھا، کہنے لگا، ہم بھارت ہی میں کسی بڑے صنعت کار سے رقم لے لیتے ہیں، سال چھ ماہ میں ادا کر دیں گے، ابھی تجاویز کا سلسلہ جاری تھا کہ بھارت کے وزیر خزانہ پی چدمبرم کھڑے ہوئے، وزیراعظم سے بولنے کی اجازت چاہی اور پھر کابینہ کے ارکان کو مخاطب کر کے بولے

''حضرات اگر میں آپ کو اس سے کہیں زیادہ رقم حاصل کرنے کا طریقہ بتاؤں جو مستقبل میں واپس کرنی پڑے اور نہ ہی اس پر سود دینا پڑے تو............''

سب نے بے صبری سے کہا: ''ہاں ہاں، بتائیے۔''

چدمبرم نے عادتاً کان کی لو چٹکی میں دبائی، اسے ذرا سا مسلا اور پھر گویا ہوا:

''حضرات میری سٹڈی کے مطابق اس وقت بھارت میں لگ بھگ ۵ کھرب روپے کالے دھن کی صورت میں موجود ہیں، جنہیں بھارت سرکار استعمال کر سکتی ہے اور نہ ہی وہ لوگ جن کے قبضے میں یہ رقم ہے، اگر ہم کوئی ایسی سکیم پیش کر دیں جس سے یہ ۵ کھرب روپے جائز شکل اختیار کر جائیں تو دو فائدے ہوں گے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکے، حاضرین کے چہرے پر نظریں جمائیں، ناف پر ہاتھ باندھے اور پھر بولے:

''دو فائدے ہوں گے، ایک سرکار کو ٹیکس کی شکل میں ۴ ہزار کروڑ سے لے کر ۷ ہزار کروڑ تک رقم مل جائے گی، دوسرا ایک کھرب ۹۳ ارب ۳ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے تجوریوں، خفیہ اکاؤنٹس اور بوریوں سے نکل کر سرکولیشن میں آ جائیں گے اور......''

اچانک ایک رکن اٹھا، جھک کر وزیراعظم سے اجازت لی اور پھر چدمبرم کو ٹوک کر بولا: ''لیکن منسٹر آپ اتنے وثوق سے ریکوری کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں؟'' چدمبرم نے آنکھیں بند کر کے یوگیوں کی طرح لمبا

سانس لیا اور پھر اسے آہستہ آہستہ خارج کرتے ہوئے بولے: ''میں اسی طرف آرہا ہوں۔'' میرا خیال ہے اگر ہم آج سے پورے بھارت میں اعلان کر دیں، جس کے پاس جتنا کالا دھن ہے، وہ اسے ظاہر کرے، اس میں سے ۳۰ فیصد سرکاری خزانے میں جمع کرائے اور باقی ۷۰ فیصد کاروبار میں لگا دے، وہ بھی خوش ہو جائیں گے اور سرکار بھی مطمئن ہو جائے گی۔''

''لیکن اس سے سرکار کو کتنی رقم حاصل ہوگی؟'' دوسرے وزیر نے سوال کیا۔ ''ہم بڑی آسانی سے ۴۰ سے ۷۰ ارب روپے حاصل کر سکتے ہیں۔'' چندمبرم اسی اطمینان سے بولے۔

ایک دوسرا وزیر کھڑا ہوا، بولنے کی اجازت چاہی اور پھر چندمبرم کو مخاطب کر کے بولا: ''آپ تو کہہ رہے تھے ملک میں ۵ کھرب روپے زیر زمین ہیں، لیکن برآمد صرف پونے دو کھرب کر رہے ہیں؟'' چندمبرم نے دوبارہ کان کی لو چٹکی میں دبائی اور وزیراعظم کو متوجہ کر کے بولے: ''میری سٹڈی کے مطابق اس سکیم سے صرف اتنا روپیہ ہی باہر آسکتا ہے کیونکہ بھارت کے اندر صرف ۲ کھرب روپے چھپے ہیں، باقی تین کھرب ملک سے باہر سیکرٹ اکاؤنٹس میں پڑے ہیں، انہیں حاصل کرنے کے لیے کسی دوسرے وقت، کوئی دوسری سکیم بنائیں گے۔'' وزیراعظم نے گردن ہلائی اور پھر انہیں مخاطب کر کے بولے: ''لیکن مسٹر چندمبرم اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہم سکیم کا اعلان کریں اور لوگ کالا دھن لے کر وزارت خزانہ کے حضور پیش ہو جائیں۔''

''ہاں، یہ بات بھی تفصیل طلب ہے۔'' چندمبرم نے گردن اثبات میں ہلا کر کہا: ''میری تجویز ہے لوگوں کو ۳۱ دسمبر ۹۷ء تک وقت دیا جائے، اس دوران جو لوگ اس سکیم سے فائدہ اٹھالیں، ٹھیک، ورنہ بصورت دیگر یکم جنوری ۹۸ء سے جس سے بھی کالا دھن برآمد ہو اسے موقع پر ہی گرفتار کر لیا جائے اور قید کی سزا سنا دی جائے، دیٹس آل۔'' چندمبرم جھکا، سب کا شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گیا۔

اور پھر کابینہ کا اجلاس ختم ہوتے ہی بھارت میں وی ڈی آئی ایس (والنٹیری ڈس کلوژر آف انکم سکیم) کا اعلان کر دیا گیا، رشوت خوروں، منشیات فروشوں، ڈکیتیوں اور چوروں کو ۳۱ دسمبر تک کا وقت دے دیا گیا، ملک بھر میں اپنے سنٹرز قائم کر دیئے گئے جہاں لوگ کالا دھن کی رپورٹ کر سکتے ہیں اور پھر اس کے بعد اخبارات کے رپورٹروں نے دیکھا، کالے دھن کے مالکان نے تین تین گھنٹے قطاروں میں کھڑے ہو کر رقم جمع کرائی، یہاں تک کہ ۳ جنوری ۱۹۹۸ء کے اعداد و شمار کے مطابق سرکاری خزانے میں تقریباً ۷۰ ارب روپے جمع ہو گئے، جبکہ چندمبرم کی پیشین گوئی کے مطابق ایک کھرب ۶۳ ارب ۳ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے بوریوں سے نکل کر زری معاشی دائرے میں داخل ہو گئے، اب اس رقم سے کاروبار ہوگا، بے روزگاری ختم ہوگی، روپیہ ایک ہاتھ سے نکل کر دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ میں جائے گا اور بھارت کی معاشی ترقی کی رفتار تیز ہو جائے گی۔

اس لمحے جب بھارتی اخبارات چندمبرم کو بھارت کی اقتصادی تاریخ کا ہیرو قرار دے رہے تھے، مجھے ۱۹۹۲ء کا ایک منظر یاد آرہا ہے، جب ایک ۲۲ واں گریڈ اسلام آباد کے قومی بچت کے ایک مرکز میں داخل

ہوا تو منیجر نے پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین اور سابق سیکرٹری خزانہ کا کھڑے ہو کر استقبال کیا، صاحب کے لیے چائے منگوائی گئی، آپریٹر کو ''میں مصروف ہوں، کوئی فون نہ ملایا جائے'' کا حکم جاری کیا گیا، اے سی تیز کر دیا گیا اور پھر بڑے ادب سے پوچھا گیا: ''جی سر میرے لائق کوئی خدمت'' ۲۲ ویں گریڈ نے تحکمانہ انداز میں کہا: ''میرے پاس کچھ نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ ہیں، انہیں چینج کرنا چاہتا ہوں۔'' ۲۲ ویں گریڈ نے بریف کیس کھولا اور ۶۰ ہزار کے سرٹیفکیٹس نکال کر منیجر کے حوالے کر دیئے۔ منیجر نے گھنٹی بجائی، چپڑاسی بھجوا کر کیشیئر بلوایا اور سرٹیفکیٹس اس کے حوالے کر کے رقم لانے کا حکم دے دیا، چائے آئی، گپ شپ ہوئی، لطیفے سنائے گئے، خوشامد کی گئی، اتنے میں کیشیئر رقم لے کر آ گیا، ۲۲ واں گریڈ نے نوٹ گنے تو ناگواری سے ناک سکیڑ کر بولا: ''منیجر یہ تو کم ہیں'' منیجر نے چونک کر کیشیئر کی طرف دیکھا، کیشیئر نے نہایت ادب سے ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کو مخاطب کر کے عرض کیا: ''جناب اس میں سے ٹیکس کٹ گیا۔'' ۲۲ ویں گریڈ نے مڑ کر گھور کر دیکھا تو منیجر شرمندہ سا ہو کر بولا: ''سر این ڈی ایس سی پر ویلتھ ٹیکس لاگو ہوتا ہے۔'' ۲۲ ویں گریڈ نے رقم میز پر رکھی اور کھردرے سے لہجے میں بولا: ''منیجر آپ میرے سرٹیفکیٹ واپس منگوا دیں، میں انہیں چند روز بعد چینج کراؤں گا۔'' منیجر نے فوراً گھنٹی دے دی۔

ٹھیک چار روز بعد وہ ۲۲ واں گریڈ دوبارہ مرکز میں داخل ہوا، سیدھا منیجر کے کمرے میں گیا اور اس کی میز پر ایک سفید کاغذ پھینک کر دھاڑا: ''افسر اب تم میری ایک پائی نہیں کاٹ سکتے۔'' منیجر نے گڑبڑا کر کاغذ اٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا، سفید کاغذ کے ایک کونے پر جلی حروف میں سنٹرل بورڈ آف ریونیو چھپا تھا، دوسرے کونے پر ٹائپ کے باریک حروف میں آرڈر نمبر 30/92 لکھا تھا، جبکہ اس کے نیچے ملک بھر کے نیشنل سیونگ سنٹرز کو چیئرمین کی طرف سے واضح طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ تمام سرٹیفکیٹ جن پر زکوٰۃ کاٹی جا سکتی ہے، آج سے ویلتھ ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے جاتے ہیں۔ منیجر نے پریشانی کے عالم میں رومال سے پسینہ صاف کیا، گھنٹی دے کر ۲۲ ویں گریڈ کی رقم منگوائی، اس کے حوالے کی اور اسے گیٹ تک رخصت کرنے آیا۔

ادھر کمپیوٹر پر بیٹھے کلرک نے بورڈ کے چند حروف اور کچھ ہندسے دبائے اور پرنٹر سے ایک شیٹ نکال کر پریشان حال منیجر کو پیش کر دی۔ منیجر نے چونک کر کلرک کو دیکھا اور پھر تھکے تھکے لہجے میں پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' وہ بولا: ''سر اس شخص نے اپنے چند سو روپے بچانے کے لیے صرف ۵۰ سیکنڈ میں قومی خزانے کو ۸۳ لاکھ ۲۲ ہزار ۱۳ روپے کا نقصان پہنچایا، جو اگلے برس تک اتنے ارب بن جائے گا۔''

منیجر نے افسردہ لہجے میں جواب دیا: ''ہاں، ان لوگوں کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔''

آقا

ہاں، جس ملک کی ۷۰ فیصد آبادی کا ''خدا'' ظالم، ان پڑھ اور جاہل جاگیردار ہوگا اس ملک میں بھوک، افلاس، جہالت اور بیماری نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟

جی ہاں، جس ملک کی کل آبادی کا صرف ۷ فیصد حصہ اس کی ۶۰ فیصد قابل کاشت زمین پر پھن پھیلائے بیٹھا ہوگا، جس ملک کے 0.1 فیصد جاگیرداروں کے قبضہ میں ۱۵ فیصد زرخیز زمین ہوگی، جبکہ باقی 15.4 فیصد سونا زمین 1.1 فیصد جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہوگی، جس کے پنجاب کے 0.5 فیصد شاہ، لغاری، مزاری، کھوسے، مخدوم، چودھری، ملک، ٹوانے اور گیلانی ۶۰ فیصد زمین کے مختار کل ہوں گے، جس کے سندھ کے ایک فیصد پیر، جتوئی، جام اور شاہ ۴۰ فیصد رقبے کے بادشاہ ہوں گے، جس کے سرحد کے 0.12 فیصد خٹک، آفریدی، نواب، الائی، میر اور باچے 12.5 فیصد زمین کے ''خدا'' ہوں گے، جس کے بلوچستان کے مری، مینگل اور بگٹی ایک ایک انچ زمین کے دیوتا ہوں گے، اس ملک کے ۱۴ کروڑ عوام کمی، مزارعے اور ہاری نہیں ہوں گے تو کیا ہوں گے؟

جی ہاں، جس ملک کے ۹۳ فیصد چھوٹے کاشتکاروں کے پاس صرف ۳۷ فیصد زمین ہوگی، جس ملک کے ۹۳ فیصد کاشتکاروں میں سے ۶۵ فیصد کسانوں کے پاس صرف ۱۵ فیصد قابل کاشت زمین ہوگی، جس کے پنجاب کے ۸۰ فیصد کسانوں کے پاس صرف ۷ فیصد نہری اور بارانی زمین کا قبضہ ہوگا، جس کے سندھ کے ۶۰ فیصد ہاریوں، چھوٹے زمینداروں اور کاشتکاروں کے پاس صرف ۱۲ فیصد زمین ہوگی، جس کے سرحد کے ۲۷ فیصد کاشتکاروں کے پاس صرف 8.2 فیصد رقبہ ہوگا اور جس کے بلوچستان کے ۹۰ فیصد کسانوں کے ہاتھ میں ایک مرلہ زمین نہیں ہوگی، اس ملک کے عوام امدادی گندم سے پیٹ نہ پالیں تو کیا کریں؟

جی ہاں، جس ملک کا سارا نہری پانی، بیج، کھاد، کیڑے مار ادویات، زرعی آلات اور بینک جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہوں۔ جس کے گیلانیوں، مخدوموں، شاہوں، چودھریوں، لغاریوں، کھوسوں اور جاموں نے زرعی ترقیاتی بینک کے ۲ ارب روپے مار لیے ہوں، جس کے جاگیرداروں نے ۹۵-۱۹۹۴ء میں کپاس کی فصل سے ۳۰ ارب ۶۰ کروڑ روپے کماد، گندم اور دالوں سے کمائے ہوں لیکن ایک روپیہ ٹیکس نہ دیا ہو،

جس کے ''شہزادے'' ہر سال ۳ ارب ۸۲ کروڑ ۲۷ لاکھ روپے مجروں، کتا دوڑوں، ریچھ کی لڑائیوں، بیٹر بازیوں اور عیاشیوں میں ضائع کرتے ہوں، جس کے ''شاہ'' ہر سال ۱ ارب ۲۱ کروڑ کی گاڑیاں خریدتے ہوں، سوا کروڑ روپے کا غیر ملکی تمباکو پھونکتے ہوں، جس کے ''شہنشاہوں'' کی شہری آبادی میں ایک کھرب ۳ ارب ۲۸ کروڑ کی جائیدادیں ہوں اور جس کے ''سکندروں'' کے ۱۵ لاکھ ملازمین، گارڈز اور ہرکارے ہوں، اس ملک میں بیماری، بے برکتی اور افسردگی نہیں ہوگی، تو کیا ہوگا؟

جی ہاں، جس ملک کی پارلیمنٹ، بیوروکریسی، لوکل باڈیز اور فوج پر جاگیرداروں کا قبضہ ہو، جس کے ۷۰ فیصد عوام کی گردن زمینداروں کے جبڑوں میں دبی ہو، جس کی ساری معیشت فرعونوں کے قبضے میں ہو، جس کا نظریہ، جس کی سالمیت اور جس کی بقا بے حس لوگوں کے قدموں میں پڑی ہو، اس ملک کے عوام رینگنے والے کیڑے نہ بنیں تو کیا بنیں؟

جی ہاں، جس ملک کے ''برہمن'' نہریں نہ کھدنے دیں، سکول نہ بننے دیں، سڑکیں نہ نکلنے دیں، بجلی نہ لگنے دیں، ٹریکٹر نہ چلنے دیں، ووٹ نہ ڈالنے دیں، مردم شماری نہ ہونے دیں، گاؤں میں ریڈیو نہ بجنے دیں، اخبار نہ آنے دیں، گندم نہ بونے دیں اور سوال نہ کرنے دیں، اس ملک میں صرف شودر نہ بسیں تو کون بسے؟

جی ہاں، جس ملک میں ۲۰ ویں صدی کی آخری ساعتوں تک فیوڈل ازم قائم ہو، ہاں جس ملک میں ظلم کا وہ کاروبار تا دم تحریر جاری و ساری ہو، جسے برطانیہ نے ۱۹۲۶ء میں اکھاڑ پھینکا تھا، جسے بھارت نے آزادی کے ساتھ ہی کچل دیا تھا، جس پر پوری دنیا میں کم و بیش پابندی لگ چکی ہو، اس ملک میں لوگ گونگے، بہرے اور بے حس نہ بنیں، تو کیا بنیں؟

جی ہاں، اس وقت جب اقوام متحدہ کے اکنامک ڈویلپمنٹ انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین پوری دنیا کے مطالعے کے بعد اعلان کر چکے ہوں کہ ''لینڈ ریفارمز کے بغیر کوئی ملک ایک انچ ترقی نہیں کر سکتا۔'' انسانی بہبود کے سارے عالمی ادارے اس بات پر متفق ہو چکے ہوں کہ قدرتی وسائل ضائع کرنے والے ملک زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتے۔'' دنیا بھر کے زرعی ادارے یہ بنیادی نکتہ پا چکے ہوں کہ ''جو ملک اپنا اناج اپنی زمین پر کاشت نہیں کرتے وہ بھوکے مر جاتے ہیں۔'' تمام عالمی ماہرین معیشت اس نتیجے پر پہنچ چکے ہوں کہ ''جس ملک کے کمانے والے ٹیکس نہیں دیتے وہ چل نہیں سکتے۔'' کرہ ارض کے تمام سماجی دانشوروں کا متفقہ فیصلہ ہو کہ ''جس ملک میں مزدوروں، کسانوں اور کارکنوں کی کمائی ست الوجود، جاہل، حریص جاگیردار، سرمایہ دار اور کارخانے دار کھا جاتے ہوں، وہاں ترقی نہیں ہوتی۔'' ہاں ۲۱ ویں صدی میں بھی جس ملک میں جاگیرداری نظام اپنے پورے کروفر سے چل رہا ہوں وہاں بھوک، افلاس، جہالت اور بیماری نہ ہو تو کیا ہو؟

ہاں قارئین کرام! میں جب بھی اس ملک کی دم توڑتی معیشت پر نظر ڈالتا ہوں، عام آدمی پر بڑھتا ہوا دباؤ محسوس کرتا ہوں، تمام بنیادی اداروں کو برباد ہوتے دیکھتا ہوں، ملک سے شہریوں کی کمٹمنٹ کمزور

ہوتے، انھیں ضروریات زندگی کے ہاتھوں خوار ہوتے، روزگار، صحت اور تعلیم کے پیچھے بھاگتے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں خرابی کہاں ہے؟ کیا اس ملک میں ہاتھ سے کام کرنے والوں کی کمی ہے، کیا اس ملک میں سوچنے اور منصوبہ بندی کرنے والے دماغ نہیں ہیں؟ کیا اس ملک میں زمین نہیں، کیا اس ملک میں زمین کو زرخیز بنانے کے لیے پانی نہیں، کیا اس ملک میں چاروں موسم نہیں، کیا اس ملک میں بیج کو نمو دینے والی ہوا نہیں چلتی اور کیا اس ملک پر فصل پکانے والا سورج طلوع نہیں ہوتا؟

ہاں قارئین کرام! یہاں زمین ہے، ہوا ہے، پانی ہے، بیج ہے، بونے اور کاٹنے والے ہاتھ ہیں لیکن اس کے باوجود بھوک ہے، محتاجی ہے "کل کیا ہوگا؟" کے اندیشے ہیں، کبھی آپ نے سوچا ایسا کیوں ہے؟ جی ہاں، جب اللہ کی زمین پر جاگیردار فرعون بن کر قابض ہوگا تو کھیتوں میں بھوک نہیں اُگے گی تو کیا اُگے گا؟

مجھ سے یہ بیزار، افسردہ اور پریشان حال نظریں پوچھتی ہیں، اللہ نے جو زمین اپنے بندوں کے لیے تخلیق کی اسے فرعونوں سے چھڑوانے کے لیے کوئی موسیٰ آئے گا۔ میں جواب دیتا ہوں نہیں، جو قومیں اپنے سے بدتر، جاہل اور بدکردار لوگوں کو اپنا آقا بنالیں، ان کے لیے کبھی کوئی موسیٰ نہیں اترا کرتا۔

''دو گھنٹے''

کاش دیکھنے، سننے اور دلوں کے بھید پانے والا رب ۵۸ برس، ۸ ماہ اور ۱۵ روز بعد بھی ایک بار منٹو پارک کی طرف دیکھ لیتا، مینار پاکستان کے سائے میں کھڑی بے نظیر کی پکار سن لیتا، دلوں میں چھپے خوف کو دعا سمجھ کر قبول کر لیتا اور ججوں کی کرسیوں پر واقعی طالبان بٹھا دیتا تو اس ملک کے لیے، اس ملک کے پونے چودہ کروڑ سسکتے، رینگتے، تڑپتے لوگوں کے لیے اس سے بڑا انعام کیا ہوتا؟

میں آج سے چھ ماہ پہلے کابل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں داخل ہوا تو سامنے قالین کے بوسیدہ ٹکڑے پر ایک سرخ و سپید ''جوان'' بیٹھا تھا، اس کے سامنے پڑے پیالے سے بھاپ اٹھ رہی تھی، کوٹھری میں قہوہ کی خوشبو پھیلی تھی، وہ مجھے دیکھ کر اٹھا، بغل گیر ہوا، شفقت سے سامنے بٹھایا، ایلومینیم کی کیتلی سے کچی مٹی کے پیالے میں قہوہ انڈیلا، میرے سامنے رکھا، رات کا خشک باسی نان توڑ کر آدھا مجھے پیش کیا اور باقی قہوے میں ڈبو کر خود کھانے لگا، مجھ سے نان کا وہ ٹکڑا نگلا نہ گیا تو وہ شرمندہ سا ہو کر بولا ''معاف کرنا بھائی ہمارے پاس آپ کی خدمت کے لیے اس وقت اور کچھ نہیں۔'' افغان اسی شرمندہ لہجے والے شخص کو امیر المومنین کہتے ہیں، اس جوان کو جو میرے سامنے بیٹھ کر اس رغبت سے سوکھا نان کھا رہا تھا جیسے وہ پیرس کے کسی پیزا ہاؤس کا کوئی شہکار ہو، میں نے سوچا یہ واقعی اسی اعزاز کا اہل ہے کیونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد یہی وہ شخص ہے جس کے دروازے پر کوئی دربان نہیں، جس کا کوئی بھی افغان راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے، جس کی خوراک وہی سوکھا، نان اور آدھا پیالہ قہوہ ہے جو اس وقت اس کے تمام ساتھیوں کے سامنے رکھا ہے۔

میں اس کوٹھری سے باہر نکلا تو میں نے وہاں ایک عجیب کابل دیکھا، ایک ایسا پر امن، مطمئن اور شاداں کابل جسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہی وہ شہر ہے جس کے ٹیلی ویژن سنٹر سے ۲۱ برس تک بلیو فلمیں نشر ہوتی رہیں، جہاں ۱۴ برس تک روسی فوجی افغان جرنیلوں کی بیویاں اٹھا کر کیمپوں میں لے جاتے رہے، جہاں برسوں تک روسی کرنیلوں کے خیموں سے افغان وزراء امراء اور سفراء کی بہو بیٹیوں کے بین سنائی دیتے رہے، جہاں سے جب روسی پلٹے تو وہاں ایک ایسی ''باسٹرڈ جنریشن'' پیدا ہو چکی تھی جن کے چہروں پر یوکرائن کے نقش جھلکتے تھے، جہاں ۱۹۹۵ء کے آخر تک روٹی ملتی نہ ملتی لیکن واڈکا کی بوتلیں اور بیئر کے ٹین ضرور

ملتے تھے، جہاں جہاد کے بعد آپس میں برسر پیکار ''مجاہدین'' دوسرے کمانڈر پر شب خون مار کر اس کے علاقے سے لڑکیاں اٹھا لے جاتے تھے، جہاں ایک چودہ سالہ لڑکے کے ''حقوق ملکیت'' پر دو قندھاری کمانڈروں میں ٹینکوں کی لڑائی ہوئی تھی، جہاں مجاہدین کے ایک کیمپ میں چار چار سال کی بچیوں سے گینگ ریپ ہوا تھا، جہاں مجاہدین کے ایک ٹھکانے سے خواتین کی ۲۳ برہنہ لاشیں برآمد ہوئی تھیں، جہاں ''مجاہدین'' کے خوف سے لوگ خواتین اور نابالغ بچوں کے ساتھ کوئٹہ سے چمن تک سفر نہیں کرتے تھے، جہاں سارے محل، حویلیاں، کوٹھیاں، کھیت اور باغ مال غنیمت کی طرح بانٹے جا چکے تھے۔

میں نے میزبان سے پوچھا ''آپ نے چوتھائی صدی سے بگڑے اس معاشرے پر کیا پڑھ کر پھونکا کہ پچھلے دو برس سے یہاں کوئی چوری نہیں ہوئی، چیزوں کے نرخ اوپر نیچے نہیں ہوئے، کسی نے کسی کا گلا نہیں کاٹا، کسی نے خواتین کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھا، کسی نے جھوٹ نہیں بولا، کسی چیز پر ناجائز قبضہ نہیں ہوا۔'' میزبان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''کچھ بھی نہیں، ہم نے تو صرف انصاف قائم کیا، معاشرہ خود ہی سدھر گیا۔'' میں نے پوچھا ''کیسے؟'' بولا ''بہت ہی سیدھے طریقے سے، ہم نے اعلان کیا آج کے بعد جس نے جرم کیا وہ خود کو قرآن وسنت کے مطابق سزا کے لیے تیار پائے اور بس'' میں نے عرض کیا ''ذرا مثالیں دے کر واضح کریں۔'' میزبان نے اسی اطمینان سے جواب دیا ''ہاں کیوں نہیں، ہم نے اعلان کیا جن کی زمینوں، جائیدادوں پر دوسرے لوگ قابض ہیں وہ ثبوت لے کر آ جائیں ہم دو گھنٹوں میں قبضہ دلا دیں گے، لوگ آ گئے، ہم نے واقعی دو گھنٹے میں ان کی جائیداد کا قبضہ دلا دیا، ہم نے قاتل پکڑا، دو گھنٹے میں فیصلہ کر کے فارغ کر دیا، ہم نے گراں فروش پکڑا، پکڑ کر دو گھنٹے میں الٹا لٹکا دیا، کوئی چور ہمارے ہتھے چڑھا ہم نے دو گھنٹے میں ہاتھ کاٹ کر دوسرے ہاتھ میں پکڑا دیا اور بس امن ہی امن، سکون ہی سکون۔'' میں نے پوچھا ''ان چنگیزی اقدامات کا کیا نتیجہ نکلا'' بولا ''ہم نے کاغذ کے ٹکڑوں پر کچی پنسل سے ہندسے لکھ کر کہا، یہ نوٹ ہیں، پورے دو سال تک لوگوں نے انہیں نوٹ سمجھا افغانستان میں انہی سے ساری خرید و فروخت ہوئی، کابل میں ٹیکسی کا نظام ایک ۱۶ برس کے بچے کے حوالے کر دیا، آج تک کوئی شکایت نہیں آئی، نرخ پر اس قدر قابو ہے کہ کابل یونیورسٹی کا پروفیسر ہزار روپے تنخواہ میں گزارہ کرتا ہے، گورنر صبح سے شام تک سڑکوں پر گشت کرتے ہیں، کوئی بھی شخص انہیں روک کر شکایت کر سکتا ہے، جس کا ازالہ فوراً ہوتا ہے۔'' میں نے پوچھا ''آپ لوگ دو گھنٹے میں انصاف کیسے کر لیتے ہیں'' اس نے ہنس کر کہا ''منصف کی نیت صاف ہو اور دل میں ایمان کی رتی موجود ہو تو انصاف کے لیے دو گھنٹے بھی دو صدیاں ہوتی ہیں۔''

کاش دیکھنے، سننے اور دلوں کے بھید جاننے والا رب ۵۸ برس، ۸ ماہ اور ۱۵ روز بعد بھی ایک بار منٹو پارک کی طرف دیکھ لیتا، مینار پاکستان کے سائے میں کھڑی بے نظیر کی پکار سن لیتا، دلوں میں چھپے خوف کو دعا سمجھ کر قبول کر لیتا اور ججوں کی کرسیوں پر طالبان بٹھا دیتا تو اس ملک کے پونے چودہ کروڑ

سکتے، رینگتے، تڑپتے لوگوں کے لیے اس سے بڑا انعام کیا ہوتا؟

کاش بے نظیر شکوے سے پہلے یہ حقیقت جان لیتی کہ یہ خوف نہیں، خواب ہے، ان لوگوں کا خواب جو دو گھنٹوں میں انصاف چاہتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ یہ انصاف انہیں جج دیتے ہیں یا طالبان!

(نوٹ: یہ کالم ۲۸ نومبر کو عوامی اتحاد کے جلسے میں بے نظیر کے اس خطاب سے متاثر ہو کر لکھا گیا جس میں محترمہ نے خدشہ ظاہر کیا تھا "ججوں کی کرسیوں پر طالبان کو بٹھانے کا پروگرام بن چکا ہے۔")

کہیں ایسا نہ ہو جائے

نام لکھنا تو مناسب نہیں کیونکہ جیسے بھی ہیں آخر ہیں تو دوست ہی!

فکری طور پر پورے امریکی ہیں، عالمی بینک کے ملازم ہیں، ڈالروں میں تنخواہ لیتے ہیں، سال کے دس ماہ واشنگٹن میں گزارتے ہیں، دو مہینے تیسری دنیا کی زبوں حالی کا جائزہ لینے کے لیے پاکستان جیسے چھوٹے ممالک میں بسر کرتے ہیں، ماں اور بیوی دونوں امریکی ہیں، بچے کچھ کچھ دیسی اور زیادہ زیادہ ''ولائتی'' ہیں پاکستان کے ساتھ تعلق کی وجہ ان کے والد ہیں جو منڈی یزمان کے رہنے والے تھے کہیں بہت پہلے غربت سے مجبور ہو کر امریکہ چلے گئے تھے جہاں انہوں نے ''باعزت امریکی'' کہلانے کے لیے ''میم'' سے شادی کر لی چند برس کی اس رفاقت کی ''آؤٹ پٹ'' میرے یہ دوست ہیں جن کی پیدائش کے بعد ان کا کوئی دوسرا بہن بھائی اس لیے روئے زمین پر تشریف نہ لا سکا کہ یہ ابھی ہسپتال ہی میں تھے تو ان کا نام رکھنے پر ان کے والدین میں جھگڑا ہو گیا جس کا انجام ''ادھر تم اُدھر ہم'' نکلا۔ خود بتاتے ہیں۔ ''ماما اپنے آنجہانی کتے کی یاد میں میرا نام جم رکھنا چاہتی تھیں لیکن پاپا اپنے والد کی مناسبت سے راؤ ریاست علی۔ دونوں جب دو گھنٹے کی تکرار کے بعد کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو انہوں نے علیحدگی کا فیصلہ کیا۔'' بہر حال ان تمام عارضوں کے باوجود وہ خود کو پاکستانی سمجھتے ہیں جس پر ہم تمام احباب کئی بار ان کا شکریہ ادا کر چکے ہیں۔

پچھلا پورا مہینہ پاکستان میں گزارا آفیشل ٹور پر تھے پاکستان کی اقتصادی بدحالی پر رپورٹ مرتب کرتے رہے، کرپشن اور لوٹ کھسوٹ کی وجوہات تلاش کرتے رہے جب اس کڑے تحقیقی کام سے فارغ ہوئے تو بہت مسرور تھے میں نے وجہ پوچھی تو ہاتھ پر ہاتھ رگڑ کر بولے ''میں نے آخر کار پاکستان کے معاشی بحران کی وجوہات تلاش کر ہی لیں۔'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا ''کیا مطلب؟'' بولے ''بھائی میرے پاکستان کے دو بڑے اقتصادی مسئلے ہیں یہ حل ہو جائیں تو ملک ڈیفالٹ سے بچ سکتا ہے!'' پوچھا ''وہ مسئلے کون کون سے ہیں؟'' بولے ''سرکاری ملازمین اور سرکاری منصوبے'' عرض کیا ''اگر کچھ تفصیل مل جائے تو بچے دعائیں دیں گے۔'' علمی تفاخر سے بولے ''پاکستان ہر ماہ سرکاری ملازمین پر اربوں روپے خرچ کرتا ہے، لیکن یہ ملازمین ایک دھیلے کا کام نہیں کرتے، تم وفاق کو دیکھو چھ سو سرکاری ادارے فیڈرل کیپٹل کے زیر اہتمام کام

کر رہے ہیں جن میں دس لاکھ ملازمین ہیں ان چھ سو اداروں میں سے صرف چار ادارے اپنے اخراجات پورے کر رہے ہیں، پورے پاکستان میں ایک سو دس بڑے سرکاری ادارے ہیں جن میں چھ لاکھ ۶۰ ہزار ملازمین ہیں، یہ سارے ادارے ہر سال حکومت سے ایک سو ارب روپے وصول کرتے ہیں لیکن جواب میں ایک روپیہ تک نہیں لوٹاتے، پنجاب میں آٹھ لاکھ نوے ہزار اور سندھ میں چار لاکھ پینتالیس ہزار افراد سرکار سے تنخواہیں لیتے ہیں لیکن کام ایک دھیلے کا نہیں کرتے'' ''اور منصوبے؟'' میں نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا ''ہاں منصوبے'' انہوں نے سر ہلایا ''پاکستان میں ۴۲۵ ایسے منصوبے ہیں جو ہر سال اربوں روپے کھا جاتے ہیں لیکن ان سے دو سو روپے کی آمدنی نہیں ہوتی۔'' میں نے پوچھا ''اگر یہ بیس پچیس لاکھ ملازمین فارغ کر دیئے جائیں اور یہ ۴۲۵ منصوبے بند ہو جائیں تو پاکستان کی اکانومی آسمان سے باتیں کرنے لگے گی، غربت، بے روزگاری اور مہنگائی ختم ہو جائے گی؟'' انہوں نے پورے جوش سے گردن ہاں میں ہلا دی۔

کچھ دیر کے سکوت کے بعد میں نے جم (ہم انہیں ان کی والدہ کے آنجہانی جم کی یاد میں جم ہی کہتے ہیں) سے عرض کیا ''لیکن نہیں دوست نہیں، میرا خیال اس سے مختلف ہے میں سمجھتا ہوں، یہ دنیا جس میں ۸۴ کروڑ لوگ خوراک کی کمی کا شکار ہیں، ایک ارب ۳۰ کروڑ لوگ پناہ گاہوں سے محروم ہیں ۴۰ کروڑ لوگ بے گھر ہیں ۸ کروڑ بچے گلیوں میں آوارہ پھر رہے ہیں، یہ دنیا جنت بن سکتی ہے اگر یورپ اور امریکہ اپنے لائف سٹائل میں ذرا سی تبدیلی کر لے۔'' وہ پریشان ہو کر بولے ''کیا مطلب؟'' میں نے عرض کیا ''جم میری جان، غربت، بیماری اور جہالت سے لتھڑی اس دنیا میں جہاں پاکستان جیسے ملکوں کا سالانہ بجٹ چھ سات ارب ڈالر سے زیادہ نہیں ہوتا صرف یورپی اور امریکی باشندے سالانہ چار سو ارب ڈالر کی منشیات استعمال کرتے ہیں، یورپ میں ہر سال ایک سو پانچ ارب ڈالر کی شراب پی جاتی ہے، یورپ گیارہ ارب ڈالر کی سالانہ آئس کریم کھا جاتا ہے، صرف یورپ میں بارہ ارب ڈالر کے پرفیوم خریدے جاتے ہیں امریکہ میں کتوں کی خوراک پر سترہ ارب ڈالر خرچ ہوتے ہیں، جاپان اور امریکہ کے تاجر بزنس انٹرٹینمنٹ پر پینتیس ارب ڈالر ضائع کرتے ہیں، امریکہ کے ۶۰ افراد کے پاس تین سو گیارہ ارب ڈالر ہیں، دنیا کے تین امیر ترین افراد کے اثاثے پورے افریقہ کی مجموعی دولت سے زیادہ ہیں اور دنیا کے صرف ۲۲۵ افراد کے پاس دنیا کی ۴۷ فیصد آبادی کا رزق ہے۔'' جم نے بے چین ہو کر پوچھا ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے مسکرا کر جواب دیا ''میں عرض کر رہا ہوں میرے دوست اگر یورپ اور امریکہ شراب پینی بند کر دے منشیات کا استعمال ترک کر دے، ایک سال کے لیے آئس کریم اور پرفیوم خریدنا بند کر دے اور صرف دو برس کے لیے کتوں کو کتے سمجھ لے تو پاکستان جیسے ۱۲۱ ممالک بھوک، بیماری اور غربت سے بچ سکتے ہیں ورنہ.........'' ''ورنہ؟'' اس نے مزید پریشان ہو کر پوچھا۔ ''ورنہ تم لوگ جس طرح تیسری دنیا کے سرکاری ملازمین کو فارغ کرانے کا پلان بنا رہے ہو، مجھے خطرہ ہے آنے والے برسوں میں کہیں یہ محروم ملک ایسے لشکروں کی فیکٹریاں نہ بن جائیں جو دنیا میں ہر آئس کریم کھانے

والے کا منہ نوچ لیں، ہر خوشبو لگانے والے کو جلا دیں اور ہر شرابی کا خون پی جائیں ...... آخر عدم مساوات، بے انصافی اور وسائل کی غلط تقسیم کے سمندر میں اٹھنے والی غربت کی ان موجوں نے کسی نہ کسی ساحل سے تو ٹکرانا ہے۔"

چیلوں کے گھونسلے

چلئے بالآخر سرتاج عزیز سی بی آر کے لیے نیا چیئرمین "درآمد" کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے، ایک ایسا چیئرمین جو حکومت سے ماہانہ ۱۸ لاکھ (۸ لاکھ تنخواہ، ۱۰ لاکھ کی مراعات) روپے وصول کرے گا، ایسا چیئرمین، جو براہ راست وزیر اعظم کو جوابدہ ہوگا، ایسا چیئرمین جو ملازم رکھنے اور پرانے ملازمین فارغ کرنے میں مکمل با اختیار ہوگا، ایسا چیئرمین جو باقاعدہ سودے بازی کے بعد پاکستان آیا۔

ہاں، جناب معین الدین، اس بے نظیر بھٹو سے ٹیکس وصول کریں گے، جس کی تیسری انگلی کی صرف ایک انگوٹھی ایک لاکھ ڈالر میں خریدی گئی جس کے ایک نیکلس کی قیمت ایک لاکھ پاؤنڈ ہے لیکن وہ ٹیکس صرف ۳۲ ہزار ۶ سو ۸۳ روپے دیتی ہیں، اس آصف علی زرداری سے ٹیکس وصول کریں گے جس کے اصطبل میں ساٹھ لاکھ کے ارجنٹائنی گھوڑے تھے، دس دس لاکھ کے اونٹ، چار چار لاکھ کے کتے اور چالیس چالیس ہزار کی بھیڑیں تھیں، جو برانڈ نیو مرسڈیز میں سفر کرتے تھے لیکن انکم ٹیکس کے فارم پر صفر انکم لکھ کر ٹیکس دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان نواز شریف سے ٹیکس وصول کریں گے جو وزیر اعظم ہاؤس کے اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں، لیکن ٹیکس صرف ۲ ہزار ۶ سو ۸۰ روپے ادا کرتے ہیں۔ ان شہباز شریف سے ٹیکس وصول کریں گے جن کی امارت کے قصے ہر زبان پر ہیں لیکن ٹیکس صرف ۸ سو ۹۷ روپے دیتے ہیں۔ ان انور سیف اللہ سے ٹیکس وصول کریں گے جن کے لان میں دو دو لاکھ کے کتے کھیلتے ہیں لیکن ٹیکس وہ ۳ ہزار روپے دیتے ہیں۔

ہاں، جناب معین الدین ان اکبر بگٹی سے ٹیکس وصول کریں گے جن کے باڈی گارڈز کی تعداد اڑھائی سو ہے لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔ ان نواب ذوالفقار علی مگسی سے ٹیکس وصول کریں گے جو مگسی قبیلے کے سردار ہیں، ہر ماہ کروڑوں روپے کماتے ہیں لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔ ان سردار فاروق احمد لغاری سے ٹیکس وصول کریں گے جو چوٹی میں کروڑوں کا "ایوان صدر" تعمیر کرتے ہیں، مہران بینک خالی کر دیتے ہیں، کروڑوں روپے کی کپاس کاشت کرتے ہیں لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔ ان بلخ شیر مزاری سے ٹیکس وصول کریں گے، جن کے طرز رہائش میں نوابوں کی جھلک ہے لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر، ان فیصل صالح حیات سے ٹیکس وصول کریں گے، جن کے مرید ہر سال کروڑوں روپے کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔ ان این ڈی خان

سے ٹیکس وصول کریں گے، جن کے ہوٹل کے بل لاکھوں سے تجاوز کر جاتے ہیں لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔ ان حنیف رامے سے ٹیکس وصول کریں گے، جن کے کچن کا ماہانہ خرچ ایک لاکھ روپے سے بڑھ جاتا ہے لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔

ہاں، جناب معین الدین ان جاگیرداروں سے ٹیکس وصول کریں گے، جو لنڈی کوتل سے گوادر اور واہگہ سے چمن تک پھیلے ہیں۔ جو چودھری، ملک، مخدوم، لغاری، کھوسہ، نواب، بگٹی، مینگل، مگسی، تالپور اور شاہ کہلاتے ہیں، جن کی زمینوں پر لاکھوں مزارعے جانوروں جیسی زندگیاں گزار رہے ہیں، جن کے بچے دنیا کی مہنگی ترین درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، جو ہر سال کروڑوں روپے طوائفوں پر لٹاتے ہیں، جن کی رہائش گاہیں چاروں صوبائی مراکز اور وفاقی دارالحکومت میں ہیں، جو ہر سال یورپ میں چھٹیاں گزارنے جاتے ہیں، جو مہمانوں کو لاکھوں روپے کا "روٹی ٹکر" کھلا دیتے ہیں، جن کے کتے، گھوڑے، اونٹ اور بٹیر دیسی گھی، انڈوں، مربوں اور منرل واٹر پر پلتے ہیں، جو ہر سال ۸۰، ۸۰ لاکھ کی گاڑیاں خریدتے ہیں لیکن مجموعی طور پر صرف ۲۲ لاکھ روپے سالانہ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

ہاں، جناب معین الدین ان کھرب پتیوں سے ٹیکس وصول کریں گے، ان ارکان پارلیمنٹ، ان پشتی امراء اور ان جینوں سے ٹیکس وصول کریں گے جن کی امارت کی کوئی حد نہیں، جن کی آگلی سات پشتیں دودھ سے نہا سکتی ہیں، سونے کے نوالے کھا سکتی ہیں، چاندی کے پلنگ پر استراحت فرما سکتی ہیں، لیکن ان سے زیادہ ٹیکس کراچی کا ایک وکیل خالد اسحاق دیتا ہے (۹۴-۱۹۹۳ء میں ۵۸ لاکھ روپے ٹیکس دیا تھا۔)

ہاں، جناب معین الدین اس ملک سے ٹیکس وصول کریں گے، جہاں ۱۳ کروڑ لوگوں میں سے صرف ۷ لاکھ افراد ٹیکس ادا کرتے ہیں (حکومت ۱۵ لاکھ کا دعویٰ کرتی ہے) جہاں ۸۵ فیصد ٹیکس پیئر سرکاری اور نجی ملازمین ہیں۔ (ان لوگوں کا ٹیکس بھی تنخواہوں سے کٹتا ہے) جہاں انکم ٹیکس کا چھوٹے سے چھوٹا ملازم بھی لاکھوں روپے کی پراپرٹی کا مالک ہے۔ ذاتی گاڑی پر دفتر آتا ہے، بچوں کو مہنگے ترین اداروں میں تعلیم دلاتا ہے، جہاں اے سی انکم ٹیکس کی سیٹ پچاس پچاس لاکھ میں فروخت ہوتی ہے، جہاں ہر فیکٹری، ہر ادارے اور ہر سیٹھ نے ٹیکس بچانے کے لیے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس ملازم رکھے ہوئے ہیں۔

ہاں، جناب معین الدین اس ملک کے کس فرد سے ٹیکس وصول کریں گے، انہیں بھٹو ٹیکس دیں گے، لغاری، مزاری، کھوسے، بگٹی، مینگل، مخدوم اور شاہ ٹیکس دیں گے۔ کیا میمن، ولیکا، سیٹھ، میاں اور بٹ ان کے سامنے اپنی ساری آمدنی کھول کر رکھ دیں گے۔

ہاں، جناب معین الدین کو ان لوگوں سے کچھ نہیں ملے گا۔ کیا چوروں نے بھی کبھی زکوٰۃ دی ہے؟ چیلوں کے گھونسلوں سے بھی کبھی ماس ملا ہے؟ دیمک نے بھی کبھی لکڑی کی حفاظت کی ہے؟

ہاں، یہ معین الدین تو ۱۸ لاکھ والے چھوٹے سے معین الدین ہیں۔ یہاں ۱۸ کروڑ والے بڑے سے

معین الدین بھی آجائیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا کہ دنیا کا کوئی شخص پتھروں سے رس نہیں نچوڑ سکتا۔

(نوٹ: اس کالم کے تمام اعداد و شمار سی بی آر کی انکم ٹیکس ڈائریکٹری ۹۴۔۱۹۹۳ء سے لیے گئے ہیں اب ۱۹۹۷ء تک ان لوگوں کے ادا کردہ ٹیکسوں میں چند سو روپے کا اضافہ ہو چکا ہے۔)

ٹیکس چوری

اپریل ۱۹۷۰ء کی ایک سہ پہر کو جب اپالو ۱۳ زمین کی قید سے آزاد ہو کر چاند کی حدود میں داخل ہوا تو کیپ کینورل کے عملے نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ طبی ماہرین نے ہیڈ فون اتارے، سکرین کی روشنیاں مدھم کیں اور نشستوں سے ٹیک لگا کر چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں، چاند گاڑی کے کل پرزوں کے ماہرین نے سکرین سے نظریں ہٹائیں اور کافی کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگے۔ فیول کا جائزہ لینے والے بھی ٹائیاں ڈھیلی کر کے لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ رہے آکسیجن پلانٹ کے ماہرین تو انہوں نے لان میں چہل قدمی کا پروگرام بنانا شروع کر دیا، لیکن اس سے پہلے کہ یہ لوگ اپنی جگہ چھوڑتے، خطرے کے الارم بج اٹھے، ہنگامی بتیاں تیزی سے جلنے بجھنے لگیں جس کے بعد کنٹرول روم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برقی رو دوڑ گئی، ساری سکرینیں آن ہو گئیں، سارے ہیڈ فون، سارے مائیکروفون زندہ ہو گئے۔

پینل پر بیٹھے چیف نے مائیک آن کیا اور زمین سے چاند تک ایک ہلکی لیکن بااعتماد آواز گونجنے لگی: ''جم آر یو آل رائٹ؟ جم ویئر آر یو، وی وانٹ ٹو لسن یو جم...... اوور'' چیف کے خاموش ہوتے ہی سپیکر آن ہوئے اور ایک ہلکے سے شور کے ساتھ چاند گاڑی کی سہ رکنی ٹیم کے سربراہ جم لوول کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی: ''ہمارا آکسیجن ٹینک پھٹ چکا ہے، اب ہم اور ہماری شٹل چند ہی لمحوں کے مہمان ہیں..........'' چیف نے جم لوول کی بات مکمل ہوتے ہی ایمرجنسی کا بٹن دبا دیا، جس کے ساتھ ہی کیپ کینورل کے اندر ہنگامی صورتحال کا اعلان کر دیا گیا۔ امریکی صدر کو اطلاع کر دی گئی۔ سہ رکنی ٹیم کے لواحقین کو لانے کے لیے گاڑیاں بھیج دی گئیں اور ٹیلی ویژن کے ذریعے پوری دنیا سے خلانوردوں کے لیے دعا کی اپیل کر دی گئی جبکہ پینل پر بیٹھے ماہرین جم کو آکسیجن کا متبادل نظام وضع کرنے کی ہدایات دینے لگے۔ فلاں جگہ سے پائپ نکالو، اسے فلاں مشین کے ساتھ فٹ کر دو، فلاں بٹن آن کرو، ساری بتیاں بجھا دو، بجلی بچاؤ، ہیٹر بند کر دو، لیکن آکسیجن تھی کہ کم سے کم ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ کنٹرول روم کا ہر فرد تینوں خلانوردوں کی طرف قدم بہ قدم بڑھتی موت کی چاپ سننے لگا۔

اچانک پینل پر جم کی آواز گونجی: ''مسٹر پال آج کیا تاریخ ہے؟'' چیف نے بٹن دبایا، مائیک آن کیا

اور تاریخ بتا کر کہا: ''جم یہ تاریخ پوچھنے نہیں، تاریخ بنانے کا وقت ہے؟'''' پال میں مارا گیا۔'' جم کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ''کیسے؟'' چیف نے پوچھا۔ ''یار آج انکم ٹیکس کی ریٹرن فائل کرنے کی آخری تاریخ تھی لیکن میں ...... بھول ہی گیا، مجھے تو کورٹ سے سزا ہو جائے گی۔'' جم کی آواز میں گھبراہٹ اور افسردگی تھی، سب نے سر پکڑ لیے چیف نے آکسیجن کے میٹر پر نظر ڈالی، سوئیاں آخری حدود کو چھو رہی تھیں، اس نے گردن کو جھٹکا دیا اور پینل کا ایک بٹن پریس کر کے بولا: ''مسٹر پریذیڈنٹ میں کیپ کینوول کنٹرول روم سے بول رہا ہوں، آپ جم لوول کی آواز سن ہی چکے ہیں، اگر اسے فوری ریلیف نہ دی گئی تو تینوں خلانورد خلا ہی میں منجمد ہو جائیں گے، ویٹس اے میٹر آف تھری لائفس سر...... اوور'' چند ساعتوں تک دوسری طرف مکمل خاموشی رہی، پھر اچانک پینل پر صدر نکسن کی آواز گونجی، ''پال میں اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے تمہیں اجازت دیتا ہوں، جم لوول کو خوشخبری سنا دو، وہ چاند مشن سے واپسی پر اپنی ریٹرن فائل کر دے، میں ٹیکس چیف سے اس کی خصوصی سفارش کروں گا...... اوور''

اس کہانی کو یہیں روکتے ہیں اور کیپ کینوول کے کنٹرول روم سے نکل کر پاکستان آتے ہیں، جہاں ہمارے ایک ریٹائرڈ جنرل جب پورے وزیر داخلہ تھے تو انہوں نے انکم ٹیکس کے فارم پر انکم کے خانے میں صفر لکھا، ٹیکس کے خانے کو کراس کیا اور دستخط کر کے فارم اپنے پی ایس کے حوالے کر دیا اور بھول گئے۔ تقریباً چھ ماہ بعد وزیر داخلہ نے پشاور میں ایک جائیداد خریدی جس پر کیپٹل ویلیو ٹیکس (سی وی ٹی) لاگو ہوتا تھا (جائیداد کی تفصیل ریکارڈ میں موجود نہیں) جنرل نے فون اٹھایا اور سی بی آر کے چیئرمین کو دفتر آنے کا حکم دیا۔ حکم حاکم کا تھا، لہٰذا چیئرمین فوراً حاضر ہو گیا۔ وزیر داخلہ نے چیئرمین کو حکم دیا: ''مجھے سی وی ٹی سے استثنیٰ کا سرٹیفکیٹ چاہیے، آپ کل بھجوا دیجیے گا۔'' چیئرمین نے ''جو آپ کا حکم سر'' کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھا اور تھوڑا سا جھک کر اجازت چاہی۔

چیئرمین دفتر آیا اور آ کر متعلقہ حکام کو حکم کی بجا آوری کی ہدایت کر دی، ممبر نے اسسٹنٹ کو بلا کر کہا، اسسٹنٹ نے جا کر جنرل کی فائل نکلوائی تو پتا چلا وزیر داخلہ نے تو صفر انکم ظاہر کر رکھی ہے اور سی وی ٹی سے استثنیٰ کا سرٹیفکیٹ صرف انہیں دیا جا سکتا ہے جو انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اے ڈی نے ممبر کو اطلاع کر دی تو ممبر نے جا کر معاملہ چیئرمین کے گوش گزار کیا، پھر چیئرمین نے ڈرتے ڈرتے وزیر داخلہ کو اس ''قانونی معذوری'' سے مطلع کیا تو جواب آیا ذرا آپ چند لمحوں کے لیے میرے دفتر تشریف لائیں۔ چیئرمین چلا گیا، واپس آیا تو اس کے کان سرخ تھے اور ٹھوڑی سے پسینہ ٹپک رہا تھا، اس نے آتے ہی ہنگامی میٹنگ بلا لی۔ سی بی آر کے اعلیٰ دماغ جمع ہوئے، ٹیکس قوانین کی ساری کتابیں میز پر جمع کی گئیں، کافی کا آرڈر دے دیا گیا، ٹیلی فون بند کر دیئے گئے اور سارا عملہ کسی ایسی دفعہ کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا جسے توڑ مروڑ کر وزیر داخلہ کے لیے سرٹیفکیٹ کا جواز پیدا کیا جا سکے، لیکن رات گئے تک ایسی کوئی دفعہ ہاتھ نہ آئی، سب تھک گئے، سب کرسیوں پر

ڈھیر ہو گئے، سب بے بس ہو گئے تو نسبتاً ایک جونیئر آفیسر چٹکی بجا کر بولا:

''سر میرے دماغ میں ایک تجویز آئی ہے۔'' سب چونک کر سیدھے بیٹھ گئے۔ وہ آفیسر چہک کر بولا: ''اگر وزیر داخلہ یہ لکھ کر دے دیں کہ وہ چند طالب علموں کو ٹیوشن پڑھاتے رہے ہیں تو سارا مسئلہ ہی حل ہو سکتا ہے۔'' چیئر مین نے گردن مسلی اور بیزاری سے بولے: ''لیکن اس سے مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟'' آفیسر نے اسی شوخ لہجے میں جواب دیا: ''سر ہم ان کی آمدنی ٹیکس لمٹ سے ایک دو ہزار زیادہ شو کر کے ایک آدھ سو روپے ٹیکس لگائیں گے، اپنی جیب سے ادائیگی کریں گے اور پھر انہیں سرٹیفکیٹ جاری کر دیں گے۔'' سب نے جوش سے ہوا میں بازو لہرائے اور زندہ باد کہہ کر اس آفیسر کی عقل و فراست کی داد دی۔

ہاں، قارئین کرام، یہ سچ ہے جم لوول صدر کی خصوصی اجازت کے باوجود ایک عرصے تک ٹیکس ریٹرن فائل کرنے کے لیے خوار ہوتا رہا اور یہ بھی سچ ہے ہمارے وزیر داخلہ کو تیسرے ہی روز سی وی ٹی سے استثنیٰ کا سرٹیفکیٹ مل گیا، لیکن محترم قارئین، یہ دونوں واقعات پڑھنے کے بعد آپ کے اندر کوئی چیز ٹوٹتی نہیں؟ آپ کو بھی میری طرح اپنی بے بسی، معذوری اور مجبوری کا احساس نہیں ہوتا؟ ایسا کیوں ہے، محترم قارئین کبھی آپ نے سوچا؟

بات صرف اتنی ہی ہے کہ جہاں قانون کمزور ہوتا ہے وہاں کے حکمران بہت ہی مضبوط ہوتے ہیں۔

یاجوج ماجوج

بنگالی ملاح جب کسی شخص کی حماقت، غیر حاضر دماغی اور بے نتیجہ کوشش کا ذکر کرتے ہیں تو یہ لوک داستان ضرور سناتے ہیں۔

خلیج بنگال کے ایک دور دراز جزیرے میں ایک ملاح رہتا تھا، اسے سب بھولا کہتے تھے، بھولا فطرتاً محنتی، مخلص اور بے لوث لیکن دماغ کا ذرا ڈھیلا تھا لہٰذا جو بھی کام کرتا آغاز ہی میں کوئی نہ کوئی ایسی حماقت کر بیٹھتا جس سے کام الٹا ہو جاتا، مثلاً آپ اس کے مچھلیاں پکڑنے کے اس واقعے ہی کو لیں جس میں اسے کھلے پانیوں میں پہنچ کر یاد آیا وہ تو جال ہی گھر بھول آیا ہے یا پھر آپ اس کے کشتی باندھنے کا احوال یاد کریں، جس میں اس نے چٹان میں چپو ٹھونکنے کی کوشش کی اور پھر دو دن تک ویران جزیرے میں محصور رہا، وغیرہ وغیرہ بھولے کی زندگی اس قسم کی حماقتوں کی ہزار داستان تھی لیکن ان تمام حماقتوں پر وہ حماقت سب سے بھاری تھی جو اب باقاعدہ لوک داستان کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں ایک گہری سیاہ اور طوفانی رات کو چند مسافر اس کی کٹیا میں آئے اور اسے جگا کر کہا: ''بھولے بھائی، ہم لوگوں کو ہر صورت صبح شہر پہنچنا ہے لیکن اس وقت کوئی ملاح ہمیں لے جانے کے لیے تیار نہیں، تمہارے پاس بڑی آس لے کر آئے ہیں، ہمیں مایوس نہ کرنا۔'' بھولے کے لیے یہ الفاظ کافی تھے۔ وہ فوراً اٹھا اور انہیں ساتھ لے کر ساحل پر پہنچ گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں بھولے نے مسافروں کو کشتی میں بٹھا کر چپو چلانے شروع کر دیے، جس کے بعد ساری رات کشتی چلتی رہی، لیکن جب سپیدہ صبح نمودار ہوا تو مسافروں کو معلوم ہوا، بھولا تو کشتی کا رسہ کھولنا ہی بھول گیا تھا لہٰذا وہ ساری رات کے سفر کے بعد ابھی تک اسی ساحل پر کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے۔

پتا نہیں کیا بات ہے میں جب بھی اس ملک کے ساڑھے گیارہ لاکھ دفاتر دیکھتا ہوں، ان میں کام کرنے والے ان سوا کروڑ لوگوں کے بارے میں سوچتا ہوں جو صبح ۸ بجے سے ۳ اور ۳ بجے سے ۹ بجے تک کام کرتے ہیں، جو روز تر و تازہ چہرے لے کر آتے ہیں اور تھک ٹوٹ کر گھر جاتے ہیں، جو اپنی زندگی کا بہترین وقت ان ٹھنڈے، گرم اور چمکتے دفتروں میں ضائع کر دیتے ہیں، لیکن اس جہد مسلسل کے باوجود اس ملک کے تمام مسائل وہیں کھڑے رہتے ہیں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے خود دیکھئے یہاں کوئی ایک ایسا منصوبہ نہیں جو خود

کار نظام کے تحت شروع ہوا اور خود بخود مکمل ہو گیا ہو، کوئی ایسی فائل نہیں، جس کا سفر چند ماہ میں اختتام پذیر ہو گیا ہو، پھر آخر ہماری آبادی کا یہ دس فیصد حصہ کیا کر رہا ہے؟ یہ کس ملک، کس قوم اور کس عوام کے لیے مصروف کار ہے؟ جب دیوار نے یہیں کھڑے رہنا ہے تو پھر یہ لوگ اسے کیوں چاٹ رہے ہیں؟

میں نے ''شاہ جی'' اپنے سینئر بیورو کریٹ دوست سے پوچھا: ''سر آپ ایمان سے بتائیں آپ نے ۴۰ سال کی سروس میں کیا کیا؟'' شاہ جی نے ہاتھ کی پشت سے اپنی ٹھوڑی کے تحت بال کھجائے اور پھر لرزتی آواز میں کہا: ''اگر ٹھیک ٹھیک بتاؤں تو بات صرف اتنی ہے میں نے زندگی بھر فہرستیں بنائی ہیں، فائلیں مرتب کی ہیں۔'' میں نے قریشی صاحب سے پوچھا: ''یار آپ لوگ دفتر میں بیٹھ کر سارا سارا دن کیا کرتے ہیں؟'' قریشی صاحب نے لمبی آہ بھری اور ٹیبل پر شیشے کا پیپر ویٹ گھما کر بولے: ''لسٹیں بناتے ہیں۔'' ''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا، قریشی صاحب نے اپنی میلی آنکھیں مجھ پر جمائیں اور پھر اپنے جھٹکے دار لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔ ''جب حکومت کو خزانے کے خالی ہونے کا احساس ہوتا ہے تو وہ ہمیں حکم دیتی ہے، بینکوں سے قرضے لینے والوں کی فہرستیں بنائی جائیں، ہم یس سر کہہ کر سیلوٹ کرتے ہیں اور فوراً فہرست بنانا شروع کر دیتے ہیں۔'' ''کیا فہرستیں مکمل ہو جاتی ہیں؟'' میں نے بھولپن سے پوچھا: ''ہاں ہاں ضرور مکمل ہوتی ہیں۔'' قریشی صاحب کی آواز میں چڑچڑا پن آ گیا، ''پھر ان فہرستوں کا کیا بنتا ہے؟'' میں نے پوچھا'' کچھ بھی نہیں، کیونکہ فہرستوں کی تیاری تک حکومت کسی دوسرے محاذ پر مصروف ہو جاتی ہے، یا پھر تبدیل ہو جاتی ہے، لہٰذا ہم انہیں فائلوں میں لگاتے ہیں اور الماریوں میں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔'' ''کیا ایک وقت میں صرف ایک ہی فہرست تیار ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا: ''نہیں، ایک وقت میں کئی فہرستیں بنتی ہیں چھوٹے قرضے لینے والوں کی فہرستیں، قرضے معاف کرانے والوں کی فہرستیں، قرضوں کے لیے درخواستیں دینے والوں کی فہرستیں، زرعی قرضے لینے والوں کی فہرستیں، صنعتی اور تعلیمی قرضے حاصل کرنے والوں کی فہرستیں، الغرض فہرستیں ہی فہرستیں۔''

میں نے آغا جی سے پوچھا: ''آغا جی آپ وفاقی سیکرٹری ہیں، پوری زندگی آپ نے اس نظام کی خدمت میں گزار دی، ذرا یہ تو بتائیں اگر کوئی غیر ملکی محقق ہمارے دفتری نظام کے مطالعے کے لیے پاکستان آئے تو اسے ان الماریوں، ان گوداموں اور ان بڑے بڑے رجسٹروں سے کیا ملے گا؟'' آغا جی نے سر سے ٹوپی اتاری اور پھر آگے جھک کر کہا: ''یار اسے یہاں فہرستوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا، یہ متروک عمارتوں کی فہرست ہے، یہ نئی عمارتوں کی فہرست ہے، یہ تین اور چار منزلہ عمارتوں کی فہرست ہے، یہ پارکوں، ٹوٹی سڑکوں، ندی نالوں اور نہروں کی فہرست ہے، یہ دھواں چھوڑنے والی گاڑیوں کی فہرست ہے، یہ جنگلوں کی فہرست ہے، یہ شجر کاری کے لیے منتخب کیے گئے علاقوں کی فہرست ہے، یہ قابل کاشت اور بنجر علاقوں کی فہرست ہے، یہ مذہبی رہنماؤں کی فہرست ہے، یہ وی آئی پی حضرات کی فہرست ہے، یہ ایگزٹ کنٹرول لسٹ ہے، یہ اشتہاری مجرموں کی فہرست ہے، یہ سمگلروں اور قاتلوں کی فہرست ہے، یہ اسلحہ لائسنس رکھنے والوں کی فہرست ہے، یہ

ناجائز ہتھیاروں کی فہرست ہے، یہ پڑھے لکھے بے روزگاروں کی فہرست ہے، یہ کارکن بچوں کی فہرست ہے، یہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فہرست ہے، یہ بدعنوان اور راشی افسروں کی فہرست ہے، یہ معذوروں اور بیماروں کی فہرست ہے، یہ فلاں فہرست ہے، یہ فلاں فہرست ہے؟ خدا کی پناہ! جس الماری میں جھانک کر دیکھو، جس کلرک کو بلاؤ، جو رجسٹر کھولو، تمہیں ایک نئی فہرست ملے گی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم صرف فہرستیں مرتب کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔'' آغا جی کو دمے کا دورہ پڑا، ان کی سانس کی نالی میں سیٹی بجنے لگے۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے کوٹ کی جیب ٹٹول کر ''ان ہیلر'' نکالا، پورا منہ کھول کر حلق میں پچکاری ماری اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔

میں نے ایک سینئر بیوروکریٹ کو مشورہ دیا: ''ڈاکٹر صاحب آپ ان ساری فہرستوں کی بھی ایک فہرست کیوں نہیں بنوا لیتے؟'' ڈاکٹر صاحب نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور شریر نظروں سے مجھے گھور کر بولے: ''کہیں یہ ہمارے بڑے صاحب کو نہ بتا دینا وہ واقعی بنوا لے گا۔''

یقین فرمائیے جب میں ان ساڑھے گیارہ لاکھ دفاتر میں جھانک کر دیکھتا ہوں، ان سوا کروڑ ملازمین کو صبح سے شام تک فہرستوں کی دیوار چاٹتے اور پھر تعمیر کرتے دیکھتا ہوں، تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کروڑوں بھولے اپنی اپنی کشتیوں کے رسے کھولے بغیر چپو چلا رہے ہیں، اس شب و روز کی محنت سے ان کے بازو سوکھ کر رسی بن چکے ہیں، سر کپاس کے کھیت ہو چکے ہیں، چہرے پچک کر پرانے برتن بن چکے ہیں اور کمر کمان کی شکل اختیار کر چکی ہے لیکن کشتی ہے کہ وہیں کھڑی ہے، مسافر وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے۔

دوستو ہم نے کبھی سوچا یہ کیا نظام ہے جو مریض کو دوا کی بجائے رپورٹ دے کر گھر بھیج دیتا ہے، جو انصاف نہیں صرف فیصلہ دیتا ہے، جس کی ساری جمع تفریق کاغذوں تک محدود ہے جس کی کل کائنات فائلیں اور فہرستیں ہیں ہم نے کبھی سوچا یہ ''لسٹ سسٹم'' کوئی سسٹم نہیں یہ بھولے کی کشتی ہے جو ساری رات چلتی ہے لیکن ایک بالشت آگے نہیں بڑھتی۔

ہاں دوستو! ہم نے کبھی سوچا ہم کب تک گرم پانیوں کے سمندروں میں برف کے جزیرے بناتے رہیں گے، ہم کب تک یہ دیواریں چاٹتے رہیں گے، ہم کب تک ساحلوں سے بندھی کشتیاں کھیتے رہیں گے، کب تک آخر کب تک۔

دی ٹرین

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر جرمن فوجوں کو فرانس خالی کرنے کا حکم ملا تو جرمن کمانڈنٹ نے ماتحت افسروں کو جمع کر کے کہا: ''آفیسرز جنگ ختم ہو چکی ہے، ہم نازی ہار چکے ہیں، فرانس ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ یہ سچ ہے...... اور یہ بھی سچ ہے کہ شاید اگلے پچاس برسوں تک ہم میں سے کسی کو فرانس میں داخلے کی اجازت نہ ملے، لہٰذا میرا حکم ہے پیرس کے عجائب گھروں، نوادرات سے بھرے نمائش گھروں اور ثقافت سے مالا مال ہنر کدوں سے جو کچھ سمیٹ سکتے ہو، سمیٹ لو کہ جب فرانسیسی منتظمین شہر کا نظم و نسق سنبھالیں تو انہیں پیرس سے جلی راکھ، پھٹے کاغذ اور مرجھائے چہروں کے سوا کچھ نہ ملے۔''

جنرل کا حکم تھا لہٰذا تمام ماتحت افسر اور جوان عجائب گھروں پر ٹوٹ پڑے، اور یوں ڈالر کے نوادرات اٹھا لائے۔

ان میں ڈونچی کی مونا لیزا تھی، وین گاف کی مختلف رنگوں کی سیریاں تھیں اور ان میں وینس ڈی ملو کا مرمریں مجسمہ تھا، گویا سب کچھ تھا، جب عجائب گھر خالی ہو گئے تو جنرل نے سارے نوادرات ایک ٹرین میں بھرے اور ڈرائیور کو سب کچھ جرمنی لے جانے کا حکم دے دیا۔ ٹرین روانہ تو ہو گئی لیکن شہر سے باہر نکلتے ہی انجن خراب ہو گیا انجینئر آئے، انجن ٹھیک ہوا، ٹرین پھر روانہ ہوئی، لیکن ۱۰ کلو میٹر طے کرنے کے بعد اس کے پہیے جام ہو گئے۔ انجینئر آئے، پہیے ٹھیک کیے، ٹرین پھر روانہ ہوئی، لیکن چند کلو میٹر بعد بوائلر پھٹ گیا، پھر انجینئر آئے بوائلر مرمت کیا گیا، ٹرین پھر روانہ ہوئی، لیکن اس بار چند کلو میٹر کے بعد پریشر بنانے والے پسٹن جواب دے گئے، انجینئر آئے، پسٹن بدلے گئے اور ٹرین پھر چلی ...... الغرض ٹرین خراب ہوتی رہی، جرمن انجینئر اسے ٹھیک کرتے رہے، یہاں تک کہ یورپ پر جرمن اقتدار ختم ہو گیا، نازی فوجیں واپس چلی گئیں اور فرانس دوبارہ فرانسیسی منتظمین کے قبضے میں آ گیا، لیکن ٹرین جرمنی کے بارڈر سے کہیں پیچھے خراب ہوتی رہی، ٹھیک ہوتی رہی اور پھر ایک روز ڈرائیور کو پیغام ملا ''موسیو آپ کا بہت بہت شکریہ، اب ٹرین بون نہیں واپس پیرس آئے گی، ہم آزاد ہو چکے ہیں۔''

ڈرائیور نے انگلیاں تہہ کر کے مکا بنایا، ہوا میں لہرایا اور نعرہ لگا کر واپس پیرس چل پڑا۔ تاریخ کہتی

ہے، جب یہ ٹرین چھکا چھک کرتی پیرس کے ریلوے سٹیشن پر رکی تو فرانس کی ساری لیڈرشپ پلیٹ فارم پر اس ڈرائیور کے استقبال کے لیے کھڑی تھی، ڈرائیور پر گل پاشی کی گئی، اس کا ماتھا چوما گیا اور پھر اس کے ہاتھ میں مائیکروفون دے دیا گیا۔ تھکان سے چور ڈرائیور نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر ہجوم کو مخاطب کر کے بولا: ''حاضرین، جرمن گدھوں نے نوادرات تو ٹرین میں بھر دیئے، لیکن یہ بھول گئے، ڈرائیور تو فرانسیسی ہے اور اگر ڈرائیور نہ چاہے تو گاڑی کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچا کرتیں۔''

عرصے بعد ہالی وڈ نے اس ڈرائیور پر ''دی ٹرین'' کے ٹائٹل سے فلم بنائی، جس کا شمار دنیا کی مقبول ترین فلموں میں ہوتا ہے۔

اگر موجودہ حکومت کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بھی ''دی ٹرین'' کی کہانی سے مختلف نہیں، کیونکہ فرانسیسی ٹرین کی طرح ہر چند کلومیٹر بعد کبھی اس کا انجن فیل ہو جاتا ہے، کبھی بوائلر پھٹ جاتا ہے، کبھی پسٹن جواب دے جاتے ہیں، کبھی پانی ختم ہو جاتا ہے، کبھی پہیے جام ہو جاتے ہیں اور کبھی پٹڑی ٹوٹ جاتی ہے، غرض پہلے دن سے اب تک بحران ہی بحران ہیں۔ اب گئی کہ کل گئی، کی افواہیں ہی افواہیں ہیں اور ناکامی ہی ناکامی ہے۔ ''قرض واپس کریں'' کی دھمکی سے بچتے ہیں تو ''قسط نہیں ملے گی'' کا امتحان سامنے کھڑا ہو جاتا ہے، بجٹ کم کرنے کے امتحان سے گزرتے ہیں تو ڈاؤن سائزنگ کی مجبوری سامنے کھڑی ہوتی ہے، وہاں سے جان بچتی ہے تو ''فوج کم کریں'' کا حکم مل جاتا ہے، اس سے جان بخشی ہوتی ہے تو چیف جسٹس بگڑ جاتے ہیں، اس سے نکلتے ہیں تو ''صدر صاحب نہیں مانتے'' کا مسئلہ پہاڑ بن جاتا ہے۔ ان سے جان ''چھوٹتی'' ہے، تو چیف الیکشن کمشنر جناب رفیق تارڑ کے کاغذات مسترد کر دیتے ہیں۔

غرض ٹرین ہر چند کلومیٹر کے بعد رک جاتی اور انجینئر سارے کام چھوڑ چھاڑ کر انجن کھول کر بیٹھ جاتے ہیں، دھرے پیچ اور کیل قبضے صاف کرنے میں جت جاتے ہیں، پرانے جوڑ توڑنے اور نئے ٹانکے لگانے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جب اس جہد مسلسل کے بعد انجن دوبارہ سٹارٹ ہو جاتا ہے تو وہ اطمینان کا سانس لے کر ستانے بیٹھ جاتے ہیں لیکن چند کلومیٹر چلنے کے بعد ٹرین دوبارہ رک جاتی ہے۔ اس مسلسل مرمت اور ''ٹھوکا ٹھاکی'' سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے منزل مقصود سے کہیں پہلے ہی وقت ختم ہو جائے گا، دور بدل جائے گا اور پھر ایک پیغام کے ذریعے ٹرین کو جہاں ہے جیسے ہے کی بنیاد پر واپسی کا حکم مل جائے گا۔

قارئین کرام، اگر آپ مجھے سنجیدگی سے بات کرنے کا موقع دیں تو میں عرض کروں کہ اگر حکومت کو ایک ٹرین تصور کر لیا جائے تو اس کا ڈرائیور بیوروکریسی ہوتی ہے۔ وہ بیوروکریسی، جو کاغذ کا ایک ٹکڑا روک کر سارا نظام مفلوج کر سکتی ہے، جو ایک فائل پھاڑ کر، ایک رجسٹر گم کر کے یا ایک ارجنٹ آرڈر کو معمول کے چینل میں ڈال کر سارے نظام کی بریکیں فیل کر سکتی ہے، جو چھٹی کی ایک درخواست کے ذریعے سسٹم کے پہیے جام کر سکتی ہے، جو چند لفظوں کے ہیر پھیر سے حکومت کے تمام بہی خواہوں کو دشمن اور تمام حلیفوں کو حریف بنا سکتی

ہے، جو سٹیئرنگ کی معمولی سے جنبش یا غلط ٹریک کی طرف مڑ کر سارے مسافروں کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتی ہے، جو انجن میں ''رول اجازت نہیں دیتا'' کی ریت ڈال کر ٹرین کو جنگل میں رکنے پر مجبور کر سکتی ہے، ہاں جو جب چاہے، جو چاہے کر سکتی ہے اور مضبوط سے مضبوط حکمران کے پاس خون کے گھونٹ بھرنے، اپنی ہی کلائیوں پر ''چک'' مارنے اور میز پر مکے برسانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، آپ نے اگر کبھی ''ڈٹے'' ہوئے سیکرٹریوں اور غصے سے کانپتے ہوئے وزراء کے مکالمے سنے ہوں (جن میں سیکرٹریوں کی ایک ہی دلیل وزیروں کے سارے دلائل پر بھاری ہوتی ہے کہ جناب آپ ہیں عارضی طور پر بااختیار، آج ہیں کل چلے جائیں گے، لیکن ہم تو مستقل ملازم ہیں، کل بھی یہیں تھے، آج بھی یہاں ہیں اور کل بھی یہیں ہوں گے) تو آپ کو اصل ڈرائیور اور اس کے اختیارات کا بخوبی اندازہ ہو جائے۔

میاں نواز شریف سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے بھاری مینڈیٹ کی تلوار سے ٹرین کے ''ڈرائیوروں'' کو دھمکانا شروع کر دیا، لہٰذا نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ سمجھدار لوگ اس وقت کی آہٹ سن رہے ہیں، جب وزیراعظم کے دستخط سے ایک آرڈر جاری ہو اور ہیڈ کلرک اس پر یہ لکھ کر واپس بھیج دے ''جناب آپ اس شخص کو وفاقی وزیر مقرر نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ تو بیوی بچوں سے لڑ کر اسلام آباد آیا ہے۔ جو شخص گھر نہیں چلا سکتا وہ ایک پوری وزارت کیسے چلائے گا۔'' یا نئے وزراء کے حلف اٹھانے سے چند لمحے قبل کوئی سول جج یہ آرڈر جاری کر دے گا ''آئین کسی سکوار کے شخص کو وزیر بننے کی اجازت نہیں دیتا، لہٰذا فلاں فلاں ارکان پارلیمنٹ حلف نہیں اٹھا سکتے۔'' یا کوئی سربراہ مملکت پاکستان کے دورے پر آئے گا تو سیکورٹی فورس کا کوئی اہلکار اسے یہ کہہ کر واپس بھیج دے گا۔ ''اس نے تو حفاظتی ٹیکوں کا کورس ہی مکمل نہیں کیا۔''

ہاں، اس نظام میں جہاں چپڑاسی چھٹی پر چلا جائے تو موسٹ ارجنٹ فائل ایک میز سے دوسری میز تک فاصلہ مہینوں میں طے کرتی ہے، وہاں کوئی شخص پوری اسٹیبلشمنٹ سے کیسے لڑ سکتا ہے؟

ہاں ہاں، میاں نواز شریف صاحب، خرابی انجن میں نہیں، ڈرائیور کی نیت میں ہے، اس پر توجہ دیں، اسے ''راضی'' کرنے کی کوشش کریں ورنہ آپ جو کام کرنا چاہیں گے اس پر ''آبجیکشن'' لگا کر فائل واپس کر دی جائے گی۔

فرانسیسی ڈرائیور نے سچ کہا تھا: ''اگر ڈرائیور نہ چاہے تو گاڑیاں کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچا کرتیں۔''

کی کری جانا اے

ان دنوں کا قصہ ہے جب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کو خود انحصاری کی پٹڑی پر چڑھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کی جہد مسلسل کے باوجود ملک ترقی پر مائل نظر نہیں آتا تھا، حالات روز بروز دگرگوں ہو رہے تھے۔ یہ صورتحال جب پنجابی کے غالب استاد دامن کے نوٹس میں آئی تو انہوں نے برجستہ کہا:

کدی لاڑکانہ تے کدی مری جانا اے
کی کری جانا اے، کی کری جانا اے
اتے کمبل دے کہ دری کھچی جانا اے

وردی کھچی جانا اے
کی کری جانا ہے
کی کری جانا اے، کی کری جانا اے

استاد دامن کے کہنے کا مطلب تھا لاڑکانہ اور مری کے درمیان بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ آپ جاڑے کے موسم میں غریب عوام پر کمبل دے کر نیچے سے دری کھینچ رہے ہیں۔

دھماکے کے بعد، میں میاں نواز شریف کے سو عیبوں سے چشم پوشی کے لیے تیار ہوں، میں ان کے قومی ایجنڈے سے بھی ہزار فیصد متفق ہوں، ان کی نیت پر بھی شک کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی، لیکن طریق کار ...... ہاں البتہ اس میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے سرکاری دفاتر میں چائے کم کرنے، سرکاری تقریبات پر پابندی لگانے، دو کے بجائے ایک کاغذ استعمال کرنے، فوٹو سٹیٹ مشینیں بند کرنے اور مہمانوں کو دال روٹی کھلانے سے یہ قوم ملائیشیا نہیں بنے گی، ایک دفتر سے دوسری عمارت میں منتقلی، آٹھ کے بجائے چھ ڈپٹی سیکرٹری، چار کے بجائے دو ڈرائیور اور ۱۸ کے بجائے پروٹوکول کی دو گاڑیوں پر اکتفا سے بھی معاملات درست نہیں ہوں گے۔ خلیج، یورپ اور امریکہ میں ریال، پونڈ اور ڈالر کمانے والے پاکستانیوں کی معاونت سے بھی یہ ملک جرمنی نہیں بنے گا کیونکہ ابھی تک وہ سوراخ بند نہیں ہوئے جن سے قومی دولت رس رس کر برباد ہو رہی ہے اور عقل یہ کہتی ہے، جب تک آپ ان پر توجہ نہیں دیتے حالات نہیں سدھریں گے، خواہ

آپ لاکھ بچت کر لیں، پائی پائی جوڑ لیں، دو وقت کا کھانا اور چار وقت کی چائے بند کر دیں۔

اچھی بات ہے میاں نواز شریف چائے کے بجائے قہوہ پیتے ہیں۔ انہوں نے ایک سال تک نئے کپڑے نہ سلوانے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ کمرشل فلائٹس سے سفر کرتے ہیں۔ بڑے گھر سے چھوٹے گھر منتقل ہو چکے ہیں۔ زندگی میں سادگی لا رہے ہیں، لیکن اس سے قومی خزانے کو کتنا فائدہ پہنچے گا، ۵۰ ہزار، ایک لاکھ یا حد دو لاکھ روپے ماہانہ جبکہ اس وقت سینٹ کے ۸۷ ارکان ۳۳ لاکھ ۶۰ ہزار روپے تنخواہ لے رہے ہیں اور انہیں ۴ کروڑ ۳ لاکھ ۳۸ ہزار کی مراعات حاصل ہیں۔ چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین سینٹ کے پاس ۱۰ لاکھ روپے کے صوابدیدی فنڈز ہیں۔ صرف ڈپٹی چیئرمین کا عہدہ قوم کو ۹ لاکھ ۱۵ ہزار روپے (سالانہ) میں پڑتا ہے۔ قومی اسمبلی کے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کے سالانہ اخراجات اور مراعات ۹۷ لاکھ ۴۱ ہزار ہیں (اس میں ان کے ۱۰ لاکھ روپے کے صوابدیدی فنڈز شامل نہیں) قومی اسمبلی کے ارکان ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپے بطور تنخواہ پاتے ہیں، جبکہ ان کے ریگولر الاؤنس ۱۳ کروڑ ۳۰ لاکھ اور ۳۴ ہزار روپے ہیں۔

قوم دو کپ چائے کم کر کے ۲ کروڑ روپے بچا رہی ہے لیکن وفاقی وزراء بدستور ۲۰ کروڑ روپے کی مراعات لے رہے ہیں۔ سینٹ اور قومی اسمبلی کی سٹینڈنگ کمیٹیوں کا ہر چیئرمین ساڑھے ۱۲ لاکھ روپے سالانہ تنخواہ لیتا ہے۔ یوں صرف چیئرمینوں کو ۵ کروڑ ۸۷ لاکھ ۶۷ ہزار روپے سالانہ ادا کیے جاتے ہیں، جن میں ہر چیئرمین کا ۳۶۰ لیٹر پٹرول، ساڑھے سات ہزار ماہانہ ٹیلی فون بل، میٹنگز اور سیکشنری کے اخراجات شامل نہیں ہیں۔ ان کے ذاتی عملے کی تنخواہیں اور دفاتر کے روزمرہ کے اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔ اس سلسلے میں صرف کشمیر کمیٹی کی مثال ہی کافی ہے، جسے ۹۷ء میں مسئلہ کشمیر اجاگر کرنے کے لیے ایک کروڑ ۲۸ لاکھ ۸۱ ہزار روپے دیے گئے لیکن اس خطیر رقم کے باوجود مسئلہ کشمیر حل ہوا اور نہ ہی عالمی رائے عامہ ہموار ہوئی۔

ان سارے اخراجات سے صرف نظر کر دیا جائے تو بھی قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف جیسے تخریبی عہدے پر ۶۷ لاکھ ۲۵ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ یہ رقم صرف بے نظیر کی تنخواہ اور مراعات پر ضائع ہوتی ہے جبکہ سینٹ میں لیڈر آف دی ہاؤس اور قائد حزب اختلاف کے مجموعی اخراجات ۶۳ لاکھ ۵۸ ہزار روپے ہیں۔

مجھے ایک صاحب بتا رہے تھے کہ پارلیمنٹ ہاؤس کے اندر رہنے والی ''مخلوق'' کی نگہداشت پر ہر سال ۱۰۰ کروڑ روپے ضائع ہوتے ہیں جبکہ یہ لوگ جو کام کرتے ہیں وہ اس سے کہیں کم پیسوں میں عام سطحی ذہنیت کا مالک شہری بخوبی سرانجام دے سکتا ہے، پھر ان لوگوں کے نخرے کیوں اٹھائے جائیں۔ لوگ کیوں ان لوگوں کی تنخواہوں، مراعات اور اللوں تللوں کے لیے اپنے پیٹ کاٹیں۔ کیوں اپنی ضروریات کا گلا گھونٹ کر خود انحصاری فنڈ میں رقم جمع کرائیں۔

جب اس پیالی کے پیسے، جو میں نے شدید طلب کے باوجود نہیں پی، میرے کرپٹ، بے ایمان اور

بے اصول ایم این اے یا راشی افسر کی جیب میں جانے ہیں تو پھر میں اپنی طبیعت پر جبر کیوں کروں؟

یقین فرمایئے میں نے تو قومی ایجنڈے کے اعلان کے بعد پارلیمنٹ ہاؤس، منسٹر کالونی، ایم این اے ہاسٹل، فیڈرل لاجز اور سیکرٹریٹ کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی، دولت کا زیاں، قومی وسائل کا بے دریغ استعمال اور اسراف میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ایک ایم این اے کی پیجیرو کل بھی پانچ ہزار کا پٹرول پھونکتی تھی، آج بھی اس کے سلنسر سے اتنا ہی دھواں خارج ہوتا ہے۔ ایک وزیر کا ٹھاٹھ کل بھی اتنا تھا اور آج بھی اتنا ہے۔ قائمہ کمیٹیوں کے ارکان کل بھی ٹی اے ڈی اے کی چٹیں فائلوں میں لگا کر پھر رہے تھے آج بھی ان کے ہاتھوں میں چیک ہیں۔ سینیٹر کل بھی منرل واٹر پیتے تھے، آج بھی ان کی گاڑیوں میں "میڈ ان فرانس" ہے۔ ارکان اسمبلی کل بھی "ڈن ہل" سگریٹ پیتے تھے، آج بھی ان کی گاڑیوں سے غیر ملکی تمباکو کی خوشبو آتی ہے۔ پھر وہ خود انحصاری کہاں ہے، جس کا اعلان میاں نواز شریف کر رہے ہے۔ وہ بچت، اخراجات کم کرنے کے وہ نعرے اور پیٹ پر پتھر باندھنے کے عزم کہاں ہیں۔

جناب میاں نواز شریف صاحب! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ دلدل پر عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یا پھر ریت کے گڑھوں میں پانی جمع کر رہے ہیں، ورنہ آپ کو یہ ۱۰۰ کروڑ روپے ضرور نظر آتے ہیں جن کا اس قوم کو رتی بھر فائدہ نہیں۔

آپ یقیناً جاڑے کے موسموں میں اس غریب پاکستانی، جس کے تن پر کپڑے بھی پورے نہیں، کمبل دے رہے ہیں، لیکن آپ کے ساتھی اس کے نیچے سے دری کھینچ رہے ہیں۔ آپ اگر اس غریب کا بھلا چاہتے ہیں، تو اس پر کمبل بے شک نہ دیں، بس دری کھینچنے والے ہاتھ پکڑ لیں۔

اس "ویسٹ لینڈ" جس میں ایک ایک رکن اسمبلی کروڑ روپے اجاڑتا ہے، چائے کی پیالیوں میں کمی سے ملک کو خود انحصاری کی پٹڑی پر لانے کا خواب چھت پر چڑھ کر درخت لگانے جتنی حماقت ہے۔

کٹا دور باندھیں

گجرات، میرے علاقے میں یہ قصہ بڑا مشہور ہے۔

کسی زمیندار کی بھینس نے دودھ دینا بند کر دیا، زمیندار بڑا پریشان ہوا، اسے پریشان ہونا بھی چاہیے تھا، کیونکہ بھینس کو "زچگی" کے مراحل سے گزرے ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے، اسے کھل بنولا اور چارہ بھی خوب ملتا تھا، ٹہل سیوا بھی ٹھیک ہوتی تھی، بھینس سے مسلی کا رویہ بھی دوستانہ تھا، پھر اس کی ناراضی ناقابل فہم نہ ہوتو کیا ہو، زمیندار بھینس کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن دیا، کوئی فرق نہ پڑا، بھینس کو گاؤں کے سیانے کے پاس لے جایا گیا، اس نے ٹونے ٹوٹکے آزمائے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی، پھتو شاہ کو لایا گیا، اس نے مرچوں کی دھونی دی، دم کیا ہوا پانی چھڑکا، گلے میں تونا ہوا جوتا باندھا پر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ زمیندار کی ماں کی مدد لی گئی "بے بے جی" نے بھینس کی خوراک بڑھا دی، دودھ میں دیسی گھی ملا کر دیا، لیکن یہ جتن بھی بھینس کے آگے بین ہی ثابت ہوا، بالآخر زمیندار شاید ذہنی کوفت کا شکار ہو گیا، چنانچہ اس نے بھینس قصائی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن اس سے قبل کہ وہ اسے عملی جامہ پہناتا وہاں سے سائیں بلی کا گزر ہوا۔ سائیں بلی جسے گاؤں کے لوگ جھلا (پاگل) کہتے تھے، نے سارا قصہ سن کر زمیندار سے پوچھا "چودھری یہ تو بتاؤ تم کٹا (بھینس کے صاحبزادے کو پنجابی میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے) کہاں باندھتے ہو۔ چودھری نے فوراً جواب دیا، بھینس کی کھرلی پر۔" بلی نے دوسرا سوال کیا "کٹے کا سنگل (زنجیر) لمبا ہے یا چھوٹا؟" زمیندار نے تھوڑا سا سوچ کر کہا "لمبا ہے۔" بلی نے قہقہہ لگایا اور چیخ کر کہا "چودھری ساری مج (بھینس) تو کٹا چنگ (پی) جاتا ہے، تمہیں کیا ملے گا، کٹا بھینس سے دور باندھا کرو۔"

قومی اسمبلی اور سینٹ کی ۵۰ کمیٹیاں ہیں، ہر کمیٹی کا ایک چیئرمین ہے، ہر چیئرمین کے ذاتی دفتر کی تیاری پر ۹۴ء میں دو دو کروڑ روپے خرچ ہوئے تھے، ہر چیئرمین سات ہزار روپے ماہانہ تنخواہ لیتا ہے، اسے گریڈ سترہ کا پرائیویٹ سیکرٹری، گریڈ پندرہ کا ایک سٹینو، ایک نائب قاصد، ۱۳۰۰ سی سی کی برانڈ نیو گاڑی، ایس ٹی ڈی فون، ۳۶۰ لیٹر فی گاڑی پٹرول، رہائش اور رہائش پر فری فون کی سہولت حاصل ہے۔

رول کے مطابق یہ لوگ صرف قومی اسمبلی اور سینٹ کے سیشنوں کے دوران اجلاس بلا سکتے ہیں،

لیکن ان کمیٹیوں نے کراچی، لاہور، کوئٹہ اور پشاور سمیت ملک کے درجنوں شہروں میں بیسیوں اجلاس بلائے اور فی ممبر پانچ ہزار روپے ہر اجلاس میں کمائے (یہ کروڑوں روپے بنتے ہیں)

ان کمیٹیوں کا اجلاس جہاں بھی ہو متعلقہ وزارت کے سیکرٹری کا وہاں پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ تمام ممبروں کی رہائش، انٹرٹینمنٹ اور گاڑیوں کا انتظام کیا جاتا ہے، انہیں اجلاس شروع ہونے سے تین روز پہلے اور تین روز بعد تک کا ٹی اے ڈی اے دیا جاتا ہے، یوں ایک تخمینے کے مطابق گزشتہ تین برسوں میں یہ ۵۰ کمیٹیاں ساڑھے چار ارب روپے کا دودھ "چنگ" چکی ہیں، اب ان کے ماہانہ خرچے چار کروڑ روپے سے زائد ہیں۔

سوچنے کی بات ہے، ایک ایسا ملک جو بے حد غریب اور مقروض ہے، جہاں لوٹ کھسوٹ ڈکیتیاں، چوریاں، اختیارات سے تجاوز، کرپشن اور قرضے پی جانا کلچر بن چکا ہے۔ جہاں کرپشن کے ۹۲ فیصد الزامات ارکان اسمبلی، موجودہ اور سابق حکمرانوں پر عائد ہوتے ہیں، جہاں رسہ گیری اڈوں کی خرید وفروخت، منشیات کا دھندہ، ناجائز اسلحہ کے ڈپو اور جگا ٹیکس وصول کرنے تک کے سارے کام ارکان اسمبلی کے زیر سایہ ہوتے ہیں، اس ملک میں یہ کمیٹیاں کیا قانون سازی کر رہی ہیں، وہ کون سے "مقدمات" ہیں، جو ان کے زیر سماعت ہیں، انہوں نے کن کن معاملات کی چھان بین کی، کتنے کیس بنا کر عدالتوں کے سپرد کیے اور کتنے مسائل سلجھا کر ایوان میں پیش کیے، پھر ان کمیٹیوں کی کیا جسٹی فیکیشن ہے؟

ہوسکتا ہے، ان کمیٹیوں کے معزز ارکان دعویٰ کریں کہ وہ نظام کی اصلاح کے لیے رات دن کام کرتے رہے۔ نیند کی کثرت سے ان کی آنکھیں پتھر ہو گئیں، کرسیوں پر بیٹھ بیٹھ کر ان کی کمر پر زخم آ گئے، اور لکھ لکھ کر ان کی انگلیاں سوج گئیں، درست ہے، لیکن سوال ہے، اس محنت شاقہ کے باوجود نظام ٹھیک کیوں نہیں ہوا؟ کیوں اصلاح احوال کی کوئی تدبیر نظر نہیں آئی، کیوں حالات کے الجھے ہوئے دھاگے نہیں سلجھے؟ کیوں صحرا میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نہیں چلے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان معزز ارکان کا "ٹیلنٹ" ہی غلط جگہ صرف ہو رہا ہو، انہیں ایسی دیوار چاٹنے پر لگا دیا گیا ہو جس نے صبح دوبارہ سامنے آ کر کھڑا ہونا ہے، انہیں مغرب کے بجائے مشرق کی طرف سفر کا حکم دے دیا گیا ہو، اگر ایسا ہے تو پھر انہیں کسی پیداواری کام پر کیوں نہیں لگایا جاتا ہے؟

مجھ سے ایک حکومتی کارندے نے پوچھا "حکومت قوم کو بچت کے لیے کیسے قائل کرسکتی ہے؟" میں نے عرض کیا "عوام تو برسوں سے بچت ہی کر رہی ہے اب آپ لوگ بھی کچھ خیال کریں۔" بولا "کیا مطلب؟" میں نے دوبارہ عرض کیا "میرے عزیز اس ملک میں کتنے لوگ ہیں، جو سال میں دو جوڑے کپڑے سلوا سکتے ہیں، کتنے لوگ ہیں جو دن میں تین بار کھانا کھا سکتے ہیں، کتنے لوگ ہیں، جو ہوائی سفر کا لطف اٹھا سکتے ہیں، کتنے لوگ ہیں جو ٹیلی فون پر لمبی لمبی کالیں کر سکتے ہیں؟ چند ہزار یا چند لاکھ۔ جب تک یہ لوگ قربانی نہیں دیتے، بات آگے نہیں بڑھے گی، تم خود دیکھو یہ لوگ اقتدار سے الگ کیوں نہیں ہونا چاہتے، صرف اس لیے

میرے عزیز کہ اقتدار ایک ایسی ماں ہے، جو ان لوگوں کے سارے نخرے اٹھاتی ہے، جب تک یہ لوگ اپنا لائف سٹائل نہیں بدلیں گے کوئی فرق نہیں پڑے گا، کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

جی ہاں محترم قارئین! ایک کٹھن اور مشکل وقت ہمارے دروازے پر کھڑا ہے، ہمیں پیٹ پر پتھر باندھنے پڑیں گے ہم باندھیں گے بھی۔ پر یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم تو بھوکے سوئیں، ہمارے بچے تو قربانی کی سولی چڑھ جائیں لیکن کمیٹیوں کے ''اجلاس'' اسی طرح جاری رہیں، اسی طرح ساڑھے چار کروڑ روپے ماہانہ ضائع ہوتے رہیں۔ ''کٹے'' اسی طرح سارا دودھ ''چنگھتے'' رہیں۔

ہم سے قربانی مانگنے سے پہلے آپ کو بھی تو ان ''کٹوں'' کی زنجیریں چھوٹی کرنا ہوں گی۔ انہیں بھینسوں سے دور باندھنا ہوگا۔

روکو، روکو

کچھ شاعر مشاعرہ پڑھنے کے لیے فیصل آباد جا رہے تھے، منتظمین نے نازک ''مخلوق'' کو سفر کی صعوبتوں سے بچانے کے لیے ''سالم'' کوچ کرا دی، کوچ جوں ہی لاہور سے باہر نکلی منیر نیازی نے ہاتھ پیٹ پر رکھے اور ''روکو، روکو'' کا نعرہ لگا دیا، ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر دیکھا ''مجھے وہ آیا ہے'' منیر نیازی نے چھوٹی انگلی لہرا کر با آواز کہا، ڈرائیور نے بریک لگا دی، منیر نیازی نے چھلانگ لگائی اور بھاگ کر کھیتوں میں گھس گئے، دس منٹ بعد وہ مطمئن چہرہ اور ایک طویل گنا لے کر واپس آ گئے، کوچ میں داخل ہوتے ہی انہوں نے ڈرائیور سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا ''معاف کرنا بھائی میرا مثانہ ذرا کمزور ہے۔'' ڈرائیور نے گردن ہلا کر ''کوئی بات نہیں'' کہا اور کوچ گیئر میں ڈال دی، ابھی گاڑی نے بمشکل دس بارہ کلومیٹر کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ منیر نیازی نے دوبارہ پیٹ پر ہاتھ رکھے اور ''روکو، روکو'' کا نعرہ لگا دیا، بریک لگی اور دوبارہ کھیت میں گم ہو گئے، دس منٹ بعد واپس لوٹے تو ان کے ہاتھ میں تازہ مولی تھی، ڈرائیور نے گردن ہلا کر ''کوئی بات نہیں'' کہا اور گاڑی گیئر میں ڈال دی لیکن چند کلومیٹر بعد ایک بار پھر پیچھے سے ''روکو، روکو'' کی آواز آئی، بریک چرچرائے اور منیر نیازی آزار بند ہاتھ میں پکڑ کر کھیت کی طرف قلانچیں بھرنے لگے، اس بار واپسی پر ان کے ہاتھ میں گونگلو (شلجم) تھا، ڈرائیور نے تھکا تھکا سا ''کوئی بات نہیں'' کہا اور چل پڑا...... لیکن ابھی...... موقعہ واردات پر موجود عینی شاہدوں کے مطابق جب متعدد بار ''روکو، روکو'' میرا ذرا مثانہ کمزور ہے، کوئی بات نہیں'' کے بعد بھی گاڑی فیصل آباد سے اتنی ہی دور تھی جتنی تین گھنٹے اور پندرہ عدد روکو، روکو سے پہلے تھی تو ڈرائیور نے زچ ہو کر کہا ''بھائی صاحب یوں تو ہم کبھی فیصل آباد نہیں پہنچ سکیں گے۔'' منیر نیازی نے دونوں ہاتھ نیفے پر جما کر پوچھا ''کیا فیصل آباد ابھی بہت دور ہے؟'' اب اس سے قبل کہ ڈرائیور کی طرف سے کوئی ''دندان شکن'' جواب موصول ہوتا پیچھے سے شریف کنجاہی صاحب نے ہانک لگائی ''نہیں خیر اب اتنا بھی دور نہیں بس یہی کوئی بیس پچیس روکو، روکو کا ہی تو فاصلہ ہے۔''

گو ۲۰۱۰ء والے احسن اقبال موجودہ حکومت اور اس سے پہلے آنے والی متعدد حکومتوں میں سے معقول ترین وزیر ہیں، ان کی آنکھوں میں ہر وقت کچھ کرنے کی تڑپ اور ان کے لہجے میں اصلاح احوال کی

شدید ترین خواہش کروٹ لیتی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے سارے سوال ''کیا فیصل آباد ابھی بہت دور ہے'' ہی لگتے ہیں، کچھ روز پہلے چیمبر آف ریفارمز کانفرنس پر ان سے ملاقات ہوئی تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اولڈ پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کے ایک کونے میں بیٹھ گئے، اور پھر دیر تک جذباتی انداز میں مجھے اپنے پلان سمجھاتے رہے، ہم اگلے سال تک اتنے سلیبس تیار کریں گے، اتنے نئے سکول کھولیں گے، کمپیوٹر کو اتنا فروغ دیں گے، پورے ملک سے اتنا ٹیلنٹ اکٹھا کریں گے، اتنے چیمبر آف ریفارم جمع کریں گے، نظام کو اتنا سہل بنا دیں گے، اتنی خوشحالی آئے گی، اتنا اناج ہوگا، اتنی فراوانی اور اتنی آسودگی حاصل ہوگی، اور پھر آخر میں، کیا اس ترقی کے بعد بھی ہم ایک محروم اور پسماندہ قوم ہی کہلائیں گے؟ وغیرہ وغیرہ'' میں نے انہیں خاموش دیکھ کر فیصل آباد کا فاصلہ بتانے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کر دی اور پھر اسی خروش سے بولتے چلے گئے جو ایک کھرے مگر خواب دیکھنے والے شخص کا خاصا ہوتا ہے۔

''تم سنگاپور ہی کی مثال لو جب وہ اگست ۱۹۶۵ء میں آزاد ہوا تو وہاں بنجر چٹانوں اور سمندری جھاگ کے سوا کیا تھا لیکن صرف ۱۰ ہی برس میں ساری دنیا کی معاشی جڑیں اس بے آب وگیاہ جزیرے میں پیوست ہو گئیں آج اس جزیرے کے ذخائر سو بلین ڈالر کے قریب پہنچ چکے ہیں، جب سنگاپور کے چند لوگ یہ معجزہ دکھا سکتے ہیں تو ہم ۱۴ کروڑ لوگ مل کر اس ملک کا مقدر کیوں نہیں بدل سکتے؟'' میں نے جواب عرض کرنے کے لیے پہلو بدلا لیکن انہوں نے مجھے انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

''تم کوریا، ملائیشیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ کی مثال لو ۱۹۶۷ء میں ان کی مجموعی برآمدات پاکستان سے کہیں کم تھیں، ان کے ایکسپرٹس ہماری ترقی کا جائزہ لینے پاکستان آتے تھے، لیکن آج'' ...... انہوں نے افسوس سے گردن ہلائی ''تم ان میں سے کسی ملک کی برآمدات کا چارٹ اٹھا کر دیکھو وہ تمہیں پاکستان سے کئی گنا آگے نظر آئے گا کیوں، آخر کیوں؟ وہ لوگ ہم سے آگے کیوں ہیں؟ ہم لوگ ان تک کیوں نہیں پہنچ سکتے اور تم لکھ لو ہم انشاء اللہ ۲۰۱۰ء تک...... '' میں نے انہیں ایک بار پھر فیصل آباد کا فاصلہ بتانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس بار بھی مجھے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کر دی۔

''دیکھو ہم محنت اور پلاننگ کے ذریعے، وسائل اور ٹیلنٹ کی لیکج روک کر دس بارہ برسوں میں ان ممالک کے قریب پہنچ سکتے ہیں! ہم کر سکتے ہیں بھائی کر سکتے ہیں! اب دلی دور نہیں ہے۔'' میں نے اندر ہی اندر پیچ وتاب کھائے، میرا جی چاہا، میں ان کی انگلی کے اشارے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہوں ''احسن بھائی ہم نہیں کر سکتے ہم کبھی سنگاپور، ملائیشیا، کوریا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا نہیں بن سکتے کیونکہ ہماری کوچ میں ایسے لوگ سوار ہیں۔ جو ہر چند کلومیٹر بعد پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ''روکو، روکو'' کی دہائی دے کر گاڑی رکوا لیتے ہیں اور پھر آزار بند پکڑ کر کھیتوں کی طرف دوڑ لگا دیتے ہیں، یہ لوگ جب واپس آتے ہے تو ان کے ہاتھوں میں کبھی گنا، کبھی مولی اور کبھی گونگلو ہوتا ہے، یہ ایسے لوگ ہیں جو یہ حقیقت تک نہیں جانتے کہ کمزور مثانوں والوں کی کوچیں کبھی

شاہراہ ترقی پر نہیں چڑھ سکتیں، ان کا فیصل آباد ہمیشہ بیس پچیس روکو، روکو کے فاصلے پر ہی رہتا ہے، رہی بات جاپان، جرمنی اور ان کے بعد سنگاپور، کوریا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور ملائیشیا کی تو وہ لوگ ہم سے زیادہ سیانے تھے، انہوں نے آغاز سفر ہی میں روکو، روکو نسل کے سارے لوگ ''آف لوڈ'' کر دیئے تھے لیکن ہم وہ بدنصیب لوگ ہیں جو ابھی تک ہاتھیوں کو فیڈر سے دودھ پلا رہے ہیں لہٰذا ہم لوگ ۲۱ ویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہو کر بھی روکو، روکو ہی کی آوازیں سن رہے ہیں۔''

انہیں نمک چاہیے

ذرا تصور کیجیے آپ کسی کے گھر مہمان ہوں، کھانے کی میز پر بیٹھے ہوں، آپ کو نمک کی طلب ہو، نمک دان آپ کی دسترس سے دور پڑا ہو، آپ میزبان سے نمک طلب کریں، وہ مسکرائے، نیپکن سے ہاتھ صاف کرے اور نمک دان کی بجائے آپ کو ڈونگا پکڑا دے، آپ عرض کریں ''نہیں، جناب مجھے تو نمک چاہیے۔'' میزبان معذرت کرے، ڈونگا نیچے رکھے اور گلاس اٹھا کر آپ کو پیش کر دے، آپ عرض کریں ''نہیں حضور مجھے نمک چاہیے نمک۔'' میزبان پھر معذرت کرے، گلاس نیچے رکھے اور آپ کو چمچ پکڑا دے، اس کے بعد مطالبے اور معذرت کا طویل سلسلہ شروع ہو جائے، آپ نمک مانگتے رہیں اور وہ آپ کو ڈونگے، گلاس اور چمچ پکڑاتا رہے تو آپ کی میزبان کے بارے میں کیا رائے ہوگی، آپ بھی کہیں گے نا...... لیکن نہیں ذرا ٹھہریے ابھی رائے نہ دیجیے کیونکہ میرا خیال ہے آپ کی رائے تھر کے شتربان بخشو سے مختلف نہیں ہوگی جس سے میں نے صدارتی اور پارلیمانی نظام سے کسی ایک کے انتخاب کا کہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولا ''صاحب ہمیں نظاموں سے کیا لینا دینا ہم تو بس اتنا جانتے ہیں، ہم، ہمارے باپ دادا اور پھر ان کے باپ دادا صدیوں سے ان جوہڑوں کا پانی پیتے آ رہے ہیں جن سے ہمارے ڈھور ڈنگر پیتے ہیں، ہم سینکڑوں برس سے بکریوں کی طرح جھاڑیوں کے پتے کھا رہے ہیں۔'' میں نے جواب کے لیے اصرار کیا تو اس نے نکیل کو جھٹکا دے کر کہا ''صاحب تھر کا ہر باسی کسی ایسے نظام کا منتظر ہے جو اسے ٹھنڈا، میٹھا اور صاف پانی دلا دے۔''

آپ ابھی اپنی رائے محفوظ رکھئے کیونکہ مجھے اندیشہ ہے، آپ کی رائے ''الاخوان'' کے امیر مولانا اکرم اعوان کی سوچ سے مختلف نہیں ہوگی، میں نے ان سے پوچھا ''آپ لوگ کیسا امیر المومنین چاہتے ہیں۔'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولے ''ہمارے لوگوں کو ایسا حکمران چاہیے جو ہماری طرح کیچڑ چھان کر پیے یا پھر اس کی طرح ہمارے ہاتھوں میں بھی منرل واٹر کی بوتلیں ہوں۔'' مجھے ڈر ہے آپ کی رائے اس محمود کے فلسفے سے مختلف نہیں ہوگی جس نے پانچ برس کی مسلسل بے روزگاری کے بعد خودکشی کر لی، آخری ملاقات میں اس نے مجھ سے کہا تھا ''جو نظام یونیورسٹی میں اول آنے والے طالب علم کو میرٹ پر نوکری نہیں دے سکتا اسے انسانوں پر حکمرانی کا کوئی حق نہیں۔'' آپ کی رائے راولپنڈی کی سلمٰی سے مختلف نہیں ہوگی جس نے یتیم بہن بھائیوں کی

خاطر اپنے ہی بدن میں کود کر خودکشی کر لی تھی، آپ کی رائے ڈاکے اشفاق سے مختلف نہیں ہو گی جو غربت سے تنگ آ کر اپنا نومولود بچہ کسی کی دہلیز پر چھوڑ آیا تھا، آپ کی رائے آرائے بازار کے محمد ابراہیم سے مختلف نہیں ہو گی جس نے دم توڑتی معیشت کے باعث اپنی دو بچیاں ذبح کر دی تھیں اور آپ کی رائے چونیاں کے ماسٹر صابر حسین سے مختلف نہیں ہو گی جسے نقل نہ کرانے کے ''جرم'' میں نوکری سے برخاست کر دیا گیا اور جو پچھلے سات برس سے بے گناہی کے ثبوت لیے در در بھٹک رہا ہے لیکن کسی منصف کے پاس اس کی بات سننے کے لیے وقت نہیں۔

مجھے خطرہ ہے آپ کی رائے ان ایک کروڑ ریاستوں، نظام دینوں اور محمد رشیدوں سے مختلف نہیں ہو گی جن کی عمریں فیصلوں کے انتظار میں پٹواریوں، گرداوروں، ریڈروں، اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں ضائع ہو گئیں، آپ کی رائے ان گیارہ لاکھ مزارعوں سے مختلف نہیں ہو گی جو صدیوں سے سرداروں، پیروں اور چودھریوں کے ڈیروں پر پیدا ہوتے اور انہیں کے کھیتوں میں مرتے چلے آ رہے ہیں، آپ کی رائے ان ۵۰ لاکھ ''چھوٹوں'' سے مختلف نہیں ہو گی جنھوں نے حصول علم کی عمر گاڑیاں دھوتے، پنکچر لگاتے اور برتن مانجھتے گزار دی، آپ کی رائے قائداعظم کے اس نواسے سے مختلف نہیں ہو گی جو پراٹھے لینے نکلا اور پولیس تشدد کا شکار ہو کر زندگی کی بازی ہار گیا، آپ کی رائے ملتان کی اس زرینہ سے مختلف نہیں ہو گی جس کا اکلوتا بچہ دوا نہ ملنے کے باعث نشتر ہسپتال کے گیٹ پر مر گیا، اور آپ کی رائے لاہور کے اس محمد فیاض سے مختلف نہیں ہو گی جس نے امداد کی ایک درخواست دی، کاغذ کا ایک ٹکڑا چار سال میں پانچ فائلیں بن گیا لیکن امداد نہیں ملی۔

جی ہاں میرا خیال ہے آپ کی رائے تھر کے ۲۱ لاکھ بخشوؤں ساڑھے چار لاکھ پڑھے لکھے بے روزگار محمودوں، ہزاروں لاکھوں سلماؤں اشفاقوں، ابراہیموں، صابر حسینوں اور چھوٹوں سے مختلف نہیں ہو گی جنھیں پندرھویں ترمیم کے منظور یا مسترد ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ان کی بلا سے نظام صدارتی ہو یا پارلیمانی، فیصلے عمامے پہن کر کیے جائیں یا وگ لگا کر، ملک کا سربراہ امیر المومنین کہلائے یا وزیراعظم، اختیارات وفاقی حکومت کے پاس ہوں یا صوبائی سربراہوں کے ہاتھ میں، بل دو تہائی اکثریت سے پاس ہوں یا سادہ اکثریت سے، ہفتہ وار چھٹی اتوار کو ہو یا جمعے کو، سود کا نام مارک اپ رکھ دیا جائے یا انٹرسٹ، خواتین برقعہ پہنیں، یا دوپٹہ اوڑھیں، تعلیم عربی میں دی جائے یا انگریزی میں...... انہیں بلوں، ترمیموں اور پارلیمانی بحثوں سے کوئی غرض نہیں انہیں تو بس صاف ستھرا پانی چاہیے، باعزت روزگار، ضرورت کے مطابق تنخواہیں سستا اور فوری انصاف، آزادی، تعلیم، دوا، سڑکیں، بجلی، ٹیوب ویل اور ایک سیدھا سادا نظام چاہیے۔

جی ہاں ان لوگوں کو نمک چاہیے، انہیں ترمیموں اور بلوں کے ڈونگے، گلاس اور چمچ نہ پکڑائیں، ان کا مطالبہ، ان کی خواہش سمجھیں۔

شیدا چور

شیدا چور کسی افسانے کا کردار ہے، یہ افسانہ میں نے کہیں بچپن میں پڑھا تھا۔ کتاب اور مصنف کا نام تو ذہن سے محو ہو گیا، لیکن شیدا بری طرح دماغ سے چپک گیا۔

شیدے کی کہانی کچھ یوں تھی، شیدا غربت، بے روزگاری اور فاقوں سے مجبور ہو کر کسی نانبائی کی دکان سے ایک نان چرا لیتا ہے۔ شیدا گڑگڑا کر معافی مانگتا ہے، منتیں کرتا ہے، ظالم "سیٹھ" کے پاؤں پکڑتا ہے، لیکن اس کا دل نہیں پسیجتا اور یوں شیدے کو پولیس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جرم ثابت تھا، مجرم اقراری تھا، گواہ سارے زندہ تھے، لہٰذا پولیس کو چالان بنا کر عدالت میں پیش کرتے دیر نہ لگی۔ جج مقدمہ سن کر شیدے کو چھ ماہ کی قید سنا دیتا ہے۔ شیدا جیسے تیسے قید کاٹ کر باہر آتا ہے تو پتا چلتا ہے اس کا نام محمد رشید سے شیدا چور ہو چکا ہے، سارا شہر، سارا محلہ یہاں تک کہ خود اس کے گھر والے اب اسے شیدا چور کہہ کر بلاتے ہیں۔ شیدا یہ زخم بھی قدرت کا "انعام" سمجھ کر سہہ گیا، لیکن کرنی خدا کی کیا ہوئی، انہی دنوں اسی نانبائی کے "سیف" سے ہزار روپے چوری ہو گئے۔ رات پولیس آئی اور شیدے کو شک میں پکڑ کر لے گئی، شیدے نے جرم سے انکار کیا تو پولیس کو جرم "ثابت" کرنے کے لیے چھتر ول کا سہارا لینا پڑا۔

اس بار شیدے کو ایک سال قید ہوئی، رہائی کے بعد شیدا واپس آیا تو نسک بند چور مشہور ہو چکا تھا۔ اس کے بعد شہر میں کہیں بھی چوری، چکاری، رسہ گیری یا ڈکیتی کی واردات ہوتی، پولیس فوراً شبے میں شیدے کو دھر لیتی۔ یوں پولیس اور چوروں کی مہربانی سے شیدا جلد ہی دس نمبری ہو گیا۔ تھانے میں اس کی تصویر لگ گئی......

یہ افسانہ بہت طویل تھا، میں اکثر جزئیات بھول چکا ہوں، تاہم مجھے اس کا اختتام اچھی طرح یاد ہے۔ شیدا چور جب "وصولیاں" کراتے کراتے عین جوانی میں مر گیا تو پتا چلا وہ تین دن کے فاقے سے تھا اور اس نے زندگی میں ایک نان کے سوا (جس سے اس نے صرف ایک ہی لقمہ توڑا تھا) کبھی کوئی چوری نہیں کی۔

میں جناب حفیظ پاشا کی دیدہ دلیری کی داد دیتا ہوں، جنہوں نے دس ارب روپے کا بجٹ خسارہ پورا کرنے کے لیے عوام کا انتخاب کیا، قابل داد ہیں جناب سرتاج عزیز جنہوں نے اس تاریخی فیصلے کی بھرپور حمایت فرمائی اور قابل صد ستائش ہیں کابینہ کے وہ پچیس تیس ارکان جنہوں نے تالیاں بجا کر اس جرأت مندانہ

اقدام کا استقبال کیا۔

مجھے خوشی ہے یہ دس ارب روپے بھی غریب عوام ہی کی جیب سے وصول کیے جائیں گے۔ مجھے یہ بھی خوشی ہے کہ حکومت نے یہ رقم ان راشی افسروں کی انتڑیوں سے نکالنے کی بجائے، جو فائل آگے چلانے، ایک دستخط کرنے، چند کاغذ نیچے دبانے، مخصوص نوٹ لکھنے اور وزیروں کو دھوکا دینے کے عوض ہر سال ۴۰ ارب روپے بریف کیسوں میں بھر کر گھر لے جاتے ہیں، عوام ہی کو یہ اعزاز بخشا۔

مجھے خوشی ہے حکومت نے ان ۲۰۰ بزنس مینوں اور صنعتکاروں کو پکڑنے کی بجائے جو ۹۸ کروڑ کا انکم ٹیکس دبائے بیٹھے ہیں، اس بار بھی اس عوام کی گردن پر ہی پاؤں رکھا جو وقت پر ٹیکس ادا کرتے ہیں، جو بجلی، گیس اور ٹیلی فون کے نادہندہ بھی نہیں۔

مجھے خوشی ہے حکومت نے اس مشکل دور میں بھی ان بااثر لوگوں کو نہیں چھیڑا، جو ہر سال ۴۰ کروڑ روپے کے محصولات بچاتے ہیں، جو ۲۲ کروڑ روپے کی ایکسائز ڈیوٹی، ۲۱ کروڑ روپے کا نہری پانی، ۱۲ کروڑ روپے کی لکڑی اور ۱۸ کروڑ روپے کی بجلی اور گیس چوری کرتے ہیں۔

مجھے خوشی ہے، جناب حفیظ پاشا کی نظر کرم سے وہ لوگ اس بار بھی محفوظ رہے جو سرکاری دفاتر سے سوا کروڑ روپے کی سٹیشنری چوری کرتے ہیں، ۲ کروڑ کا سیمنٹ، سریا، گارڈر اور ٹی آئرن چراتے ہیں، پانچ کروڑ کی تاریں، کھمبے ٹرانسفارمر غائب کر جاتے ہیں، پونے چھ کروڑ کی ادویات، انسٹرومنٹس اور مریضوں کی خوراک کھا جاتے ہیں، ۸ کروڑ روپے کی سڑکیں جیب میں ڈال لیتے ہیں اور ۱۰ کروڑ روپے کی گلیاں، نالیاں اور پلیاں اڑا لے جاتے ہیں۔

مجھے خوشی ہے اس بار بھی وفاقی حکومت کے ان دفاتر اور سرکاری افسروں کی ان رہائش گاہوں پر کوئی غور و فکر نہیں ہوا، جن کا ہر ماہ ۴ کروڑ ۴۳ لاکھ ۲ ہزار ۳۰ روپے کرایہ ادا کیا جاتا ہے، ان دفاتر کو پرائم منسٹر سیکرٹریٹ (مرحوم) میں منتقل کرنے کا کوئی منصوبہ زیر غور نہیں آیا، وہ ۲ لاکھ گیلن پٹرول بچانے کی فکر بھی نہیں کی گئی جو سرکاری ڈرائیور بسوں اور ویگنوں کے اڈوں پر بیچ جاتے ہیں۔

مجھے خوشی ہے حکومت نے ۱۰ ارب کا یہ خسارہ بے نظیر بھٹو کے ان ۲۲ ارب ڈالرز سے ایک آدھ ارب ڈالر وصول کر کے پورا نہیں کیا، جو انہوں نے اس ملک کی رگوں سے نچوڑا تھا (۲۲ ارب ڈالر کی کرپشن کے ثبوت جناب سیف الرحمٰن کے پاس موجود ہیں) ان کروڑوں روپے سے پورا نہیں کیا جو جناب سیف الرحمٰن نے ٹویوٹا کرولا کا ٹیکس دے کر بی ایم ڈبلیو گاڑیاں منگوا کر کمائے تھے (اس کرپشن کے ثبوت جناب نصیر اللہ بابر کے پاس موجود ہیں) ان ۱۴ ارب روپے سے پورا نہیں کیا جو نواز شریف فیملی نے بنکوں سے لیے تھے (اس کا دعویٰ جناب شفقت محمود سابق سینیٹر کرتے ہیں) ان اربوں روپے سے پورا نہیں کیا جو فاروقی برادران نے یہاں سے سمیٹے تھے (ثبوت احتساب سیل نے ٹی وی پر دکھائے تھے) ان کروڑوں روپے سے پورا نہیں کیا جو

آصف علی زرداری کے دوست تین سال تک لوٹتے رہے (ثبوت اخبارات میں شائع ہوتے رہے)

ہاں محترم قارئین! میں داد دیتا ہوں حکومت کے ان اکنامک منیجروں کی جرأت اور حوصلے کی، جنہوں نے سابق تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بار بھی بے زبان لوگوں کو ہی قربان گاہ پر لا کھڑا کیا، میں حکومت کی عقل مندی اور دانشوری کو بھی سلیوٹ پیش کرتا ہوں، جس نے اس بار بھی اپنے بھائی بندوں کو صاف بچا لیا اور میں آپ کی بے حسی اور ڈھٹائی کو بھی صد سلام پیش کرتا ہوں جو یہ حادثہ بھی بغلوں میں ہاتھ دے کر سہہ گئے۔

کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے ''ہم'' اس ملک کے ۹۰ فیصد، ہم سب شیدے چور ہیں اور ساری حکومتیں پولیس، چوری خواہ کسی محلے میں ہو، مال کہیں سے اڑایا جائے اور ڈکیت خواہ کوئی ہو، وصولی صرف ہم سے کی جاتی ہے، الٹا صرف ہمیں ہی لٹکایا جاتا ہے، چھتر ول صرف ہماری ہی ہوتی ہے، سزا صرف ہمیں سنائی جاتی ہے قید صرف ہم ہی کاٹتے ہیں اور چور صرف ہم ہی کہلاتے ہیں، شیدے چور!

کنسلٹنٹ

کسی صاحب کی مرغیاں انڈے نہیں دیتی تھیں وہ کسی ''سیانے'' سے مشورے کے لیے گئے۔ سیانے نے پوچھا: ''مرغیاں کتنی ہیں؟'' صاحب نے جواب دیا ''۳۵'' سیانے نے پوچھا ''اور مرغے کتنے ہیں؟'' صاحب نے فوراً جواب دیا: ''کوئی نہیں۔'' سیانے نے قہقہہ لگا کر کہا: ''پھر مرغیاں انڈے کیسے دیں گی؟ بابا وہاں ڈربے میں مرغا رکھو۔''

کچھ دن گزرے تو سیانا ''موقع واردات'' کے معائنے کے لیے ''صاحب'' کے گھر پہنچ گیا۔ میزبان نے بڑے تپاک سے مہمان کا استقبال کیا، گھر کے اندر لایا، سامنے صحن میں ۳۵ مرغیاں اور دو مرغے مٹرگشت کر رہے تھے۔ سیانے نے حیرت سے پوچھا: ''جناب میں نے آپ کو ایک مرغا رکھنے کا مشورہ دیا تھا، لیکن آپ نے دو رکھ لیے۔'' صاحب نے مرغیوں کے درمیان گردن تان کر چلتے مرغوں پر نظر ڈالی اور فخر سے بولے: ''مرغا تو ان میں ایک ہی ہے، دوسرا کنسلٹنٹ ہے۔''

پاکستان میں اس وقت دو ہزار ایک سو سترہ کنسلٹنٹ کام کر رہے ہیں، جن میں ۲۰۷ غیر ملکی ہیں جبکہ باقی غیر ملکی نما پاکستانی ہیں، ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس کی تنخواہ دس ہزار ڈالر سے کم ہو، جس کے پاس دنیا جہاں کی تعیشات سے آراستہ سرکاری گھر نہ ہو، دو سے چار تک گاڑیاں، نصف درجن ملازمین اور اتنے ہی گارڈز نہ ہوں جبکہ یہ لوگ کر کیا رہے ہیں؟ بینکوں کو بینکاری سکھا رہے ہیں، انجینئروں کو مشینری، ڈاکٹروں کو مرہم پٹی، کسانوں کو بیج بونے اور اساتذہ کو پڑھانے کے طریقے سکھا رہے ہیں۔

حکومت نے آج سے دس برس پہلے سائنس کا سلیبس تیار کرنے کے لیے اسلام آباد میں ادارہ بنایا اور پنجاب کی ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو اس کا ڈائریکٹر جنرل لگا دیا۔ دنیا کے ایک بڑے مالیاتی ادارے نے پاکستان کی مشکل سمجھتے ہوئے اس ''نیک'' کام کے لیے امداد بھی دے دی، ابھی یہ ادارہ سلیبس کے لیے ''تیاریاں'' ہی پکڑ رہا تھا کہ ''اوپر'' سے نصف درجن آسٹریلین کنسلٹنٹس رکھنے کا حکم آ گیا جن کے لیے ۲۰ ہزار ڈالر تنخواہ، سرکاری رہائش، بچوں کے لیے مفت تعلیم، اے کلاس میڈیکل اور دو دو گاڑیاں طے ہوئیں، کنسلٹنٹس آ گئے۔ انہوں نے ڈی جی سمیت سارے عملے کو ہال میں جمع کیا اور تیسری دنیا میں سائنس کے جدید سلیبس پر

لیکچر دینا شروع کر دیا۔ جب لیکچر اختتام پذیر ہوا تو لنچ شروع ہوا، کھانے کی میز پر گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا چیف کنسلٹنٹ ''سمپل گریجویٹ'' ہے اور اس نے آسٹریلیا کی جس یونیورسٹی سے گریجوایشن کی اس ادارے کے ڈی جی نے اسی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی۔ مزید دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس انکشاف کے باوجود کنسلٹنٹ نہ صرف دو برس تک پاکستان میں کام کرتے رہے بلکہ تمام سرکاری مراعات سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہوتے رہے۔

عالمی بینک نے پاکستان کو زرعی تحقیق کے لیے ۶۵ ملین روپے کی امداد دی، حکومت نے فوراً کنسلٹنٹس سے رابطہ کیا جنہوں نے نہایت ہی عرق ریزی سے پاکستان کو ایگریکلچرل ریسرچ پروگرام ۲ مرتب کر کے دیا۔ پروگرام پر عملدر آمد شروع ہوا تو پتا چلا کاغذی کارروائی ملازمین اور کنسلٹنٹس کی تنخواہوں، ہوٹل کے بلوں، سپیشل الاؤنسز، ایئر ٹکٹنگ، رہائش اور چند دیگر ''غیر نصابی سرگرمیوں'' پر ۵۴ ملین روپے (امداد صرف ۶۵ ملین روپے تھی) خرچ ہو چکے ہیں جبکہ اصل کام شروع ہونے کا ابھی دور دور تک کوئی امکان نہیں۔

کچھ عرصہ پہلے حکومت نے جگلوٹ (گلگت کا ایک علاقہ) کو ''پیرس'' بنانے کا فیصلہ کیا۔ سوچ بچار شروع ہوئی تو کسی نیک نیت کنسلٹنٹ نے مشورہ دیا: ''جناب اس وقت کھٹمنڈو میں ایک فرم کا چہار دانگ عالم بڑا چرچا ہے، اگر انہیں جگلوٹ کی سٹڈی کا ٹھیکہ دے دیا جائے تو وہ چند ہی روز میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے گی۔'' یہ مشورہ مہنگے کنسلٹنٹ کا قیمتی مشورہ سمجھ کر فوراً مان لیا گیا۔ کھٹمنڈو فیکس کیا گیا، ٹکٹ بھیجے گئے، کنسلٹنٹ آئے، گلگت کا نقشہ دیکھا اور سیدھے ہو کر بولے: ''یہ تو پہاڑی علاقہ ہے'' جواب دیا: ''ہاں جناب ایسا تو ہے۔'' بولے: ''ایسے علاقوں کے جائزے کے لیے تو ہیلی کاپٹر چاہیے، کیا آپ افورڈ کر سکتے ہیں؟'' سننے والوں کے سینے پر گھونسا سا پڑا اور انہوں نے فوراً کہا: ''جناب ہم اتنے بھی غریب نہیں کہ دو چار ہیلی کاپٹروں کا بندوبست نہ کر سکیں۔'' لہٰذا اسی وقت دو چار ہیلی کاپٹر کنسلٹنٹس کے حوالے کر دیے گئے، جنہیں وہ دو ہفتے تک گلگت کے خشک پہاڑوں میں استعمال کرتے رہے دورہ ختم ہوا تو وہ ایگریمنٹ کے مطابق ڈالر جیب میں ڈال کر ۷ صفحات کی ایک رپورٹ تھما کر چلے گئے۔

کسی کنسلٹنٹ نے مشورہ دیا: ''جناب ملک میں سیمنٹ کے پلانٹ تو بہت ہو چکے ہیں، لیکن وہ ہیں سارے بے تکے۔'' پوچھا گیا: ''کیا مطلب؟'' کنسلٹنٹ نے کہا: ''جناب زیادہ تر پلانٹس ان علاقوں میں لگائے گئے، جہاں سیمنٹ کی کھپت نہ ہونے کے برابر ہے۔'' پوچھا گیا: ''پھر؟'' کنسلٹنٹ نے کہا: ''پھر سیمنٹ کی ترسیل پر اتنے پیسے خرچ ہو جاتے ہیں جتنے اس کی تیاری پر بھی نہیں ہوتے۔'' پوچھا گیا: ''پھر کیا کیا جائے؟'' کنسلٹنٹ نے جواب دیا: ''جناب فوراً سٹڈی کرائی جائے کہ مستقبل قریب میں کن کن علاقوں میں سیمنٹ کی زیادہ ضرورت ہوگی؟ پوچھا گیا: ''اس کا کیا فائدہ ہوگا؟'' کنسلٹنٹ نے کہا: ''تاکہ حکومت آئندہ صرف انہی علاقوں میں پلانٹ لگانے کی اجازت دے۔'' کہا گیا: ''ٹھیک ہے کرالیں۔'' تو کنسلٹنٹ نے

انکشاف کیا۔ ''جناب اس کام کے لیے جتنی مہارت میکسیکو کی ایک کمپنی کو حاصل ہے اتنی کرۂ ارض پر کسی دوسرے ادارے کو نہیں۔'' کہا گیا: ٹھیک ہے انہیں ہی بلا لیں۔'' یوں کنسلٹنٹ کی مہربانی سے ۲۳ اپریل ۹۸ء کو میکسیکو کے کنسلٹنٹس آئے، حکومت نے انہیں ہیلی کاپٹر لے کر دیا اور وہ پاکستان کا فضائی جائزہ لے کر چلتے بنے۔

لاہور کے ایک نیم سرکاری ادارے نے جاپان سے ایک صنعتی یونٹ خریدا، اسے لگانے کے لیے انجینئروں کی ایک ٹیم یہاں آئی تو فیشن کے طور پر ایک کنسلٹنٹ بھی بلا لیا گیا جو سارا دن چھتری کے نیچے بیٹھ کر منرل واٹر پیتا اور گردن سے پسینہ پونچھتا رہتا۔ جب کام ختم ہو گیا اور ٹیم رخصت ہونے لگی تو اس نے میزبان کو ایک رقعہ نکال کر دکھایا اور بولا: ''کیا آپ مجھے اس جگہ لے جاسکتے ہیں۔'' میزبان نے رقعہ پڑھا تو اس پر گوجرانوالہ کے کسی خراد یے، کا پتا درج تھا، میزبان نے حیرت سے وہاں جانے کی وجہ پوچھی تو کنسلٹنٹ سرشاری سے بولا: ''یہ شخص میرا استاد ہے، میں ٹوکیو میں سٹیشنری کا کام کرتا تھا، یہ وہاں غیر قانونی طور پر رہتا تھا، ہمارے فلیٹ قریب قریب تھے۔ ایک روز چھٹی کے دن ہم اکٹھے ہوئے تو اس نے کہا: ''یار تم عجیب شخص ہو مشینوں کے زمانے میں کاپیاں پنسلیں بیچ رہے ہو، میرے والا کام سیکھو، کل کو چار پیسے کماؤ گے۔'' مجھے اس کی بات میں وزن محسوس ہوا، لہٰذا میں نے اس سے کام سیکھنا شروع کر دیا۔ یہ روز فیکٹری سے آنے کے بعد مجھے دو گھنٹے لیکچر دیتا یوں میں سال چھ ماہ کی تعلیم کے بعد اس کے ساتھ فیکٹری میں ملازم ہو گیا وہاں بھی یہ مجھے سکھاتا رہا، پھر اس کی بیوی بیمار ہو گئی تو یہ وطن واپس آ گیا۔''

مجھے کنسلٹنٹس کے کردار پر کوئی اعتراض نہیں، فقط اعتراض ہے تو یہ کہ شاید ہم دنیا کی واحد قوم ہیں جو اپنا قیمتی اثاثہ غیر ملکی ''ماہرین'' کے حوالے کر کے کہتی ہے: ''جناب آئیں اور آ کر ہمیں سمجھائیں کہ کھانا کیسے کھاتے ہیں؟'' گندم بونے کا موسم کون سا ہے، بیمار کے لیے علاج کتنا ضروری ہے، بچوں کو حفاظتی ٹیکے کیوں لگانے چاہئیں اور ہمارے لیے تعلیم کتنی اہم ہے؟'' ہم ہر سال ان کنسلٹنٹس پر کتنے لاکھ ڈالر خرچ کرتے ہیں، سوچا کسی نے؟

محترم نواز شریف ایک بار تجربہ کر کے تو دیکھیں ہو سکتا ہے مرغا کنسلٹنٹ کے بغیر ہی مرغیوں کو انڈے دینے کے لیے قائل کر لے۔

چائے میٹھی نہیں ہوتی

ایک سردار جی کپ میں چمچ ہلاتے، چائے کی چسکی لیتے، برا سا منہ بناتے، کپ نیچے رکھتے اور دوبارہ چمچ ہلانے لگتے، پھر کپ اٹھاتے، چسکی لیتے، برا سا منہ بناتے اور کپ نیچے رکھ کر چمچ ہلانے لگتے، جب یہ عمل پانچ سات بار دوہرا چکے تو چمچ ٹرے میں پھینک کر بولے "لو بھئی دوستو ایک بات تو طے ہوگئی۔" دوستوں نے چونک کر پوچھا "کیا؟" سردار جی اسی یقین سے بولے "یہی ناں کہ اگر چائے میں چینی نہ ہو تو لاکھ چمچ ہلائیں چائے میٹھی نہیں ہوسکتی۔"

مجھے غصہ جناب سرتاج عزیز پر نہیں ان کے ان ملاقاتیوں پر ہے جو ان کے دفتر جاتے ہیں اور ان کا یہ اعلان سن کر کہ "اگر ہم سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دیں تو ہمیں ساڑھے چار ارب ڈالر کی امداد ملے گی" واپس آجاتے ہیں لیکن انہیں ٹوک کر، ایک لمحے کے لیے ٹوک کر یہ نہیں پوچھتے "جناب یہ رقم خرچ کہاں ہوگی، کیا اس سے وہ ریلوے لائن زندہ ہو جائے گی جو برسوں پہلے ۸۷۷۵ کلومیٹر پر پہنچ کر دم توڑ گئی تھی۔ اس رقم سے ۷۸۱ ریلوے سٹیشنوں میں اضافہ ہوگا، ایک لاکھ ۶ ہزار ایک سو ۷ کلومیٹر کچی سڑکیں پکی کی جائیں گی، ۱۳ ہزار ۴ سو ۱۹ پوسٹ آفسز کی تعداد بڑھائی جائے گی یا ۱۷۲۲ ایڑیاں رگڑتے مریضوں کو ایک کی بجائے دو ڈاکٹر دیئے جائیں گے، دانت درد کے ۳۲ ہزار ۸ سو ۲۳ مریضوں کے لیے ایک کے بجائے دو ڈینٹسٹوں کا بندوبست کیا جائے گا، ۵ ہزار ۴ سو ۶۰ چیختے چلاتے مریضوں کو ایک نہیں تین چار نرسیں فراہم کی جائیں گی، زچگی کے دوران مرنے والی ۱۱ ہزار ۵ سو عورتوں کی زندگی بچانے کے لیے گولیوں اور ٹیکوں کا بندوبست کیا جائے گا، غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے ۴ کروڑ لوگوں کے لیے ایک وقت کے کھانے کا انتظام کیا جائے گا، ہوٹلوں، ورکشاپس اور سڑکوں پر کام کرنے والے ۳۶ لاکھ نابالغ بچوں کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے گا اور ۳ کروڑ ۸۱ لاکھ ۸۰ ہزار مزدوروں کی تنخواہوں میں ایک ایک سو روپے کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

انہیں ٹوک کر ایک لمحے کے لیے ٹوک کر نہیں پوچھتے "جناب کیا گارنٹی ہے یہ رقم بھی ان ایک سو بڑے مگرمچھوں کے اکاؤنٹس میں منتقل نہیں ہو جائے گی جو عوام کے ۲۱۰ ارب روپے "مار" کر بیٹھے ہیں، ان ۳۵ افراد کے خزانوں میں دفن نہیں ہو جائے گی جنہوں نے سو ارب ڈالر لوٹ کر غیر ملکی بینکوں میں جمع کرا رکھے

ہیں، ان ۵ فیصد جاگیرداروں کا رزق نہیں بن جائے گی، جو ۷۰ فیصد قابل کاشت زمین پر قابض ہیں، ۲۷ کروڑ کی طرح یہ بھی منصوبہ ۲۰۱۰ء کے فائل ورک پر خرچ نہیں ہو جائے گی یہ بھی ۲۰ وفاقی وزراء، ۶ وزراء مملکت ۴ مشیروں، قومی اداروں کے ۸ چیئرمینوں، اڑھائی درجن پارلیمانی سیکرٹریوں اور سینٹ اور قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹیوں کے ۵۰ چیئرمینوں کا ساڑھے تین کروڑ روپے روزانہ خرچ پورا کرنے پر صرف نہیں ہو جائے گی، ۲۰ ارب روپے سالانہ کی طرح یہ بھی وزارتوں کے اخراجات، سرکاری پٹرول، ٹیلی فون، بجلی، گیس اور دفتر کے کرایوں پر خرچ نہیں کر دی جائے گی، یہ بھی تین شیڈول بنکوں کے ۲۹۷ ایڈوائزروں کی ۸ کروڑ ۹۱ لاکھ ماہانہ تنخواہوں پر خرچ نہیں ہو جائے گی۔"

انہیں ٹوک کر ایک لمحے کے لیے ٹوک کر نہیں پوچھتے "جناب آپ دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں یہ رقم سینٹ کے ۸۷ ارکان کی ۲۳ لاکھ ۶۰ ہزار ماہانہ تنخواہوں اور ۴ کروڑ ۳ لاکھ ۳۸ ہزار کی مراعات پر خرچ نہیں ہوگی، یہ رقم بھی قومی اسمبلی کے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کے ۸۷ لاکھ ۶ ہزار روپے نہیں بن جائے گی، یہ بھی ۲۰۰ وفاقی اور صوبائی وزیروں، مشیروں اور سپیشل اسسٹنٹس کو صوابدیدی فنڈ، سپیشل الاؤنسز اور ٹی اے ڈی اے میں نہیں دے دی جائے گی۔"

انہیں ٹوک کر ایک لمحے کے لیے ٹوک کر نہیں پوچھتے "جناب کیا آپ یقین دہانی کرا سکتے ہیں یہ رقم ارکان اسمبلی میں تقسیم نہیں ہوگی، سرکاری ٹھیکیداروں کی جیب میں نہیں جائے گی، کرپٹ بیوروکریسی کے گھروں، فارموں اور پلازوں پر خرچ نہیں ہوگی، اس سے وزیر لندن میں فلیٹ نہیں خریدیں گے، اس سے پجیرو، لینڈ کروزرز اور کرولا نہیں خریدی جائیں گی، اس سے ذاتی فیکٹریاں نہیں لگائی جائیں گی، اس سے جعلی سکول، سڑکیں، پل اور کاغذی نہریں ٹیوب ویل اور ٹینکیاں نہیں بنائی جائیں گی، اس سے ڈیروں کو سکول اور احاطوں کو ہسپتال قرار نہیں دیا جائے گا، یہ پارٹی اکاؤنٹس میں جمع نہیں ہوگی، اس سے جیالوں اور پروانوں کو نوکریاں نہیں دی جائیں گی اور اسے دوروں، جلسوں، ریلیوں اور کانفرنسوں پر ضائع نہیں کیا جائے گا"

انہیں ٹوک کر ایک لمحے کے لیے ٹوک کر پوچھا جائے تو مجھے یقین ہے ان کے پاس کوئی گارنٹی، کوئی دعویٰ اور کوئی یقین دہانی نہیں ہوگی، یہ سینے پر ہاتھ رکھ کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کوئی وعدہ کوئی اعلان نہیں کر سکتے کیونکہ یہ جانتے ہیں جب بھی یہ رقم پاکستان آئی اس سے ایک ڈالر بھی ان مستحق لوگوں تک نہیں پہنچے گا جن کی آزادی کے عوض یہ رقم حاصل کی گئی تھی، مزدور ان ساڑھے چار ارب ڈالروں کے بعد بھی مزدور ہی رہے گا، دہقان دہقان، ان پڑھ ان پڑھ اور بیمار بیمار ہی رہے گا، یہ زرد سورج اسی طرح اگے گا، یہ محروم زندگی اسی طرح محروم رہے گی۔

خدا کے لیے انہیں ٹوک کر ایک لمحے کے لیے ٹوک کر کہیے "جناب پیالی میں چمچ ہلانا بند کر دیں کیونکہ یہ طے ہو چکا ہے اگر چائے میں چینی نہ ہو تو لاکھ چمچ ہلائے جائیں چائے میٹھی نہیں ہوا کرتی۔"

”بالٹیاں“

میرا چھوٹا بیٹا دو برس کا ہے، آج کل کے بچوں کی طرح بلا کا ضدی اور ہٹ دھرم ہے، جس بات پر اڑ گیا ساری دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے اس کا ایک ہی اعلان ہوتا ہے ”ہمارے مطالبات پورے کیے جائیں، ہم نہیں مانتے، ظلم کے یہ ضابطے، ہم مطالبات پورے ہونے تک جدوجہد جاری رکھیں گے۔“ وغیرہ وغیرہ۔ ہمارا پورا گھر اس کی ضد اور ہٹ دھرمی سے تنگ ہے لیکن آج کل کے بے بس والدین کی طرح ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ بچہ آخر بچہ ہے اسے نہ مار سکتے ہیں، نہ سمجھا سکتے ہیں، بس اچھے وقت کا انتظار کر سکتے ہیں سو کر رہے ہیں۔

کچھ روز پہلے کا قصہ ہے ”محترم“ ایک ٹوٹی بالٹی اٹھا لائے، بالٹی کا پیندا نہیں تھا، اب ”محترم“ کا اصرار تھا یہ بالٹی پانی سے بھری جائے، میری بیوی نے کوشش کی ظاہر ہے ناکام رہی، میرے بھائی نے آدھے گھنٹے تک محنت کی لیکن نتائج صاف ظاہر تھے، میں گھر آیا تو میں نے بالٹی بڑے پائپ کے نیچے رکھ دی لیکن بے پیندا بالٹی میں پانی کیسے بھرتا، ہم سب تھک گئے لیکن ”محترم“ ہاتھ پیچھے باندھے کھڑے رہے ہم نے جوں ہی ناکامی کا اعلان کیا انہوں نے ہماری ”نااہلی“ پر فرش پر لیٹ کر اعلان بغاوت فرما دیا، ہم نے بہت منایا، منتیں کیں، مارکیٹ لے جانے کا جھانسہ دیا، بالٹی کی ”معذوری“ کی تکنیکی وجوہات بیان کیں، اس نیک کام کے لیے دوسری بالٹی کی پیشکش کی لیکن اگر بچہ مان جاتا تو بچہ تو نہ ہوتا، لہٰذا ہم مجبوراً بچے کے سونے تک باری باری بالٹی بھرنے کی کوشش کرتے رہے۔

حکومت نے ”چارج“ سنبھالتے ہی تین قومی بینکوں (نیشنل بینک، یونائیٹڈ بینک اور حبیب بینک) میں اپنے صدر تعینات کر دیے، ان میں سے ایک بینک کے صدر، سپیکر قومی اسمبلی الٰہی بخش سومرو کے صاحبزادے زبیر سومرو ہیں، دوسرے بینک کے سربراہ انہیں کے عزیز میاں محمد سومرو ہیں جبکہ تیسرے بینک کے صدر سٹی بینک کے ایریا منیجر اور وزارت خزانہ کے خواہش مند شوکت ترین ہیں، ان تینوں صدور نے، جو ۱۲ سے ۱۴ لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں، عنان اقتدار سنبھالتے ہی بینکنگ سسٹم میں ”آئین ساز“ تبدیلیوں کا آغاز کر دیا، ایک صاحب نے حکومت کی ایما پر ۱۸ ایڈوائزر ”ملازم“ رکھ لئے، دوسرے نے پانچ ہزار ملازمین

فارغ کر کے ان کی جگہ ۲۴۰ ''ایڈوائزر'' بھرتی کر لیے جب یہ خبر تیسرے صدر تک پہنچی تو انہوں نے سوچا میں کیوں پیچھے رہوں لہٰذا انہوں نے بھی فوراً ۳۹ ایڈوائزروں کا بندوبست کر لیا، یوں اوپر تلے قومی بینکوں میں ۲۹۷ ایڈوائزر بھرتی کر لیے گئے۔

جب ان ۲۹۷ ایڈوائزروں کی تنخواہیں طے کرنے کا وقت آیا تو ان کی کم سے کم تنخواہ تین لاکھ روپے ماہانہ طے ہوئی جبکہ انہیں تین سال کے لیے کرائے پر رہائش گاہیں اور ایک ایک زیرو میٹر گاڑی بھی فراہم کر دی گئی یوں ۱۸ ایڈوائزروں والے بینک پر ۵۴ لاکھ روپے ماہانہ کا بوجھ پڑنا شروع ہو گیا، ۲۴۰ ایڈوائزروں والا بینک ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے ماہانہ ادا کرنے لگا اور ۳۹ ایڈوائزروں والے بینک نے ایک کروڑ ۱۷ لاکھ روپے ماہانہ کی اضافی ادائیگی شروع کر دی۔ یوں پاکستان کے مالیاتی ذخائر پر ۸ کروڑ ۹۱ لاکھ روپے ماہانہ کا ڈاکہ پڑنے لگا، جبکہ ان لوگوں کو تین سال کے لیے ۴۴ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے بطور ہاؤس رینٹ (فی ایڈوائزر تقریباً ۱۵ لاکھ روپے) اور گاڑیوں کی خریداری کے لیے بطور ایڈوانس ۲۳ کروڑ ۷۶ لاکھ روپے ادا کیے گئے اوسطاً ۸ لاکھ روپے فی ایڈوائزر)

ان تقرریوں کے دوران خصوصی طور پر خیال رکھا گیا کہ ان ۲۹۷ ایڈوائزروں میں ایک بھی ایسا شخص نہ آنے پائے جو کسی برانچ کا منیجر رہا ہو جو اس سارے بینکنگ سسٹم کے بارے میں بنیادی علم رکھتا ہو، جس نے اکاؤنٹ کھولنے، قرضہ دینے اور وصولیاں کرنے کا کام سیکھا ہو، جو لین اور بلین کا فرق جانتا ہو، جو چیک کاٹ سکتا ہو یا جسے بیلنس شیٹ کی تمیز ہو، اس کھیل کا ایک اور انداز دیکھئے کہ ایک بینک کے صدر نے ایک ایسے ۳۲ سالہ نوجوان کو اسلام آباد کا ریجنل چیف بنا دیا جس کا بینکاری کا تجربہ ہی چند سال سے زیادہ نہیں۔

یہ ایڈوائزر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ اور سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے پچھلے ایک برس سے تین سے ساڑھے تین لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ پا رہے ہیں لیکن بینک کا وہ سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ جو چالیس برس کی جہد مسلسل کے بعد اس عہدے تک پہنچتا ہے صرف ۵۰ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ لیتا ہے تو اس ظلم پر جہاں اصلی ای وی پی حضرات دل برداشتہ ہو چکے ہیں وہاں انہوں نے کام بھی تقریباً بند کر دیا ہے۔

انہیں ایڈوائزروں میں سے ایک صاحب میرے جاننے والے ہیں، ہفتے میں ایک آدھ بار ان سے ملاقات ہو جاتی ہے، ایک روز جب ہم اپنے ایک مشترکہ دوست کے جنازے سے واپس آ رہے تھے تو آبپارہ چوک کراس کرتے ہوئے ان کا ایمان زندہ ہو گیا اور وہ گلوگیر لہجے میں بولے'' جاوید میں کبھی کبھی سوچتا ہوں، یہ حرام خوری کہیں نہ کہیں تو نوٹ کی جاتی ہو گی، کبھی نہ کبھی تو اس کا حساب ہو گا، کسی نہ کسی جگہ تو ہمارا احتساب ہو گا۔'' میں نے دوستی کے احترام میں خاموشی ہی میں عافیت جانی، مگر وہ میرے ردعمل پر غور کیے بغیر خود کلامی کے انداز میں مسلسل بولتے گئے'' قوموں کو غربت نہیں حرام خوری مارتی ہے، ڈی ویلویشن نہیں، احتساب میں ڈنڈی برباد کیا کرتی ہے۔'' میں نے انہیں اداسی کی اس رو سے نکالنے کے لیے پوچھا'' آپ لوگ کرتے کیا ہیں؟''

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور زہریلے انداز میں ہنس کر بولے "بتایا نہیں حرام خوری، تنخواہیں بے شمار، کام کچھ بھی نہیں" گاڑی شاہراہ دستور پر داخل ہو رہی تھی انہوں نے فارن آفس پر ایک نظر ڈالی اور بہت ہی دکھی لہجے میں بولے "بینک میں کام کرنے والے چپڑاسی پر تو کوئی نہ کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسے تو کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا پڑتا ہے لیکن ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں، ہماری کوئی اے سی آر نہیں ہم نے کچھ کر کے نہیں دکھانا۔"

"پھر بھی آپ کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی ہوں گے۔" میں نے نہایت بچگانہ سوال کیا "ہاں کرتے ہیں" ان کے لہجے میں گہری سیاہ رات کا درد تھا۔ "میٹنگ کرتے ہیں، جس میں ایک دوسرے کو اپنے اپنے خاندانی پس منظر، حکومت میں اپنے اثر و رسوخ، بین الاقوامی ایجنسیوں سے اپنے رابطوں اور اپنے غیر ملکی دوروں کی روداد سناتے ہیں، اپنی اپنی پہنچ کا مقابلہ کرتے ہیں، وزیر اعظم سے اپنی بے تکلفی اور صدر سے اپنے خاندانی مراسم کی کہانیاں بیان کرتے ہیں اور واپس گھر آ جاتے ہیں۔"

میں پچھلے چند روز سے سوچ رہا ہوں اگر حکومت یہ ۸ کروڑ ۹۱ لاکھ روپے ماہانہ (ایک ارب ۸ کروڑ سالانہ) اور ۶۸ کروڑ ۳۱ لاکھ (ہاؤس رینٹ اور کار ایڈوانس) بچا لیتی تو کیا جناب حفیظ پاشا کو "بجٹ خسارہ" پورا کرنے کے لیے پٹرول کی قیمتوں میں ۲۵ فیصد اضافہ کرنا پڑتا؟ حکمرانوں کے خلاف ہائے ہائے کے نعرے لگتے، پتلے جلائے جاتے، ۴۰ چیز وزیر نفرت سے تھوکا جاتا، ٹالبوٹ کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا جاتا تو ایک ہی جواب آتا ہے، بے وقوف یہ کار سرکار ہے اگر تمہیں اس کا ادراک ہوتا تو تم بھی ساڑھے تین لاکھ روپے ماہانہ پانے والے ایڈوائزر نہ ہوتے۔"

ہاں محترم قارئین مجھے اس حکومت اور اپنے ضدی اور ہٹ دھرم بیٹے کی خواہش میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، میں اپنے وزیر اعظم، کابینہ کے ارکان اور سارے اکنامک منیجروں کو پشت پر ہاتھ باندھے کھڑا دیکھ رہا ہوں جبکہ اس ملک کے ۹۰ فیصد بے بس، مجبور اور محروم لوگ مسلسل ایسی بالٹیاں بھرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن کے پیندے ہی نہیں۔

مردہ فروشوں کی منڈی

ٹھیک اسی لمحے جب وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف شیخ حسینہ واجد کے ساتھ ڈھاکہ کے نواح ''ساوار'' میں مکتی باہنی کے ''شہداء'' کی یادگار پر پھول چڑھا رہے تھے تو ادھر شہید مینار کا ایک ''مقتول'' پنجابی دوسری پنجابی لاش سے پوچھ رہا تھا، ''تمہیں یاد ہے ہمیں ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو کیسے قتل کیا گیا تھا؟'' دوسری لاش نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور بڑے کرب سے بولی: ''ہاں ہمیں گھروں سے نکالا گیا، اس چوک میں جمع کیا گیا، یہاں سٹیج بنایا گیا، تماشائی جمع ہوئے، تالیاں بجائی گئیں اور پھر ہم میں سے ذرا تگڑے جوانوں کو الگ کر کے سٹیج پر بلایا گیا۔ مکتی باہنی کے بریگیڈیئر عبدالقادر صدیقی نے رومال لہرایا اور پھر ان لوگوں نے ہمیں ٹھڈوں، مکوں اور لاتوں سے مارنا شروع کر دیا۔ جب ہم ادھ موئے ہو کر گر پڑے تو ان ''شہیدوں'' نے سنگینوں سے ہمارے پیٹ چاک کیے، ہماری ایک ایک آنت باہر نکالی، ہمارے دل، ہمارے پھیپھڑوں اور ہمارے گردوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور پھر انہیں جوڑ کر ''جے بنگلہ'' لکھا۔''

ٹھیک اسی لمحے جب میاں نواز شریف اللہ تعالیٰ سے مکتی باہنی کے ''شہیدوں'' کے درجات بلند کرنے کی دعا مانگ رہے تھے تو ادھر محمد پور، گلشن کالونی اور نیو مارکیٹ کے غیر بنگالیوں کی لاشیں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں ''تمہیں یاد ہے ہمیں کیسے قتل کیا گیا تھا؟'' پانچ برس کا ایک بچہ اٹھا اور بولا: ''ہاں یہ ''شہید'' جے بنگلہ کے نعرے لگاتے ہوئے ہمارے گھر داخل ہوئے، میری ماں کو جیپ میں ڈال کر لے گئے، میرے باپ کو گولی مار دی اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر میری نس میں سرنج اڑس کر چلے گئے، یوں میں اپنے ہی لہو میں ڈوب کر مر گیا۔'' دوسرے بچے نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور قہقہہ لگا کر بولا: ''مجھے تو شہیدوں نے بڑے ہی انوکھے انداز سے قتل کیا۔ انہوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا، میرا سر دروازے کے چوبی فریم کے ساتھ لگایا اور پھر میرے ماتھے پر کیل ٹھونک دی...... اور میری لاش ایک ہفتے تک اسی دروازے سے لٹکتی رہی۔''

ٹھیک اسی لمحے جب میاں نواز شریف مکتی باہنی کے ''شہیدوں'' کے احترام میں سر جھکائے کھڑے تھے تو ادھر عظیم پور، دھان منڈی اور فیل خانہ کے سندھی ''مقتول'' ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے ''تمہیں پتا ہے ہم کیسے مارے گئے تھے؟'' پاک فوج کے ایک جوان کی لاش نے آنکھ کھولی اور چلا کر بولی: ''ہاں میں راشن

لینے آیا تھا ''شہیدوں'' نے مجھے جیپ سے اتارا، سر بازار میرے کپڑے اتارے اور پھر بلیڈوں سے میرے اعضاء کو گوشت کا لوتھڑا بنا دیا۔'' دوسرا سپاہی اٹھا اور بولا: ''ان ''شہیدوں'' نے مجھے پکڑا اور ننگا کر کے کہا پاکستان کو ماں کی گالی دو، میں نے انکار کر دیا تو ان لوگوں نے چھریوں سے میرا انگ انگ الگ کر دیا۔'' تیسرے سپاہی نے سر اٹھایا اور لاشوں کو مخاطب کر کے بولا: ''مجھے میرے مرے ہوئے بھائی کا خون چاٹنے کا حکم دیا گیا، میں نے انکار کر دیا تو ''شہیدوں'' نے میری کٹی ہوئی انگلی میرے منہ میں ڈال کر کہا ''پھر اپنا ہی لہو پیو'' چوتھے سپاہی نے چیخ ماری اور چلا کر کہا ''شہیدوں'' نے میرے اوپر پٹرول چھڑک کر کہا ''لو پھر سگریٹ ہی پیو اور میں عین بیچ بازار میں جل کر کوئلہ ہو گیا۔'' پانچویں ''مقتول'' نے بڑی حسرت سے آنکھیں کھولیں اور بڑے ہی دکھی انداز میں بولا: ''شہیدوں'' نے مجھے الٹا لٹکا کر میرے سر میں کیل ٹھونک دی۔''

ٹھیک اسی لمحے جب نواز شریف مکتی باہنی کے ''شہیدوں'' کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے، ادھر میر پور کی مقتول عورتیں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں ''تمہیں یاد ہے ہمیں کس طرح سسکا سسکا کر مارا گیا تھا؟'' ایک نے سر اٹھایا اور غصے سے بولی ''میں ایک رات میں تیس درندوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکی تھی۔'' دوسری نے چلا کر کہا: ''شہیدوں'' نے چاقو سے میرا پیٹ چاک کر کے بچہ باہر نکال لیا تھا۔'' تیسری نے دکھ سے کہا: ''شہیدوں'' نے میرا منہ کھول کر تیزاب کی پوری بوتل حلق میں انڈیل دی تھی۔'' چوتھی نے سرگوشی میں کہا: ''شہیدوں'' نے مجھے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر مار دیا تھا۔'' پانچویں چیخی: ''شہیدوں'' نے میری چھاتیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دی تھیں۔'' چھٹی بولی ''شہیدوں'' نے میرے جوان بیٹے سے کہا اپنی ماں کے ساتھ...... تو میں نے دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی۔''

ٹھیک اسی لمحے جب نواز شریف مکتی باہنی کے ''شہیدوں'' کے ترانے پڑھ رہے تھے تو ادھر گوپال گنج کے قحبہ خانوں کی زندہ لاشوں نے ایک دوسرے سے پوچھا: ''تمہیں یاد ہے ہم لوگوں نے پاکستان جانے سے انکار کیوں کیا تھا'' پہلی بولی: ''ہاں میں ''شہیدوں'' کے بچے کی ماں بن چکی تھی۔'' دوسری بولی: ''ہاں میں اگر چونیاں چلی جاتی تو میرے لاجوں والے بھائی خودکشی کر لیتے۔'' تیسری نے کہا: ''ہاں اگر میں ٹوبہ ٹیک سنگھ چلی جاتی تو میرا زندہ بچ نکلنے والا باپ کہاں جاتا؟'' چوتھی نے سرگوشی میں کہا: ''میں تیزاب سے جلا چہرہ لے کر ادھر کیوں جاتی؟'' پانچویں نے کہا: ''اس لیے کہ میں نے ''شہیدوں'' کے مقابلے کے لیے ''شہید'' پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔''

ہاں ٹھیک اسی لمحے جب نواز شریف مکتی باہنی کے ''شہیدوں'' کو آزادی کے قائد قرار دے رہے تھے تو ادھر امپرومنٹ ٹرسٹ کی بلڈنگ کے گرد بکھری لاشیں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں ''تمہیں یاد ہے ہمیں کس شان سے دفن کیا گیا تھا؟'' پہلی بولی ''مجھے گھسیٹ کر میونسپلٹی کے ٹرک میں لاد دیا گیا۔'' دوسری بولی: ''کچرا گھروں میں گڑھے کھودے گئے۔'' تیسری بولی: ''ہم سب کو ان گڑھوں میں ڈال دیا گیا۔'' چوتھی بولی:

''ان گڑھوں کو مٹی سے بھر کر پلستر کر دیا گیا۔'' پانچویں بولی: ''ان پر پھر کچرے گھر بنا دیئے گئے۔''

ہاں ٹھیک اسی لمحے جب نواز شریف مکتی باہنی کے ''شہیدوں'' کی یادگار پر لاہور کے تاجروں کے لیے نئی تاریخ لکھ رہے تھے تو ادھر جیسور، ہنجالی، دیناج پور، میمن سنگھ، سلہٹ، لکشم، زسنگدی اور منگا نیل کے ہزاروں ''مقتول'' ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے ''اگر یہی لوگ ''شہید'' تھے تو پھر ہم لوگ سبز ہلالی پرچم کو آگ سے بچاتے بچاتے گولی کا نشانہ کیوں بن گئے، جیپوں کے پیچھے گھسٹتے ہوئے پاکستان زندہ باد کے نعرے کیوں لگاتے رہے، اپنے لہو میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر ''پاکستان زندہ باد'' کیوں لکھتے رہے، ہم بازاروں، گلیوں اور کوچوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کیوں جان دیتے رہے۔ اپنی زبانوں سے بھارتی فوجیوں کے بوٹ کیوں چاٹتے رہے۔ ہاں لاشیں پوچھتی ہیں ''اگر مکتی باہنی کے غنڈے ہی ''شہید'' تھے تو ہم نے کس ملک کی حفاظت کے لیے جانیں دیں، کس ملک کے لیے دلدلوں، جنگلوں اور کھائیوں میں مارے جاتے رہے۔''

ہاں اس ۱۳ کروڑ لوگوں کے زندہ ملک میں کوئی ایک بھی شخص ایسا نہیں، جو ان لاشوں کی آواز سن سکے، اس ملک کے حکمرانوں سے پوچھ سکے، اگر پاکستان نے بھی مکتی باہنی کے درندوں ہی کو ''شہید'' تسلیم کرنا تھا تو پھر دلدلوں، کچرا گھروں اور جنگلوں میں دفن وہ ہزاروں لاشیں کن لوگوں کی ہیں؟ کیا یہ لاشیں ۲۶ برس تک کسی ایسے ہی پاکستانی وزیراعظم کی منتظر تھیں، جو دھاکہ آئے اور آدھے گھنٹے میں تاریخ کا سارا دھارا ہی بدل دے۔ شہیدوں کو مقتول بنا دے اور مقتولوں کو شہید۔

لیکن شاید نہیں یہ لاشیں کوئی سوال نہیں کر رہیں، کسی سے کچھ نہیں پوچھ رہیں کیونکہ یہ جانتی ہیں جو قوم آلو پیاز اور پان کے پتوں کے عوض اپنا سب کچھ بیچ سکتی ہے وہ شہیدوں کی آواز کہاں سنتی ہے۔ وہ قوم، قوم کہاں ہوتی ہے، وہ تو مردہ فرشوں کی منڈی ہوتی ہے۔

زندہ عدالتوں سے ایک مردہ سوال

تقسیم ہند کے وقت جب لاکھوں خاندان واہگہ بارڈر سے ہوتے ہوئے والٹن پہنچے تو جالندھر کا یہ غریب خاندان بھی ہجرت کے ریلے میں بہتا ہوا پاکستان پہنچ گیا۔ یہ سارا علاقہ ان کے لیے اجنبی تھا، لہٰذا سامنے کوئی منزل، کوئی ٹھکانا نہیں تھا، بس جدھر زیادہ لوگ جاتے ہوئے دیکھے، یہ لوگ بھی ادھر ہی کو ہو لیے۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے تھے اور نہ کھانے پکانے کے لیے برتن، رہا روپیہ پیسہ اور سونا چاندی تو اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایک تو یہ لوگ جالندھر سے افراتفری میں نکلے تھے، دوسرا وہاں ان کے گھر میں تھا ہی کیا جو ساتھ لاتے۔ خاندان بھر پر مذہب کا گہرا غلبہ تھا چنانچہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے کا سوچنا تک گناہ تھا، سو اگر دوسرے مہاجروں کے ساتھ کیمپ سے کھانے کے لیے کچھ مل گیا تو بسم اللہ ورنہ شکر الحمدللہ کا ورد کرتے کرتے رات گزار دی۔

ایک روز جب والٹن کیمپ سے اندرون ملک کے لیے قافلہ روانہ ہونے لگا تو اس خاندان کے بزرگ نے یونہی چلتے چلتے اہل قافلہ سے منزل پوچھ لی۔ بتانے والے نے بتایا ''پشاور'' تو بزرگ نے فوراً ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب سامان تھا ہی کتنا، بس سب نے اُٹھ کے چپل پہنے اور جا کر قافلے میں شامل ہو گئے۔ وہاں سے لاہور ریلوے سٹیشن آئے۔ جیسے تیسے ٹرین میں سوار ہوئے اور پھر راوی، چناب اور جہلم کی زمین پیچھے چھوڑتے ہوئے پشاور جا پہنچے، جہاں دوسرے مہاجروں کے ساتھ انہیں بھی ایک مکان الاٹ ہو گیا۔

فوارہ چوک کا یہ کشادہ وسیع اور ہوادار مکان کسی ہندو تاجر کا تھا جو اسے نقل مکانی کے دوران چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔ بزرگ نے گھر کا قبضہ لیتے ہی اپنے بیٹے، جو انڈین آرمی (قیام پاکستان کے بعد پاکستان آرمی) میں کیپٹن تھا کو خط لکھ کر باحفاظت پاکستان پہنچنے اور مکان حاصل کرنے کی اطلاع دے دی۔ اس خط کے جواب میں اگلے چند روز میں ان کا شریف النفس، دھیما اور مہذب بیٹا پشاور آ گیا۔ اپنے تمام بہن بھائیوں کو زندہ سلامت دیکھ کر نومولود پاک آرمی کے کیپٹن کے جو جذبات تھے، اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جو ان کربناک حالات سے دوچار ہوا ہو۔

چند دن کی چھٹیاں گزار کر کیپٹن واپس یونٹ چلا گیا تو بزرگ نے گھر چلانے کے لیے کسی ''حیلے'' کی

تلاش شروع کر دی جو ظاہر ہے الٹ پلٹ، افراتفری اور بے چینی کے اس دور میں ناممکن تھا چنانچہ چند ماہ کی اس ناکام کوشش کے بعد جب بزرگ نے کیپٹن کو خط لکھا تو سارے حالات کھول کر بیان کر دیئے۔ چند روز بعد کیپٹن نے جواباً خط میں یہ تجویز پیش کی کہ گھر خاندان کی ضرورت سے کہیں بڑا ہے لہٰذا اگر اس کے دو حصے کر کے ایک ''پورشن'' کرائے پر چڑھا دیا جائے تو نہ صرف آمدنی کا معقول بندوبست ہو جائے گا بلکہ اتنے بڑے گھر کی ''نگہداشت'' سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ بیٹے کی تجویز بزرگ کے دل کو لگی، لہٰذا انہوں نے اگلے ہی روز ایک معقول کرایہ دار کا انتظام کر کے آدھا گھر کرائے پر چڑھا دیا۔

یہ معاملہ چند ماہ تک بخیر و خوبی چلتا رہا لیکن ۴۸ء شروع ہوتے ہی کرائے دار نے یہ کہہ کر کرایہ دینے سے انکار کر دیا کہ یہ مکان تو ہے ہی میرا۔ جب بزرگ نے اس ڈھٹائی پر احتجاج کیا تو کرایہ دار نے حکومت کی مجاز اتھارٹیز کے دستخطوں والے چند ایسے کاغذات پیش کر دیئے جن کی رو سے نہ صرف مکان کا یہ پورشن اس کی ملکیت تھا بلکہ وہ حصہ جس میں یہ لوگ اقامت پذیر تھے، بھی اس کا تھا۔ بزرگ اس جعل سازی پر ہکا بکا رہ گئے لیکن خاندانی شرافت کے باعث مخاطب سے الجھنا گوارا نہ کیا تاہم انہوں نے یہ سب اپنے کیپٹن بیٹے کو لکھ بھیجا جو خط ملتے ہی پشاور آ گیا۔ سارا معاملہ سنا ''کرایہ دار'' سے ملا، معاملہ گفتگو کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ''کرایہ دار'' نہ مانا تو اس نے قانونی راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور یوں وہ اسی روز اپنے قریبی دوست کیپٹن فضل کو ساتھ لے کر سول کورٹ میں پیش ہو گیا۔

درخواست لکھی گئی، وکیل کیا گیا اور دعویٰ دائر کر دیا گیا۔ عدالت نے کیس وصول کر لیا، کارروائی شروع ہو گئی۔ دو تین دن کے اس عمل کے بعد کیپٹن مطمئن ہو کر واپس یونٹ چلا گیا، ایک ماہ بعد اس نے گھر خط لکھ کر والد سے مقدمے کے بارے میں پوچھا تو اسے یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ابھی تک عدالت نے ایک بھی پیشی نہیں دی، بہر حال کیا کیا جا سکتا تھا۔ تین ماہ بعد عدالت کی طرف سے پہلی پیشی کا حکم آیا۔ کیپٹن پشاور آیا اور والد کو ساتھ لے کر عدالت میں حاضر ہو گیا۔ جج صاحب نے بزرگ کو ایک نظر دیکھا اور دو ماہ بعد کی تاریخ دے دی۔ باپ بیٹے نے حکم سنا تو گردن جھکا کر واپس آ گئے دو ماہ بعد جب دوبارہ حاضر ہوئے تو جج نے اپنا پرانا ''فیصلہ'' دہرا کر تین ماہ کی تاریخ دے دی۔ تین ماہ بعد نئی پیشی ڈال دی گئی۔ بہر حال قصہ مختصر دو تین برس بعد جب وہ کیپٹن میجر کے رینک پر پروموٹ ہوا تو کیس اسی عدالت میں اسی جگہ کھڑا تھا۔ میجر تھا بڑا مستقل مزاج لہٰذا بغیر گھبرائے، تھکے اور پریشان ہوئے ہر پیشی پر والد کو ساتھ لے کر عدالت میں حاضر ہو جاتا۔ جج جو آرڈر دیتا خاموشی سے سنتا اور اگلی پیشی پر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے واپس آ جاتا۔

برسوں بعد وہ میجر، لیفٹیننٹ کرنل ہوا تو اس کیس کی بھی پروموشن ہو گئی وہ سول جج کی عدالت سے نکل کر سیشن کورٹ میں چلا گیا۔ مظلوم کرنل بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ کچھ عرصے بعد وقت نے ایک اور کروٹ لی اور وہ کرنل بریگیڈیئر بن گیا لیکن کیس اسی طرح ادھر سے اُدھر اور ادھر سے اُدھر آتا جاتا رہا۔ پھر وہ

بریگیڈیئر اردن چلا گیا، کیس پیچھے انصاف کی منزلیں طے کرتا رہا۔ عرصے بعد وہ بریگیڈیئر واپس پاکستان آیا، میجر جنرل بنا تو کیس نے بھی سیشن کورٹ سے چھلانگ لگائی اور ہائیکورٹ پہنچ گیا۔ میجر جنرل بھی اس کے پیچھے عدالت کا چکر لگاتا رہا۔ حالات نے ایک اور پلٹا کھایا اور وہ میجر جنرل لیفٹیننٹ جنرل بن کر ملتان کا کور کمانڈر ہو گیا۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر آنے لگا۔ اعلیٰ تقریبات میں شریک ہونے لگا لیکن کیس بدستور ہائیکورٹ کی سرد فائلوں میں دبا رہا۔ پھر کرنی خدا کی یہ ہوئی کہ وہ جنرل آرمی چیف بن گیا، تو کیس نے بھی ترقی کی ایک اور زقند بھری اور سپریم کورٹ میں آ گرا۔

ابھی وکلاء کی جرح جاری تھی۔ جج مسلسل تاریخیں دے رہا تھا اور ریڈر آرڈر لکھ اور منسوخ کر رہا تھا کہ وہ آرمی چیف ایک رات کی تھکا دینے والی کارروائی کے بعد اس ملک کا بلاشرکت غیرے سربراہ بن گیا۔ سارا آئین منسوخ، سارا قانون معطل، اسمبلی ختم، وزیراعظم ہاؤس خالی، سارے سیاستدان اندر ہو گئے اور پاکستان کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہو گیا لیکن فیصلہ ابھی تک عدالت کے حکم سے بہت دور تھا۔ جی ہاں اپنے مکان کے لیے سول جج کے سامنے پیش ہونے والا یہ کپتان اور ذوالفقار علی بھٹو کو جگا کر ''یو آر انڈر اریسٹ'' کا حکم دینے والا یہ جنرل صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق ہی تھا۔

ابھی ''نوے'' دن میں الیکشن کراؤں گا کی تقریر کے سارے زخم ہرے تھے کہ ایک روز چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اردلی نے انہیں آ کر بتایا کہ ایک صاحب پشاور سے آپ سے ملنے آئے ہیں۔ مسلسل دو دن سے باہر بیٹھے ہیں، بہت ٹالا لیکن ملے بغیر ٹلنے کے لیے تیار نہیں۔ جنرل صاحب نے ملاقات کی اجازت دے دی تو کمرے میں ایک رعشہ زدہ بوڑھا اس انداز سے داخل ہوا کہ اس کے ایک ہاتھ میں مکان کی چابی اور دوسرے میں قرآن مجید تھا، اس نے جونہی جنرل ضیا کو دیکھا وہیں کھڑا ہو کر بھیگی آواز میں چلایا ''سر اس کتاب کے تقدس کے واسطے مجھے معاف کر دیں، میں آپ کو مکان کی چابی پیش کرنے آیا ہوں۔''

جی ہاں وہ بوڑھا کیپٹن ضیاء الحق کے مکان کا کرایہ دار ہی تھا۔

اور آج جب میں نے اخبار میں سیالکوٹ کے ایڈیشنل جج سے چوری کی کار کی برآمدی اور سپریم کورٹ کے ججوں کے ''سیاسی اختلافات'' کی خبریں اوپر نیچے چھپی دیکھیں تو بے اختیار مجھے پاکستان کے قانون کے اس ''فیصلے'' کے ساتھ ساتھ وہ بوڑھا قبائلی سردار بھی یاد آ گیا جس سے جب میں نے پوچھا تھا، ''بابا تم اَن پڑھ ہونے کے باوجود درست فیصلے کیسے کر لیتے ہو؟'' تو اس نے منہ سے حقے کی نلی الگ کر کے کہا تھا ''بچے انصاف کتابیں نہیں ضمیر کرتے ہیں، ہم لوگوں کا ضمیر ابھی زندہ ہے لہٰذا ہمارے انصاف میں تاخیر ہے اور نہ ہی بے ایمانی اور تم لوگوں نے منصفوں کی کرسیوں پر ضمیر کی جگہ کتابیں بٹھا دی ہیں لہٰذا تمہارے فیصلے درست اور بروقت کیسے ہو سکتے ہیں؟''

محترم قارئین آپ سے ایک سوال ہے کیا وہ معاشرے زندہ ہوتے ہیں جن کی عدالتیں زخم مندمل

ہونے سے پہلے مظلوم کو انصاف فراہم نہ کر سکیں؟

اس ملک کی زندہ عدالتوں کے تمام زندہ ججوں میں کوئی ایک شخص ایسا ہے جو میرے اس سوال کا جواب دے سکے۔

عدالتیں یا بادبانی کشتیاں

۳ فروری ۱۹۹۸ء کی صبح پونے چھ بجے جب آدھی سے زیادہ دنیا گرم بستروں میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ ٹیکساس کی ایک جیل میں ۳۸ سالہ ''کارلا فے ٹکر'' کو زہریلا انجکشن لگا کر سزائے موت دے دی گئی۔ ٹکر نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا، ڈیتھ بیڈ پر کسی ٹانگیں ڈھیلی چھوڑیں، سینے پر پھونک ماری اور آنکھیں بند کر کے جان، جان آفریں کے حوالے کر دی۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کی نبض ٹٹولی، سٹیتھو سکوپ سے سینے میں بچی کھچی آوازیں سننے کی کوشش کی اور پھر تھکتے ہوئے نمناک لہجے میں اس کی موت کا اعلان کر کے کہا ''میں نے زندگی میں آج تک اتنی مطمئن موت نہیں دیکھی۔''

کارلا فے ٹکر کی ماں طوائف تھی، جب وہ پیدا ہوئی تو ولدیت کے خانے میں اس کی ماں ہی کا نام لکھا گیا۔ ماں کی گوناگوں ''مصروفیات'' کے باعث ٹکر کی تربیت کا مناسب بندوبست نہ ہو سکا، لہٰذا گندے ماحول اور عدم توجہ کے باعث اس نے ۸ برس کی عمر میں سگریٹ نوشی شروع کر دی۔ ۲ برس بعد جب وہ بمشکل دس برس کی تھی اس نے چرس پینا شروع کر دی۔ ۱۳ برس کی عمر میں جب وہ ابھی جوانی کے دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دے رہی تھی تو اس کی ماں اسے پہلی بار ''ساتھ'' لے کر ''باہر'' نکلی جس کے بعد وہ مسلسل گیارہ برس تک گھر سے نکلتی رہی، کبھی شراب کی ایک بوتل کے عوض، کبھی چرس سے بھرے دو سگریٹوں کے لالچ میں، کبھی چند ڈالروں کی ہوس میں، کبھی ایک ڈبل روٹی، جیم اور انڈوں کے بدلے اپنا بدن گروی رکھتی رہی، ان گیارہ برسوں میں اس نے اذیت کے کتنے دریا پار کیے، گناہ کی کتنی گھاٹیوں میں اتری اور ذلت کے کتنے صحراؤں میں ننگے پاؤں چلتی رہی، اسے کچھ خبر نہ تھی۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ وہ ایک کرنسی نوٹ بن چکی ہے جو کبھی اس دکان پر کیش ہو گیا، کبھی اس تجوری میں بند ہو گیا، کبھی اس نے مٹھی میں دبا لیا، کبھی اس کے پرس میں جا گرا، کبھی اس نے ریزہ ریزہ کر کے پھینک دیا، کبھی اس نے پرزہ پرزہ جوڑ کر دوبارہ بازار میں بیچ دیا۔

اور پھر ۱۹۸۳ء کی وہ رات آ گئی جب اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ مل کر ایک جوڑے سے موٹر سائیکل چھیننے کی کوشش کی، مزاحمت ہوئی تو دونوں طیش میں آ گئے اور انہوں نے کینچیوں سے جوڑے کے سینے چھلنی کر دیئے اور فرار ہو گئے لیکن پولیس نے چند ہی ہفتوں میں انہیں آ لیا۔ مقدمہ چلا اور ٹیکساس کی عدالت

نے دونوں کو سزائے موت سنا دی، جس کے بعد اپیلوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی دوران اس کا بوائے فرینڈ بیمار ہو کر جیل میں انتقال کر گیا جس کے بعد وہ تنہا رہ گئی۔

جیل حکام کو اس حادثے کا کوئی علم نہیں، جس نے اس کی زندگی کا سارا رخ ہی بدل دیا لیکن انہوں نے اس کی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا غور سے مشاہدہ کیا، وہ لڑکی جو بات بات پر جیل انتظامیہ کو ننگی گالیاں دیا کرتی تھی وہ اچانک اپنا زیادہ تر وقت بائبل کے مطالعے میں گزارنے لگی، وہ نشئی عورت جو ہر وقت سگریٹ اور شراب کا مطالبہ کرتی رہتی تھی، اب زیادہ تر روزے سے رہنے لگی، نفسیاتی سطح پر بیمار خاتون اب اللہ اور مسیح کے سوا کسی چیز کا نام نہیں لیتی تھی۔ یہ سلسلہ ایک سال تک چلتا رہا جس کے بعد اس کا نیا جنم ہوا۔ وہ ایک طوائف زادی اور قاتلہ کی جگہ مبلغہ بن گئی، ایک ایسی مبلغہ جس کے ایک ایک لفظ میں تاثیر تھی، جس کی آنکھوں میں مریم کی پوترتا اور ہونٹوں پر شہد کے ذائقے تھے اور جس کے ہاتھ کے لمس میں شفا اور دعا میں قبولیت تھی۔

پھر اس نے جیل ہی میں شادی کر لی اور تبلیغ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ اپنا ایک ایک منٹ لوگوں کی روحانی تربیت کے لیے وقف کر دیا۔ عبادت و ریاضت اور ذکر و اذکار کو اپنا معمول بنا لیا، اس کی اس تبدیلی نے پوری جیل پر حیرت انگیز اثر چھوڑا اور وہ لوگ، جنہیں قانون نے مجرم کا خطاب دے کر معاشرے کے لیے ضرر رساں قرار دے دیا تھا، اس کی انگلی پکڑ کر نیکی، پارسائی اور عبادت کے راستوں پر چلنے لگے، وہ جرائم پیشہ لوگ جن کے لہجے درشتگی، اکھڑپن اور گالی کے سوا کسی ذائقے سے واقف نہیں تھے اب دھیمے، رواں اور میٹھے بول بولنے لگے، وہ بدمعاش، جیب تراش اور ڈاکو، جو جرم کے نت نئے انداز سیکھنے کے لیے جیل آتے تھے اب معاشرے کے لیے امن، آشتی اور محبت کا پیغام لے کر جانے لگے۔

اس کی بدلی ہوئی شخصیت کی مہک جب باہر پہنچی تو اخبارات کے رپورٹر جیل پر ٹوٹ پڑے، اس کی سینکڑوں تصاویر بنائی گئیں، انٹرویوز ہوئے، جو اخبارات میں رسائل و جرائد میں "کور اسٹوریز" کی شکل میں شائع ہوئے جس سے امریکہ کی معاشرتی زندگی میں بھونچال آ گیا۔ ہر شخص نے اس کی فوٹو اٹھائی اور حکومت سے اس کی سزا معاف کرنے کا مطالبہ کرنے لگا، حقوق انسانی کی تنظیمیں آگے بڑھیں اور امریکہ میں "ٹکر کو بچاؤ" کی تحریکیں شروع ہو گئیں۔ اپیلیں کی گئیں، درخواستیں دی گئیں، احتجاج کی دھمکیاں دی گئیں لیکن قانون کے بہرے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، یہاں تک کہ پوپ جان پال نے بھی زندگی میں پہلی بار عدالت میں کسی قاتلہ کی سزا معاف کرنے کی درخواست کر دی لیکن نتیجہ وہی انکار۔

سزائے موت سے پندرہ روز قبل جب لیری کنگ جیل میں ٹکر کا انٹرویو کرنے گیا تو دنیا نے سی این این پر ایک نکھرا، مطمئن اور مسرور چہرہ دیکھا جو پورے اطمینان سے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔ لیری نے پوچھا: "تمہیں موت کا خوف محسوس نہیں ہوتا۔" ٹکر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی چمکتی عمیق نظریں کیمرے پر گاڑ کر بولی: "نہیں! اب مجھے صرف اور صرف موت کا انتظار ہے، میں جلد اپنے رب سے ملنا چاہتی

ہوں، اپنی کھلی آنکھوں سے اس ہستی کا دیدار کرنا چاہتی ہوں جس نے میری ساری شخصیت ہی بدل دی۔''

انٹرویو نشر ہونے کے دوسرے روز پورے امریکہ نے کہا: ''نہیں یہ وہ ٹکر نہیں جس نے گینتی سے دو معصوم شہریوں کے سینے چھلنی کیے تھے، یہ تو ایک ایسا فرشتہ ہے، جو صدیوں بعد پیدا ہوتا ہے اور فرشتوں کو سزائے موت دینا انصاف نہیں ظلم ہے۔'' رحم کی اپیل ''ٹیکساس بورڈ آف پارڈن اینڈ پیرول'' کے سامنے پیش ہوئی۔ ۱۸ رکنی بورڈ نے کیس سننے کی تاریخ دی تو دو ممبروں نے چھٹی کی درخواست دیدی جبکہ باقی ۱۶ ممبران نے سزا معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ بورڈ کا فیصلہ سن کر عوام سڑکوں پر آ گئے اور ٹکر کی درخواست لے کر ٹیکساس کے گورنر جارج بش کے پاس پہنچ گئے۔ امریکہ کے معتبر ترین پادری جیسی جیکسن نے بھی ٹکر کی حمایت کر دی۔ گورنر نے درخواست سنی، جیسی جیکسن اور ہجوم سے اظہار ہمدردی کیا، لیکن آخر میں یہ کہہ کر معذرت کر لی: ''مجھے قانون پر عملدر آمد کرانے کے لیے گورنر بنایا گیا ہے، مجرموں کو معاف کرنے کے لیے نہیں، اگر یہ جرم اصلی فرشتے سے بھی سرزد ہوتا تو میں اسے کبھی معاف نہ کرتا۔''

موت سے دو روز قبل جب ٹکر کی رحم کی اپیل سپریم کورٹ پہنچی تو چیف جسٹس نے یہ فقرے لکھ کر درخواست واپس کر دی: ''اگر آج پوری دنیا کہے یہ عورت کارلا فے ٹکر نہیں، ایک مقدس ہستی ہے تو بھی امریکن قانون میں اس کے لیے ریلیف نہیں کہ جس عورت نے قتل کرتے ہوئے دو بے گناہ شہریوں کو کوئی رعایت نہیں دی، اسے دنیا کا کوئی منصف رعایت نہیں دے سکتا، ہم خدا سے پہلے ان دو لاشوں کے سامنے جواب دہ ہیں، جنہیں اس عورت نے ناحق مار دیا۔''

۳ فروری کو جب سی این این سے کارلا فے ٹکر کی موت کی خبر نشر ہو رہی تھی تو میں نے اپنے ضمیر سے پوچھا، وہ کیا معجزہ ہے جو امریکہ جیسے سڑے ہوئے بیمار معاشرے کو زندہ رکھے ہوئے ہے تو میرے حافظے میں حضرت علیؓ کا یہ قول زریں چمکنے لگا: ''معاشرے کفر کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں لیکن ناانصافی کے ساتھ نہیں۔''

ہاں میں نے اپنے آپ سے کہا جو عدالتیں عوامی احتجاج سے متاثر ہو کر فیصلے بدل دیں، وہ عدالتیں نہیں بادبانی کشتیاں ہوتی ہیں، جن کی منزلوں کا تعین ملاح نہیں ہوائیں کیا کرتی ہیں۔

زمین چاٹ جائے گی

آپ ڈنمارک ہی کی مثال لیں۔

دنیا کی بہترین جیلیں ڈنمارک میں ہیں، کمرے ہوا دار، روشن اور کشادہ، کھڑکیوں پر پردے، دیواروں پر وال پیپر، فرش صاف ستھرے اور چمکتے، باتھ روم میں نہانے کے ٹب، کموڈ، گرم اور ٹھنڈے پانی کے کنکشن، خوشبو دار باتھ جل، شیمپو اور جھاگ دار صابن، ہر کمرے میں لکھنے کی میز، ٹیبل لیمپ، پوری جیل میں کئی ٹیلی ویژن، لائبریریاں، چھوٹے بڑے تمام اخبارات، رسائل اور تازہ کتابوں کے ڈھیر، ان ڈور گیمز کے لیے ہال، ورزش کے کمرے، کیفے ٹیریاز، بارز اور قیدیوں کی نفسیاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے پڑھی لکھی خوبصورت خواتین، کھانا نہایت ہی شاندار اور صاف ستھرا، پہننے کے لیے استری شدہ نفیس سوٹ، صحت کے لیے طبی معائنے کی سہولت، قیمتی ادویات، کئی کئی ڈاکٹر لیکن ان تمام سہولیات اور آسائشوں کے باوجود ڈنمارک میں پچھلے پچاس برسوں میں صرف ایک قتل ہوا اور وہ بھی ایک ایشیائی باشندے نے کیا، آبروریزی، دست درازی اور جنسی حملے اس قدر کم ہیں کہ ڈنمارک کی لغت میں ریپ اور گینگ ریپ کے لفظ ہی نہیں، رہی چوری، ڈاکہ زنی اور لوٹ مار تو اس کا تو وہاں تصور تک نہیں، دکانیں کھلی ہیں، بینکوں میں کوئی گارڈ نہیں، شاپنگ سنٹروں میں چند کاؤنٹر بوائز کے سوا عملے کا کوئی رکن نہیں۔

آپ پوچھیں گے صاحب اتنی بہترین جیلوں، اتنے نرم قوانین اور واردات کے اتنے شاندار موقعوں کے باوجود وہاں اتنے کم جرائم کیوں؟ اس کا بڑا ہی سیدھا اور واضح جواب ہے، ڈنمارک کے لوگوں نے جب جیلوں کو جدید ترین سہولیات سے آراستہ کیا تو ساتھ ہی انہوں نے اپنے عدالتی نظام کو بھی لوہے کی طرح سخت اور چٹان کی طرح اٹل بنا دیا، لہٰذا اب وہاں جرم بادشاہ سے سرزد ہو یا بے روزگار شرابی سے، مجرم کو گرفتار ہوتے، تھانے پہنچتے، اس کے خلاف تحقیقات مکمل ہوتے، اسے عدالت پہنچاتے، اس کے کیس کا فیصلہ ہوتے اور پھر اسے جیل میں بند کرتے اس سے بھی کم وقت لگتا ہے جتنا تیسری دنیا میں ایک شہر سے دوسرے شہر تک خط پہنچنے میں صرف ہوتا ہے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈنمارک حکومت کو اتنی شاندار جیلوں، اتنی آسائشوں اور اتنے رومان پرور ماحول سے استفادہ کرنے کے لیے برسوں سے مناسب تعداد میں مجرم نہیں مل رہے۔

اس کے برعکس آپ اپنے ملک کی طرف دیکھیے، ہماری پولیس کو وہ اختیارات بھی حاصل ہیں جن کا

چنگیز خان کے دور میں بھی تصور نہیں تھا، ہماری حوالات جانوروں کے باڑوں سے زیادہ بدتر اور غلیظ ہیں، ہماری جیلوں کا ماحول اسی قدر غیر انسانی اور ظالمانہ ہے جتنا صدیوں پہلے افریقی غلاموں سے بھرے بحری جہاز کا ہوتا تھا لیکن مجرموں کے ساتھ اس عبرتناک سلوک کے باوجود پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں نہ صرف آبرو ریزی جیسے وحشیانہ فعل سے لے کر قتل، فراڈ اور ڈکیتی تک کے ہزاروں جرائم ہوتے ہیں بلکہ یہ دنیا کے ان ممالک کی فہرست میں شامل ہے جن میں وقت گزرنے کے ساتھ جرائم میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

آپ پوچھیں گے صاحب اتنی خوفناک جیلوں، اتنے سخت قوانین اور وارداتوں کے اتنے لرزہ خیز نتائج (جن میں پولیس مقابلے میں مرنے کے امکانات بھی ہوتے ہیں) کے باوجود جرائم کے تناسب میں اتنا اضافہ کیوں؟ اس کا جواب بھی بڑا ہی سیدھا اور واضح ہے دراصل پاکستان میں شروع دن سے قوانین تو انتہائی سخت بنائے گئے لیکن انصاف کا عمل اتنا نرم، ڈھیلا اور طویل رکھا گیا کہ مدعیوں کی تین تین نسلیں فیصلہ سننے کی آس میں قبروں تک پہنچ جاتی ہیں لیکن سماعتیں، پیشیاں، گواہیاں، تاریخیں، ثبوت، بیانات، شلام پیپر اور شہادتیں مکمل نہیں ہوتیں لہٰذا مجرموں کو معلوم ہوگیا، اگر ان کے پاس چند پیسے ہیں تو قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنا، سٹے آرڈر لینا، پیرول پر رہا ہونا اور ضمانت قبل از گرفتاری کا بندوبست کرنا کوئی مشکل کام نہیں چنانچہ اس ملک میں جرائم ہوتے رہے، مجرم رہا ہوتے رہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کراچی میں امن قائم کرنے کے لیے بے نظیر کو "پکڑو اور گولی سے اڑا دو" کا فارمولا اپنانا پڑا اور نواز شریف کو دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ملٹری کورٹس بنانا پڑیں، جس کے بعد ملک میں انصاف کے تین الگ الگ دھارے بہنے لگے، مجرم کو پولیس مقابلے میں فارغ کر دیں، ملٹری کورٹ سے سات روز کے اندر فیصلہ کرالیں یا پھر کیس عدالت کے سپرد کر کے سات آٹھ برس کے لیے فارغ ہو جائیں۔

ملٹری کورٹس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا اس وقت قبل از وقت ہوگا، ہوسکتا ہے فروری ۹۹ء کے پہلے دوسرے ہفتے میں ان کے فیصلے بحال ہو جائیں، یہ بھی ہوسکتا ہے آنے والے دنوں میں حکومت اور عدلیہ کے مابین ایک اور آئینی جنگ چھڑ جائے، تاہم فیصلہ کچھ بھی ہو یہ طے ہے ہمارے نظام عدل میں عدل کے سوا سب کچھ ہے اور یہ بھی طے ہے اگر ہم نے یہ ملک چلانا ہے، ہم نے اسی سبز پرچم تلے زندگی گزارنی ہے، اس شناختی کارڈ، اس پاسپورٹ کے ساتھ ہی رہنا ہے تو پھر ہمیں اس نظام کو بدلنا ہوگا، اس کی جگہ ایک ایسا نظام لانا ہوگا جس کے فیصلے آزاد بھی ہوں اور فوری بھی، اگر خدانخواستہ ہم نے ایک آدھ برس میں ایسا نظام عدل وضع نہ کیا تو پھر شاید یہ ملک قائم نہ رہے، اور اگر یہ ملک نہ رہا تو پھر میاں نواز شریف بچیں گے اور نہ ہی اجمل میاں، بے نظیر رہیں گی اور نہ ہی طاہر القادری۔

قدرت کا قانون ہے جن معاشروں میں مظلوم کو فوراً انصاف نہیں ملتا انہیں زمین چاٹ جایا کرتی ہے، وہ ہڑپہ بن جاتے ہیں، وہ ٹیکسلا بن جاتے ہیں، وہ موہنجوداڑو بن جاتے ہیں۔

ہتھکڑیاں

میں نے جب بھی انسانی المیوں کے بارے میں سوچا، مونالیزا کا خالق لیونارڈو ڈوِنچی کتابوں سے نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک عجیب انسان تھا، تھری ان ون، مصور تھا، موسیقار تھا، سائنس دان تھا۔ دن رات گیلری میں کام کرتا رہتا، جب برش بے قابو ہو جاتا اور رنگ پھیکے پڑنے لگتے تو ایزل سے منہ موڑ کر سٹوڈیو کی طرف نکل جاتا، جہاں گٹار، ہارمونیم اور ڈرم اس کے منتظر ہوتے، پھر تاروں سے رنگ نکلتے، جذبوں کے چھینٹے اڑتے اور سارا گھر آوازوں سے مہک اٹھتا، یہ سلسلہ ہفتوں جاری رہتا، یہاں تک کہ آوازیں مدھم پڑ جاتیں، سر گونگے ہو جاتے اور انگلیوں کا کانوں سے رشتہ کمزور پڑ جاتا، وہ گٹار دور پھینکتا اور اٹھ کر لیبارٹری چلا جاتا، جہاں سٹینڈوں پر چڑھی ٹیوبیں اس کا انتظار کر رہی ہوتیں، وہ اپنی آنکھیں نیلے اور سرخ لٹمس پیپرز، اوزان کے چھوٹے بڑے آلات اور کیمیائی مادوں کے خواص کی شیٹ پر مرکوز کر دیتا، نوٹس لیتا رہتا، تخمینے لگاتا رہتا، مادوں کے استعمال سے جنم لینے والے نتائج رقم کرتا رہتا، یہاں تک کہ یہ عمل بھی اپنی دلچسپی کھو بیٹھتا۔ اس کی پلکیں بوجھل ہو جاتیں، جسم تھکاوٹ کا شکار ہو جاتا اور وہ بوریت کے ایک گہرے احساس کے ساتھ واپس گیلری لوٹ جاتا۔

قدرت نے اسے تین مختلف شعبوں میں یکساں مہارت کے علاوہ بھی ایک صلاحیت دے رکھی تھی، دونوں ہاتھوں سے بیک وقت کام کرنے کی صلاحیت۔ وہ یکساں خوبی کے ساتھ دائیں بائیں ہاتھ سے پینٹ کر سکتا تھا۔ الٹے اور سیدھے ہاتھ سے گٹار بجا سکتا تھا، دونوں ہاتھوں سے لکھ سکتا تھا۔

لیکن اس میں اس سے بھی بڑی خوبی تھی، وہ دنیا کا واحد شخص تھا جو ایک ہی وقت میں ایک ہاتھ سے تصویر اور دوسرے سے گھڑی ٹھیک کر سکتا تھا، جو ایک سے گھڑی ٹھیک کر سکتا تھا اور دوسرے سے کوئی بھی آلۂ موسیقی بجا سکتا تھا، لیکن اس طرح کہ گھڑی کے پرزوں کا توازن بگڑے، نہ رنگوں کی انفرادیت مجروح ہو اور نہ ہی سروں کا حسن متاثر ہو اور کبھی کبھار تو ایسا مرحلہ بھی آ جاتا کہ ڈوِنچی نے اپنے سامنے دو ایزل لگائے، ایک پر ایک ہاتھ سے کسی کی پورٹریٹ شروع کی اور دوسرے پر دوسرے ہاتھ سے کوئی لینڈ سکیپ پینٹ کرنے لگا، جب تصویریں مکمل ہوئیں تو دونوں شہکار تھیں۔

ایک روز یہی ڈونچی بیدار ہوا تو اس کے دونوں بازو کندھوں سے انگلیوں تک مفلوج ہو چکے تھے اور ایک عبرت انگیز سسکتی ہوئی زندگی اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ گھنٹوں گیلری میں بیٹھا رہتا، ایزل پر چڑھی ادھوری تصویریں دیکھتا رہتا، رنگوں میں لتھڑے خشک برش تکتا رہتا، کینوس کے پھٹے ٹکڑوں اور نامکمل سکیچز پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا، جب دکھ برداشت کے بند توڑ کر پلکوں تک آ جاتا تو وہ اٹھ کر سٹوڈیو آ جاتا، جہاں اس کا گٹار ہوتا، ڈرم، پیانو اور وائلن ہوتا، وہ انہیں نظروں سے چھو کر دیکھتا جب چین نہ پاتا تو مزید دکھی ہو کر لیبارٹری میں چلا جاتا، جہاں سٹینڈوں پر چڑھی ٹیوبیں اس کا مذاق اڑاتیں، اوزان کے آلات اس کی بے وزنی کا نوحہ کہتے اور حتائج کی ڈائری اس کے المیے پر مسکراتی، یہاں پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا، اتنا روتا، اتنا روتا کہ اس کی گھنی سیاہ داڑھی گیلے تولیے کی طرح بھاری ہو جاتی۔

کسی نے پوچھا: ''ڈونچی اگر ایک لمحے کے لیے تمہارے بازو زندہ ہو جائیں تو.....؟'' اس نے فوراً جواب دیا ''میں اپنے آپ کو چھو کر دیکھوں۔'' آخری ساعتوں میں کسی نے سرگوشی کی: ''ڈونچی تمہاری کوئی خواہش؟'' اس نے پوچھنے والے کو حیرت سے دیکھا، مسکرایا اور پھر آنکھیں موند کر نقاہت سے بولا: ''کاش ڈونچی اپنے ہاتھ سے ناک پر بیٹھی مکھی اڑا سکتا۔ کاش اے کاش!''

میں نے جب بھی انسانی المیوں کے بارے میں سوچا، مجھے دمشق کی گلیوں میں ایک سایہ چلتا ہوا نظر آتا، سایہ جس کی روشن پیشانی پر لکیر در لکیر سوال درج تھے۔

وہ حمام کے مرمریں چبوترے پر لیٹ جاتے، جب غسال کھردرے کپڑے سے ان کا جسم مل کر فارغ ہو جاتا تو وہ غسال سے فرمائش کرتے ''عبداللہ میرے جسم پر کہیں بھی دو انگلیاں رکھو۔'' غسال فوراً حکم کی تعمیل کرتا آپ پھر پوچھتے: ''عبداللہ دیکھو کیا ان کے نیچے زخم کا نشان ہے۔'' غسال انگلیاں اٹھا کر دیکھتا اور فوراً تلوار کے گہرے گھاؤ کی تصدیق کر دیتا۔ آپ حسرت سے بھری سانس کھینچتے اور کہتے: ''افسوس وہ خالد بن ولید جو زندگی بھر شہادت کی آرزو لے کر میدان میں اترا آج اس بے مہر شہر میں یوں موت کا منتظر ہے، جیسے پاگل اونٹ صحرا میں قضا کا انتظار کرتا ہے۔''

میں نے جب بھی انسانی المیوں کے بارے میں سوچا، مجھے لندن کا میک یاد آ گیا۔ عقل کو حیران کر دینے والا میک۔

میک دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر لڑ رہا تھا، اچانک سامنے سے ایک گولی اڑتی ہوئی آئی اور میک کی پیشانی میں اتر گئی۔ اسے ہسپتال پہنچایا گیا، آپریشن ہوا، گولی نکال لی گئی تو میک پیشانی پر آدھ انچ کے سوراخ کے ساتھ بچ گیا، جنگ ختم ہوئی تو وہ پنشن لے کر لندن چلا گیا، جہاں وہ کسی معروف سڑک پر کھڑا ہوتا، سگریٹ سلگا کر پیشانی کے سوراخ میں لگاتا اور منہ سے دھواں نکال کر لوگوں کو حیران کرتا، تالیاں پیٹنے پر مجبور کرتا، لوگوں کی جیبیں اپنے ہیٹ میں الٹنے کے لیے قائل کرتا، میک مسلسل بیس برس تک یہ ''شو کرتا رہا،

لیکن ایک روز بلب بدلتے ہوئے ایک معمولی سا کرنٹ لگا، وہ تپائی سے نیچے گرا اور مر گیا۔

میں نے جب بھی انسانی المیوں کے بارے میں سوچا، مجھے برادرم خالد مسعود کا سنایا ہوا کریکٹر یاد آ گیا۔

ملتان شہر میں نذیر سینڈو رہتا تھا، بلا کی قوت برداشت کا مالک تھا، وہ پیٹ پر پتھر رکھ کر ہتھوڑوں سے تڑواتا، اوپر سے ٹرک گزرواتا، بالوں سے ٹریکٹر کھینچتا، کپڑوں کو آگ لگا کر ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگاتا، اپنا جسم سلاخوں سے داغتا، لیکن اسے درد، اذیت اور تکلیف نہ ہوتی، یہ سینڈو ایک روز سائیکل سے گرا اور مر گیا۔

ہاں میں نے جب بھی انسانی المیوں کے بارے میں سوچا، تاریخ کے تمام نامور کردار کتابوں سے نکل کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میں نے دیکھا ہر وہ صاحب کمال جس نے اپنے آرٹ، اپنی ذہانت، اپنی جرأت، اپنی فراست اور اپنی حکمت عملی سے زندگی کا دھارا بدلا، جو لکیر کی طرح وقت کے پتھر پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا اسے موت بڑی المیہ نصیب ہوئی۔ عقل جواب دے جاتی ہے وہ نمرود جو چھ ماہ کا تھا تو سمندر میں ڈوب کر نہ مرا، جب نو ماہ کا تھا تو اسے جزیرے پر درندے پالتے رہے، جب جوان ہوا تو زمین کی ساری قوتیں اس کے ہاتھ پر بیعت ہو گئیں اور جو بادشاہ بنا تو خدا بن گیا، وہی نمرود حقیر سے مچھر کے ہاتھوں ذلیل ہو کر مرا۔ کیا عقل کے پاس جواب ہے وہ سکندر اعظم جسے لاکھوں سپاہیوں کے سینکڑوں لشکر شکست نہ دے سکے، بھالے کے ایک معمولی زخم سے ہلاک ہو گیا۔ کیا عقل کے دامن میں جواب ہے ہٹلر جیسا شخص خودکشی پر کیوں مجبور ہوا، بونا پارٹ یوں بے بسی کے عالم میں کیوں مرا، لنکن کا قاتل کہاں کا سپہ سالار تھا، ذوالفقار علی بھٹو نے کس جنگ میں جان گنوائی، اندرا گاندھی کو مارنے والے پورس کون تھے اور جنرل ضیا کو کس کی موت نے آ گھیرا۔

ہاں، جتنا بڑا باکمال شخص ہوتا ہے وہ اتنی ہی حقیر موت پاتا ہے۔ یہی قدرت کا اصول ہے، اس قدرت کا اصول، جو لوگوں کے لیے اپنے فیصلے نہیں بدلا کرتی۔

ہاں، میں انسانی المیوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ناہید خان کی سوچ سے غرور کی بو آتی ہے، اس ناہید خان کی سوچ سے، جس نے کہا، بے نظیر کے لیے ابھی کوئی ہتھکڑی نہیں بنی۔

ہاں یہ محترمہ سچ کہتی ہیں کہ قدرت "بڑے" لوگوں کے لیے ہتھکڑیاں نہیں بنایا کرتی، انہیں کچے دھاگوں سے باندھا کرتی ہے، خدائی لیجوں کا جواب پٹ سن کے باریک ریشوں اور چھوٹے حقیر زخموں سے دیا کرتی ہے۔

جو قدرت مچھروں سے عزرائیل کا کام لے سکتی ہے اسے کیا پڑی کہ ہتھکڑیاں بنواتی پھرے، بے نظیروں کے لیے زنجیریں تلاش کرتی پھرے۔

میل

بات اس کی نیلی آنکھوں اور سیاہ بالوں سے شروع ہوئی۔ اس نے سیب کی قاشوں جیسے باریک ہونٹ کھولے، بالوں کو جھٹکا دیا اور چشمہ چٹکی میں گھماتے ہوئے بولی۔ ''میں نے آنکھیں اپنی جرمن ماں کی چرائیں اور بال مجھے میرا اٹیلین باپ دے گیا اور خود میں امریکن ہوں؟ پاؤلا''

میں نے ایک ذرا سہما سا قہقہہ لگایا اور پھر جھک کر آہستہ سے کہا: ''پاؤلا جونز''

''اوہ تو، تو'' اس نے ہسٹریائی انداز سے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرائے اور اپنی پٹاخے دار آواز میں بولی: ''اوتو، تو پاؤلا جونز نہیں مارتھر، پاؤلا مارتھر۔ پاؤلا جونز تو صدر کلنٹن کو ڈبو کر چھوڑے گی۔''

تم لوگ بھی عجیب ہو، میں نے سامنے امریکی سٹیر کے گرد جمع صحافیوں پر نظریں جما کر کہا۔ ''کیا مطلب؟'' اس کی نیلی آنکھوں کی مخمل گہری ہو گئی۔

میں نے اپنا الٹا ہاتھ گردن پر پھیرا اور پھر مجمع بازوں کی طرح تقریر شروع کر دی۔ ''وہ امریکہ جس میں ۹۹ فیصد لڑکیاں بلوغت سے قبل جنسی عمل سے گزر جاتی ہیں، جہاں صرف معذور عورتیں ہی پورا لباس پہنتی ہیں، جہاں ۸۳ فیصد جوڑے ناجائز تعلقات کو شادی پر فوقیت دیتے ہیں، جہاں صرف ۷ فیصد نوجوان والدین سے پوچھ کر شادی کرتے ہیں اور جہاں سگی بیٹیوں پر مجرمانہ حملوں کے لاکھوں کیس درج ہوتے ہیں۔ وہ امریکہ اپنے صدر کی ایک جنسی بھول معاف کرنے کے لیے تیار نہیں؟''

اس نے اپنی منحنی سی ناک پر چشمہ لگایا اور پھر بڑی سنجیدگی سے بولی: ''اس لیے کہ وہ ہمارا لیڈر ہوتا ہے۔ ایک امریکی گردن تک جرم، گناہ اور بدعنوانی میں کیوں نہ ڈوبا ہو لیکن جب اپنے لیے لیڈر چنے گا تو ایک صاف ستھرے اور ایماندار شخص کا انتخاب کرے گا۔''

شام جب میں نے سی این این پر کلنٹن کا اترا ہوا چہرہ اور کمپیئر کو بار بار کہتے دیکھا کہ جیسیفر فلاور کے ساتھ جنسی تعلقات کے اعتراف کے بعد کلنٹن کی صدارت بچتی نظر نہیں آتی تو مجھے چھ ماہ پہلے کی وہ شام یاد آ گئی جب پاؤلا مارتھر گردن جھٹک جھٹک کر کہہ رہی تھی ''امریکہ میں کسی بددیانت، بداخلاق اور جنسی گراوٹ کے شکار سیاستدان کے لیے کوئی گنجائش نہیں، ہم نے نکسن کو برداشت نہیں کیا، یہ تو چھوٹا سا کلنٹن ہے۔'' میں نے

ٹی وی بند کیا اور بتی بجھا کر سوچنے لگا اگر کلنٹن امریکہ کے بجائے پاکستان کا سربراہ ہوتا تو کیا اس انکشاف کے بعد بھی اس کا مستقبل تاریک ہوتا تو میرے شعور نے جواب دیا نہیں کیونکہ ہم وہ لوگ ہیں جو انتہائی بدکردار حکمران کے ساتھ بھی برضا و رغبت زندگی گزار سکتے ہیں۔

ہاں، میں نے سوچا وہ ہندو عورت بھی پاکستان ہی کی خاتون اول تھی، جس کے چہرے کی رعنائی سے وزیراعظم ہاؤس کا ہر مرد گھبراتا تھا، کثرت شراب نوشی سے جس کا جگر جواب دے گیا تو وہ شرابیوں کو جمع کرتی، ان کے سامنے سامان مے نوشی سجاتی اور پھر انہیں شراب نوشی کرتے دیکھ کر خوش ہوتی رہتی۔

ہاں وہ مرزا بھی اسی سلطنت کا سکندر تھا، جو نشے کی حالت میں اجنبی عورتوں کے پلو پکڑتا آنکھوں سے لگاتا اور پھر لہک لہک کر ان کے حسن کی تعریف کرتا اور اس کی بیوی ساری شام اس کے پیچھے پھرتی رہتی کہ کہیں کسی کمزور لمحے میں کوئی دوسری عورت فرسٹ لیڈی نہ بن جائے۔

آغا جی بھی اس ملک میں پورے کروفر سے حکومت کرتے رہے، جن کی ''پاؤلا'' کو لوگوں نے جنرل کا رینک لگا دیا، جن کے حرم میں جب ''نور'' کی بارش ہوتی تھی یا محبت کے ترانے دستک دیتے تھے تو فوراً تخلیہ کر دیا جاتا تھا، جو جب دشمن پر حملے کا حکم دینے کے لیے نکلے تو دو جوانوں نے انہیں دائیں بائیں سے اٹھا رکھا تھا اور وہ ایک کا نعرہ لگا کر پیچھے گر گئے تھے، جو پشاور میں ننگ دھڑنگ باہر آ گئے تھے، جنہوں نے درجنوں سربراہان کی موجودگی میں مانٹی کارلو کی شہزادی کے بازو پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا تھا اور جنہوں نے ہزاروں لوگوں کے سامنے گملے کو بیت الخلاء کا درجہ دے دیا تھا۔

وہ یکتا روز شخص بھی اسی ملک کا حکمران تھا، جس کی شامیں حسنہ کے بالوں سے کھیلتے گزرتی تھی۔ جی ہاں وہی حسنہ جس کی ''بیٹی'' آج بھی اپنا ناک نقشہ ملک کے سب سے بڑے سیاسی خاندان سے ملاتے نہیں تھکتی۔

وہ پیرزادہ بھی زندہ ہے، جس نے اقتدار میں زنانہ کالج کی استاد سے پینگیں بڑھائیں، جب معاملہ چل پڑا تو وہ اسے پورے پروٹوکول کے ساتھ اسلام آباد کی سیر کراتا رہا، پھر اس خاتون نے ایک روز یہ کہہ کر اس سے علیحدگی اختیار کر لی: ''اگر میں نے زندگی وزیراعظم ہاؤس میں ہی گزارنی ہے تو پھر مجھے تمہاری کیا ضرورت ہے؟ ہائے ہائے۔''

اس جاگیردار نے بھی عمر کسی عہدے سے استعفیٰ نہیں دیا، جس کے قبضے سے کنیرڈ کالج کی اغوا شدہ لڑکیاں برآمد ہوئی تھیں، جس نے اپنی بیوی سے کہا: ''میں علماء کرام سے مذاکرات کے لیے جا رہا ہوں، تم نیچے نہ آنا اور پھر رات بھر۔ ''اس'' سے ''مذاکرت'' کرتا رہا۔

اس حیات کی بیٹی کو ابھی تک جائز حق نہیں ملا، جسے وزیراعلیٰ کی موت کے بعد اس کی ائیر ہوسٹس ماں چھپائے چھپائے پھرتی تھی۔

وہ کلب ڈانسر بھی آج ایک سیاسی پارٹی کی سربراہ ہے جو ایک چھوٹی سی بچی کو رقص کی تعلیم دینے آئی

اور گھر کی مالکن بن بیٹھی اور آج وہ نہ صرف ایک بڑے سیاسی خاندان کی جائیداد کی وارث ہے بلکہ اس کی سیاسی ساکھ میں بھی حصہ دار ہے۔

وہ قومی ہیرو بھی آج تیسری سیاسی قوت بن کر ابھر رہا ہے جس کی سابق محبوبہ اس کی بچی کی انگلی پکڑے دنیا کی عدالتوں میں دھکے کھا رہی ہے اور جس کے بارے میں لاہور کی ''کلی'' نے انبساط بھری مسکراہٹ کے ساتھ پریس کانفرنس میں کہا تھا: ''وہ لڑکیاں لے کر میرے بیڈروم میں آجاتے تھے۔''

وہ پرہیزگار ''شاہ جی'' بھی آج تک لیڈر ہیں، جن کی تصویریں آخری وقت تک ٹی وی کی ایک اداکارہ کے بیڈروم میں لگی رہیں اور جو اپنے بچوں کو ''شاہ جی'' کی اولاد کہہ کر پکارتی تھی۔

وہ یوسف بھی اسی کنعان کا شہزادہ ہے جس کا نام سن کر آج بھی غیرت ناہید کی ہر تان ویک ہو جاتی ہے، جس نے اپنے دوستوں کی محفل میں بڑے دعوے سے کہا تھا: ''وہ زندگی میں کبھی نہیں گائے گی تم شرط لگالو۔''

وہ مروت بھی اسی مملکت خداداد میں عرفان کی طرح پھیل رہا ہے، جس کے بارے میں ایک بوڑھے سیاستدان نے پوری قوم کو مخاطب کر کے کہا تھا: ''یہی میری بیٹی سے اجتماعی زیادتی کا مجرم ہے۔''

وہ زردار بھی اسی ملک کا رہنما ہے جس کے بریگیڈیئر کی لڑکی سے تعلقات کا ڈھنڈورا دنیا بھر کے اخبارات نے پیٹا، جس نے اپنی ''زیب النساء'' کے لیے محل تک خریدا، اور جو آج تک اس تعلق پر شرمندہ نہیں۔

وہ گوہر نایاب بھی آج تک حکمران ہے، جسے جب ڈاکوؤں نے اونچے مقام پر روکا تو اس کے ساتھ ۲۰ ویں گریڈ کی ''پاؤلا جونز'' تھی۔

ہاں سینے پر ہاتھ رکھ کر بتا ئیں اس ملک کے اہم لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہے جس کے نامہ اعمال سے کسی پاؤلا جونز کی بو نہیں آتی، جس کا ماضی ''یاد ماضی عذاب ہے یارب'' کی تفسیر پیش نہیں کرتا، جس کے منہ سے شراب کے بھبکے نہیں اٹھتے اور جو فخر سے اپنی راتوں کے قصے بیان نہیں کرتا۔

ہاں اس طارق چودھری سے پوچھئے جس نے ہاسٹل سے روتی ہوئی لڑکیاں رہا کروائی تھیں۔ اس اقبال خاکوانی سے پوچھئے جو طوائفوں کا راستہ روکنے کے لیے ڈنڈا لے کر ایم پی اے ہاسٹل کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ سرکاری ہاسٹلز کے بیروں اور سویپروں سے پوچھئے جو کمروں سے چوڑیوں کے خون آلود ٹکڑے جمع کرتے رہتے ہیں، جو خالی بوتلیں اور زنانہ کپڑے چھپاتے رہتے ہیں۔

ہاں کرہ ارض پر صرف یہی جمہوریہ ہے جہاں کسی پاؤلا کے الزام کے، کسی مونیکا اور کسی جینیفر کے اعتراض پر اقتدار کا کوئی بت پگھلتا ہے نہ کسی دامن پر چھینٹا پڑتا ہے اور نہ ہی کسی پگڑی کا بل کھلتا ہے کہ یہی ہے وہ مقام، جہاں اقتدار اور اخلاقی گراوٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

مجھ سے ایک دوست نے پوچھا آخر ہمارے ہاں صالح قیادت کا اتنا فقدان کیوں ہے؟ میں نے آہستہ سے کہا: ''اس لیے کہ ہمارا معاشرہ گنے کی ''رہو'' ہے اسے جتنا گرم کرو گے اس پر اتنا ہی میل آئے گا، بالائی نہیں۔''

چار دن اور پانچ راتیں

یہی چار دن اور پانچ راتیں تھیں، یہی ۴۸ گھنٹے اور ۳۶۰۰ منٹ تھے جن میں چن زیب نے عمر بھر کا سکھ، اطمینان اور آسودگی دیکھی۔

یہی چار دن تھے جن میں چن زیب نے کسی نواز شریف، کسی شہباز شریف، کسی خواجہ ریاض کا انتظار نہیں کیا جن میں چن زیب نے کوئی خواب نہیں بنا، امیر ہونے کا کوئی سپنا نہیں دیکھا، باعزت روزگار کی کوئی آس نہیں باندھی، کسی بڑے شخص سے ملاقات کی امید نہیں رکھی، جن میں چن زیب نے کسی مخیر شخص، کسی غیبی ہاتھ کا انتظار نہیں کیا، کسی دستک، کسی پرائز بانڈ، کسی لاٹری، کسی خط، کسی تار کا راستہ نہیں دیکھا۔

یہی پانچ راتیں تھیں جن میں چن زیب نے اپنے چھ بچوں کے ننگے پاؤں، ناف سے اوپر سرکتی قمیصیں اور گھٹنوں کو چھوتی شلواریں نہیں دیکھیں، اسے بوڑھے باپ کی بلغم میں خون کے چھینٹے نظر نہیں آئے، اسے چولہے پر چڑھی خالی ہانڈی کے گرد لیٹے لاشے دکھائی نہیں دیئے، اسے خالی کنستروں اور ٹوٹے گھڑوں کی آواز سنائی نہیں دی، اسے زرمرجان کے گھولتے آنسو اپنے دل پر گرتے محسوس نہیں ہوئے، یہی پانچ راتیں تھیں جن میں اس کے بچوں نے اس سے کوئی فرمائش نہیں کی، اس کی گڑیا نے اس سے گڑیا نہیں مانگی، اس کے پپو نے اس سے سائیکل کا مطالبہ نہیں کیا، اس کے ٹینکو نے نئی کتابیں، نئی یونیفارم اور نئے جوتے نہیں مانگے، اس کی بیمار بیوی نے دوائیاں، اس کی شادی شدہ بیٹی نے سلائی مشین اور اس کے بوڑھے باپ نے گرم چادر نہیں مانگی، مالک مکان نے اس کے دروازے پر دستک نہیں دی، دودھ والے نے ادھار چکانے کا مطالبہ نہیں کیا، ترکاری والے نے کریانے والے نے ''آخر کب تک انتظار کروں'' کا برچھا نہیں چلایا۔

یہی ۴۸ گھنٹے تھے جن میں چن زیب نے کسی سوزوکی کے پیچھے لٹک کر سواریوں کے لیے آوازیں نہیں لگائیں، ''چنے لے لو'' کی صدائیں نہیں دیں، برف کے گولے نہیں بیچے، سبزی کی ریڑھی نہیں کھینچی، جن میں چن زیب نے کسی سے ادھار نہیں مانگا، جن میں اس نے جیب میں پڑے چند نوٹوں کو بار بار نہیں گنا، اس نے دکانوں کے سامنے رک رک کر حسرت سے چمکتی دمکتی چیزیں نہیں دیکھیں، جن میں اس نے سائیکل بیچ کر لاہور پہنچنے، اپنے محبوب وزیراعظم سے ملاقات کرنے، ان سے ہاتھ ملانے، ان کے گلے لگنے ان کے ساتھ

چائے پینے اور ان سے چیک وصول کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا، جن میں اس نے باعزت کاروبار کرنے، خوب دل لگا کر محنت کرنے، ایک دکان سے دو دکانیں اور دو دکانوں سے کئی کئی پلازے بنانے کا پلان نہیں بنایا، جن میں اس نے چن زیب گروپ آف کمپنیز، سیٹھ چن زیب، چن زیب اینڈ برادرز کے خواب نہیں دیکھے، جن میں اس نے بیسیوں یتیم خانے بنانے، سینکڑوں تعلیمی ادارے کھولنے اور ہزاروں فلاحی مراکز قائم کرنے کے سپنے نہیں دیکھے۔

یہی ۳۶۰۰ منٹ تھے جن میں چن زیب نے اپنی پرانی سائیکل نہیں بیچی، جن میں اس نے لاہور تک کا ٹکٹ نہیں خریدا، جن میں اس نے سرپٹ بھاگتی ٹرین کی سست رفتاری کا شکوہ نہیں کیا، جن میں اس نے ماڈل ٹاؤن کا پتہ نہیں پوچھا، جن میں اس نے پوری رات اتفاق پارک میں ٹھٹھرتے نہیں گزاری، جن میں اس نے خود کو وزیراعظم ہاؤس کے سامنے کھڑا ہوا نہیں پایا، جن میں اس نے کسی سے ''وزیراعظم اندر ہی ہیں نا'' نہیں پوچھا، جن میں اس کو کسی نے دھتکارہ نہیں، کسی نے اس کی کمر پر جالگا لے آگ کا کوڑا نہیں برسایا، جن میں اس نے اپنے اوپر مٹی کا تیل نہیں گرایا، جن میں اس نے دیا سلائی نہیں جلائی، جن میں اس نے چیخ نہیں ماری جن میں اس نے ہمیں، ہمارے اس نظام اور ہماری اس اجتماعی بے حسی کو گالی نہیں دی۔

یہی چار دن اور پانچ راتیں تھیں، یہی ۴۸ گھنٹے اور ۳۶۰۰ منٹ تھے جن میں چن زیب نے عمر بھر کا سکھ، اطمینان اور آسودگی دیکھی، جن میں اسے نرم اور گرم بستر ملا، جن میں اسے پوری خوراک اور قیمتی دوائیں ملیں، جن میں اسے سات براعظموں پر پھیلی دنیا سے ہمدردی، رحم اور افسوس ملا، جن میں اسے پونے دو سو ممالک کے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژنوں سے اہمیت ملی، جن میں اسے نواز شریف، شہباز شریف اور خواجہ ریاض کی تسلی ملی، جن میں اسے بے نظیر، قاضی حسین احمد، طاہر القادری، فاروق لغاری اور عمران خان نے توجہ کے قابل سمجھا، جن میں حکومت نے اس کے مالی حالات کو غور کے قابل جانا، جن میں اسے وزیراعظم کی طرف سے چیک موصول ہوا، جن میں اسے چیئرمین بیت المال نے ماہانہ امداد پیش کی، جن میں اسے تین تین ہسپتالوں کے ماہر ڈاکٹروں کی توجہ ملی، جن میں اسے حرف تمنا سے لے کر کنگریاں تک اور چوراہے سے لے کر گریبان تک ہمدردیاں ہی ہمدردیاں، افسوس ہی افسوس ملا۔

یہی چار دن اور پانچ راتیں تھیں، یہی ۴۸ گھنٹے اور ۳۶۰۰ منٹ تھے جو مردہ چن زیب کو سوا لاکھ کا ہاتھی بنا گئے، یہی لمحے، یہی پل، یہی ساعتیں تھیں جو اس چن زیب اور اس جیسے سینکڑوں ہزاروں چن زیبوں کو یہ حقیقت سمجھا گئے کہ ''بے وقوفو! اس معاشرے میں زندگی کی کوئی قدر نہیں، کوئی قیمت نہیں، اگر اپنے بچوں کو اچھی خوراک، اچھی تعلیم اور اچھی رہائش دینا چاہتے ہو، اگر نواز شریف سے طاہر القادری تک ہر سیاستدان کی ہمدردی محبت اور توجہ سمیٹنا چاہتے ہو تو اپنے اپنے گھروں سے نکل کر خود کو آگ لگا لو۔''

ہاں یہی چار دن اور پانچ راتیں تھیں۔ یہی ۴۸ گھنٹے اور ۳۶۰۰ منٹ تھے جو پوری دنیا کو آواز دے

گئے، جو ساڑھے پانچ ارب لوگوں کو مخاطب کر گئے کہ آیئے دیکھئے یہ ہے وہ معاشرہ اور یہ ہیں وہ لوگ جو زندوں کو تو ان کا حق نہیں دیتے لیکن مردوں کے لیے ان کے پاس وقت بھی ہے ہمدردی بھی اور خیرات بھی۔

(نوٹ:۔ یہ کالم وزیراعظم کی کھلی کچہری میں خودسوزی کرنے والے جہاں زیب کی موت پر لکھا گیا۔)

تم امتحان پر پورے نہیں اترے

آیئے ہم سب مل کر کوئی ایسی کتاب دریافت کریں، کوئی آیت، کوئی حدیث، کوئی فتویٰ کوئی حوالہ تلاش کریں جس سے جوہر ٹاؤن لاہور کی میمونہ اختر اور اس کے معذور خاوند کے لیے اپنے دو سالہ علی یسٰین کو زہر پلانا، چھت سے دھکا دینا، راوی میں پھینکنا، ریل کی پٹڑی پر لٹانا یا تیل چھڑک کر آگ لگانا آسان ہو جائے، آیئے کوئی ایسا قانون، کوئی ایسا آئین، کوئی ایسا دستور کوئی ایسا آرڈیننس، کوئی ایسی دفعہ، کوئی ایسی ترمیم وضع کریں جو ننھے علی یسٰین کے بعد دو ہزار پانچ سو روپے ماہوار لینے والی اس استانی کو بے گناہ قرار دے دے، جو بے کار، ننڈے باپ کو باعزت بری کر دے، آیئے کوئی ایسی گھاٹی، کوئی ایسا غار، کوئی ایسا گڑھا، کوئی ایسی ندی، کوئی ایسی قبر تیار کریں جہاں ہم علی یسٰین کی موت کے بعد اپنا ضمیر، اپنا احساس، اپنی شرم، اپنے سوال، اپنے جواب دفن کر سکیں، آیئے ہم سب مل کر کوئی ایسا گوشہ، کوئی ایسا کونہ، کوئی ایسا تہہ خانہ، کوئی ایسی کوٹھڑی تلاش کریں جہاں ہم علی یسٰین کی آنکھیں بند ہونے کے بعد چھپ کر خدا کے قہر سے، رب کے عتاب سے اور اللہ کے انصاف سے بچ سکیں۔

آیئے ہم سب مل کر اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالیں، اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیں اور اپنے محسوسات جلا ڈالیں کہ اس دو سال کے ننھے علی یسٰین کے بعد یہ آسمان، یہ زمین، یہ ندی، یہ نالے، یہ رنگ، یہ ذائقے اور یہ ہریالی ہم سے ضرور پوچھے گی، ہمارے بچے، ہماری بیویاں، ہماری بہنیں ہمارے دامن ضرور جھٹکیں گی، ہماری جیبیں، ہمارے اکاؤنٹس، ہمارے سیف، ہمارے نوٹ، ہمیں ضرور چبھیں گے، آسمان پر اگر خدا موجود ہے اور اس کا ستر ماؤں کے برابر ممتا کا دعویٰ بھی قائم ہے تو وہ بھی ہم سے ضرور کہے گا "ہم نے اس علی یسٰین کو تم چودہ کروڑ لوگوں کا امتحان بنا کر بھیجا تھا، ہم ہی نے اس کے جسم میں الٹا دل لگایا تھا، ہم ہی نے اس کے دل میں چنے جتنا سوراخ بنایا تھا، ہم ہی نے اس کی دل کی ساری شریانیں ٹیڑھی لگائی تھیں، ہم ہی نے اس کے دل کا ایک والو بند کر دیا تھا، ہم ہی نے اس کا جسم دو سال تک نیلا رکھا تھا، ہم ہی نے اسے اتنا لاغر رکھا تھا کہ وہ دو سال کی عمر تک بیٹھ سکتا تھا نہ کھڑا ہو سکتا تھا، ہمارے حکم ہی سے علی یسٰین مسلسل بخار میں رہتا تھا، اسے روزانہ پانچ دورے پڑتے تھے، اس کا جسم اکڑ جاتا تھا، سانس اکھڑ جاتی تھی، آنکھیں چڑھ جاتی تھیں، ہاتھ پاؤں

ٹیڑھے ہو جاتے تھے، اس کے حلق سے ذبح ہونے والے بکرے جیسی چیخ نکلتی تھی، اس کا منہ خشک ہو جاتا تھا، اس کا چہرہ تن جاتا تھا، وہ ایڑھیاں رگڑتا تھا، کروٹیں بدلتا تھا اور درد سے بے ہوش ہو جاتا تھا، کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہم دیکھ سکیں اس بچے کی تکلیف سے کس نواز شریف کا دل تڑپتا ہے، کون شہباز شریف بے چین ہو کر گھر سے نکل پڑتا ہے، کس بے نظیر کو اپنا بلاول یاد آتا ہے، کون عمران خان اپنے ہسپتال کے دروازے اس پر کھولتا ہے، ۱۴ کروڑ لوگوں کے اس ملک سے کون کون سے صاحب دل باہر آتے ہیں لیکن افسوس وہ درد سے تڑپتا رہا، اس کی ماں دن میں پانچ بار دامن پھیلا کر خدا سے اس کی موت کی بھیک مانگتی رہی، اور اس کا باپ دیوار سے ٹکریں مارتا رہا لیکن نواز شریف کو خبر نہ ہوئی، شہباز شریف کو میڈیکل کالجوں کے انٹری ٹیسٹوں سے فرصت نہ ملی، صاحبان دل کو دکانوں، کارخانوں اور بہی کھاتوں نے سر اٹھانے کی اجازت نہ دی۔''

آیئے ہم سب مل کر ۱۵ برس سے شوگر کی مریض اس میمونہ اختر کا گلہ دبا دیں، دو ہزار پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ لینے والی اس استانی کا گلہ دبا دیں جو اپنے درد سے تڑپتے علی یسٰین کے لیے زہر کی ایک پڑیا نہیں خرید سکتی، جو اپنے پیٹ میں پروان چڑھتے دوسرے بچے کے دل کا سوراخ بند کرنے کے لیے اچھی خوراک نہیں کھا سکتی، جو اپنے لیے، اپنے بچوں کے لیے، اپنے بیمار خاوند کے لیے دوائیں نہیں خرید سکتی، پھل دودھ اور انڈے نہیں لا سکتی، اپنے گھر کی منڈیر پر بیٹھی فاقوں کی چیلیں نہیں اڑا سکتی، جو ابھی تک دعاؤں پر یقین رکھتی ہے، جو ابھی تک مایوس نہیں ہوئی، جو ابھی تک نواز شریف، بے نظیر اور عمران خان کا راستہ دیکھ رہی ہے، جو ابھی تک کسی نجات دہندہ کی منتظر ہے، جو ابھی تک اس قوم کے مردہ ضمیر کی بو نہیں سونگھ پائی۔

آیئے ہم سب مل کر کوئی ایسی کتاب دریافت کریں، کوئی آیت، کوئی حدیث، کوئی فتویٰ، کوئی حوالہ تلاش کریں، کوئی ایسا قانون، کوئی ایسا آئین، کوئی ایسا دستور، کوئی ایسا آرڈیننس، کوئی ایسی دفعہ اور کوئی ایسی ترمیم وضع کریں جو میمونہ، اس کے معذور خاوند، دل کے خوفناک عارضے کے شکار علی یسٰین اور اس کے پیٹ میں پلتے ایک نئے ''علی یسٰین'' کو باعزت موت دے دے، انہیں مرنے کا حق تفویض کر دے۔

آیئے ہم سب مل کر کوئی ایسی گھاٹی، کوئی ایسا غار، کوئی ایسا گڑھا، کوئی ایسی ندی، کوئی ایسی قبر تیار کریں جہاں ہم اپنا ضمیر، اپنا احساس، اپنی شرم اور اپنے سوال اور اپنے جواب دفن کر دیں کہ مجھے خدشہ ہے وہ خدا جو ہم جیسے ظالموں، فرعونوں، نمرودوں کو برسوں سے رزق، صحت اور مہلت دے رہا ہے کہیں ہم سے یہ نہ پوچھ لے ''تم لوگ کن کن ذہنی، روحانی اور اخلاقی بیماریوں کا شکار تھے پر ہم نے تم پر اپنی نعمتوں کا نزول بند نہیں کیا لیکن افسوس تم ہمارے ہی دیئے ہوئے رزق سے ایک دو سالہ بچے کی حفاظت نہ کر سکے، ایک دکھی عورت اور ایک بے بس مرد کو سہارا نہ دے سکے، افسوس تم لوگ ہمارے امتحان پر پورے نہیں اترے۔''

دوستو! بچے بیمار ہی کیوں نہ ہوں زمین پر خدا کا انعام ہوتے ہیں یہ اگر واپس پلٹ جائیں تو پھر آسمان سے انعام نہیں اترا کرتے قہر نازل ہوا کرتے ہیں۔

ثریا کا کیا بنتا

اگر ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے، کلنٹن کا فون آجاتا، اگر ورلڈ بینک، آئی ایم ایف کا کوئی وفد ماڈل ٹاؤن لاہور کے وزیراعظم ہاؤس تشریف لے آتا، اگر شریعت بل پر اختلافات شدت اختیار کر جاتے، اگر بلوچستان میں بغاوت پھوٹ پڑتی، اگر کراچی میں ایک اور بم دھماکہ ہو جاتا، اگر بے نظیر بھٹو مینار پاکستان کی بجائے فیروز پور روڈ کی طرف نکل آتیں، اگر واجپائی "اعلان جنگ" کر دیتے، اگر اسامہ بن لادن کے اسلام آباد پہنچنے کی خبر پھیل جاتی، اگر مارگریٹ البرائیٹ اچانک پاکستان لینڈ کر جاتی تو پی ڈبلیو ڈی کے اس ڈرائیور کی تیرہ سالہ ثریا کا کیا بنتا، اس کے دل کا سوراخ کون بند کرتا، اسے آپریشن اور دوائیوں کے پیسے کون دیتا؟

اگر ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے لاہور کا ٹیلی فون نظام درہم برہم ہو جاتا، اگر ماڈل ٹاؤن کی کیبل میں پانی چلا جاتا، اگر وزیراعظم ہاؤس کے باکس کی تاریں چوہا کتر جاتا، اگر ایکسچینج کا سرکٹ شارٹ ہو جاتا، اگر آپریٹر کے ہونٹوں سے چپکے ایسی فلٹر کے "ٹوٹے" کا دھواں کمپیوٹر کا دماغ خراب کر دیتا، اگر وفاقی کالونی میں ہونے والی کھدائی ٹیلی فونک رابطے کاٹ دیتی، اگر ریسیور خراب ہو جاتا، اگر فون ڈیڈ ہو جاتا، اگر ڈائل ٹوٹ جاتا، اگر کریڈل کی کھسکی ہوئی تار عین موقع پر دھوکہ دے جاتی، اگر "ڈی" سے "ش" نکل جاتا تو چھٹی جماعت کی اس ننھی سی ثریا کا کیا بنتا، ۲۵ سو روپے ماہوار تنخواہ پانے والے ڈرائیور کی بیٹی کا علاج کون کراتا، اس کے دل سے اچھلتی لہو کی دھار کون رکواتا، اسے آپریشن اور دوائیوں کے پیسے کون دیتا؟

اگر ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے ہاکر ہمسایوں کے گھر اخبار پھینک کر نہ جاتا، اگر اخبار کا نیوز ایڈیٹر کسی کونے کھدرے میں "وزیراعظم آج صبح ماڈل ٹاؤن میں ۴۵ منٹ تک عوامی کالز سنیں گے" کی سنگل کالمی خبر نہ لگاتا، اگر ہمسایوں کی بچی کی نظر اس خبر پر نہ پڑتی، اگر ہمسایوں کا "بابو" کنڈی کھٹکھٹا کر یہ خوشخبری نہ سناتا، اگر وہ دوپٹہ سنبھال کر ٹیکلی کے گھر نہ جاتی، اگر ڈائل اور ری ڈائل کرتے کرتے اس کی کمزور نحیف انگلیوں کا حوصلہ ٹوٹنے سے بچا نہ رہتا، اگر نو بج کر ۳۱ منٹ تک ان کی امید کا رشتہ قائم نہ رہتا تو سرسوں جیسے چہرے اور "کانٹے" جیسے جسم کی اس ثریا کا کیا بنتا، اس کی سیدھی سادی ماں کب تک گھی، چینی اور آٹے سے پیسے بچا بچا کر دوائیں خریدتی رہتی، اس کی لرزتی کانپتی امید اسے کب تک زندہ رکھتی، یہ کب تک زبان پر دانت گاڑھ کر

درد کا گلا گھونٹتی رہتی، اسے آپریشن اور دوائیوں کے پیسے کون دیتا؟

اگر ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے، نہیں بلکہ نہیں نو بج کر ۳۱ منٹ پر ڈائل کا سفر مکمل نہ ہوتا، اگر دوسری طرف "میں نواز شریف بول رہا ہوں" کی آواز نہ گونجتی، اگر کریڈل پر معصوم ہاتھ کی گرفت مضبوط نہ ہوتی، اگر اس کے کڑوے کسیلے منہ سے دہائی نہ نکلتی، اگر وہ پیلی زرد آنکھوں سے ٹپکتے آنسو گلے میں گرنے سے نہ روکتی، اگر وہ دو منٹ پورے ہونے سے پہلے اپنا دکھ نہ سنا چکتی، اگر وزیر اعظم "اس بچی کو فوراً لائیں" کا حکم جاری نہ فرماتے تو موت کی دہلیز پر کھڑی اس ثریا کا کیا بنتا، اس کا مسکین باپ کب تک ایکسرے تھام کر ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہسپتال کا فاصلہ ماپتا رہتا، خیرات کی دواؤں پر وہ کب تک زندہ رہتی، دعائیں پھونکیں اور تعویذ کب تک اس کی آس تھامے رکھتے، اسے آپریشن اور دوائیوں کے پیسے کون دیتا؟

اگر ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے قسمت اس پر مہربان نہ ہوتی، اگر اتفاقات کے سارے راستے اس کے گھر کی طرف نہ جاتے، اگر اس کی ساری منتیں، صدقے، دعائیں آسمانوں سے پلٹ کر نیچے نہ اترتیں، اگر اس کی خواہشیں، تمنائیں، آرزوئیں ساحل مراد سے نہ ٹکراتیں تو اس ننھی ثریا کا کیا بنتا، اس ثریا کا جس کا ملک کے ۸ سو ۶۵ ہسپتالوں کے پاس کوئی علاج نہیں تھا، جس کے لیے ۴ ہزار ۵ سو ۲۳ ڈسپنسریوں، ۵ ہزار ایک سو ۲۱ بنیادی مراکز صحت اور ۵ سو ۱۳ رورل ہیلتھ سنٹروں میں کوئی گولی، کوئی انجکشن، کوئی سیرپ نہیں تھا، جس کے لیے ۸۷ ہزار ۴ سو ۷ رجسٹرڈ ڈاکٹروں اور امراض قلب کے ایک ہزار ۴ سو ۱۰ ماہرین کے پاس کوئی وقت نہیں تھا، جس کے لیے صحت کے ۶۴ ارب ۶۶ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کے بجٹ سے ڈیڑھ لاکھ روپے نہیں تھے۔

جلا دینا چاہیے اس نظام کو، پھاڑ کر پھینک دینا چاہیے اس دستور کو اور دریا برد کر دینا چاہیے ان ضابطوں کو، جن کے ہوتے ہوئے ایک مریض کو دوا کے لیے وزیر اعظم سے رابطہ کرنا پڑے، جن کی موجودگی میں ۱۳ سال کی بچی کو سانس لینے کے لیے دس سال تک امید وبیم کے پل صراط پر چلنا پڑے، جس میں حقدار اپنے حق کے لیے ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے سے نو بج کر ۴۵ منٹ تک ٹیلی فون کا محتاج ہو...... اگر وزیر اعظم فارغ ہوئے، ٹیلی فون بحال رہا، بروقت اطلاع مل گئی، رابطہ ہو گیا، "السلام ...... میں" کی آواز آگئی تو بیڑے پار، آواز نہ آئی، رابطہ نہ ہوا، اطلاع نہ ملی، نظام درست نہ رہا، اور ٹیلی فون دستیاب نہ ہوا تو پھر وہی اندھیری رات، وہی ذلت، وہی بیماری، وہی اذیت۔

یہ ثریا، وفاقی کالونی لاہور کی یہ ۱۳ سالہ ثریا، دو ہزار پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ لینے والے پی ڈبلیو ڈی کے ڈرائیور کی یہ بیمار ثریا، تعویذوں اور پھونکوں سے دل کا سوراخ بھرنے والی یہ ثریا، اس نظام سے سوال کرتی ہے، ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے ماڈل ٹاؤن سے جن ثریاؤں کے رابطے نہ ہو سکے، ان کے دکھوں کا علاج کون کرے گا، انہیں آپریشن اور دوائیوں کے پیسے کون دے گا، ان کا نواز شریف کب آئے گا؟

بندر آنکھیں مانگتا ہے

میں بہت سونے والا شخص ہوں، اگر کوئی پریشانی، اندیشہ یا ضروری کام نہ ہو تو میں مسلسل چودہ پندرہ گھنٹے سو سکتا ہوں، اس دائمی عادت کے باعث میرے احباب مجھے ''بحر الکاہل'' کہتے ہیں لیکن پچھلے دو ہفتوں سے میری نیند اچانک کم ہو گئی، میں گھنٹوں کروٹیں بدلتا ہوں، بستر تبدیل کرتا ہوں، نیند آور گولیاں کھاتا ہوں، آٹو سجیشن کے ذریعے خود کو نیند کی افادیت سمجھاتا ہوں لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود بمشکل دو گھنٹے سو پاتا ہوں، اس کچی پکی نیند میں بھی ہر دس منٹ بعد میری آنکھ کھل جاتی ہے، میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں، سرہانے کے نیچے ہاتھ مارتا ہوں، ٹٹول کر اخباری کاغذ کا وہ ٹکڑا نکالتا ہوں، آنکھیں مل مل کر اسے دیکھتا ہوں، زاویے بدل بدل کر گدلے میلے کاغذ پر چھپی بندر کی تصویر دیکھتا ہوں، مجھے یہ تصویر ہر بار اپنی آنکھیں واپس مانگتی محسوس ہوتی ہے، اس کے پپوٹوں کی خراشیں، اس کے چہرے کا کرب اور اس کی ڈھلکی گردن کا دکھ اس طرح چیختا چلاتا اور سوال کرتا دکھائی دیتا ہے۔

یہ تصویر دو ہفتے قبل ایک انگریزی روزنامے میں چھپی تھی میرے بیٹے نے اسے کاٹ کر میری رائیٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا، میں اسے ایک مذاق سمجھا۔ میرا بیٹا اکثر اخبارات سے جانوروں کی تصویریں کاٹ کر ان کے اوپر ''یہ آپ ہیں'' لکھ کر میری ٹیبل پر رکھ دیتا ہے، میں کاغذ کے اس ٹکڑے کو مسکرا کر ٹوکری میں پھینکنے لگا لیکن پھر اچانک میری نظر کیپشن پر پڑی، لکھا تھا ''فیصل آباد سے ۵۴ کلومیٹر دور آباد قصبے سمندری میں ایک دوکاندار نے بیسیوں لوگوں کی موجودگی میں برف توڑنے والے سوئے سے اپنے اس پالتو بندر کی دونوں آنکھیں نکال دیں، بندر نے دوکاندار کے چھوٹے بیٹے کو لاڈ میں پنجہ مار دیا تھا'' میں نے اخبار کا تراشہ ٹوکری میں پھینکنے کی بجائے سرہانے کے نیچے رکھ لیا بس یہی میری غلطی تھی کیونکہ اس کے بعد میری آنکھیں نیند، میرا دماغ چین اور میرا جسم آرام کو ترس گیا، میں کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تو مجھے گوشت، ترکاری، آملیٹ سے تازہ خون کی بو آنے لگتی ہے، میں اخبار کھولتا ہوں تو ہر لفظ آنکھ بن جاتا ہے، میں کتاب اٹھاتا ہوں تو ہر ورق پر ڈھیلے بچھے نظر آتے ہیں، میں باہر جاتا ہوں تو مجھے ہر گزرنے والا شخص آنکھیں مانگتا دکھائی دیتا ہے، میں سونے لگتا ہوں تو ایک چھوٹا سا بندر سرہانے کے نیچے سے کھسک کر باہر آ جاتا ہے، میرے چہرے سے کمبل سرکاتا ہے، میری ناک نوچتا

ہے، میری گال تھپتھپاتا ہے، میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں، آنکھیں مل کر دیکھتا ہوں، بندر میری اکھڑی سانس اور بے چینی، بے ترتیب کروٹیں محسوس کرتا ہے اور اپنے دکھتے پپوٹے سہلا کر بھکاریوں کی طرح دونوں ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیتا ہے مجھے اس کی چھوٹی سی ہتھیلیوں پر خون کے چند قطرے اور سینکڑوں چیختے چلاتے سوال رکھے نظر آتے ہیں۔

مجھ سے بندر پوچھتا ہے، میرا جرم کیا تھا، مجھے زنجیر میں باندھ کر دوکان کے تھڑے پر کیوں بٹھا دیا گیا، آواز دے کر لوگ کیوں جمع کیے گئے، برف توڑنے والا سوا میرے سامنے کیوں لہرایا گیا، میری گردن جکڑ کر آہنی سوا میری آنکھوں میں کیوں اتار دیا گیا، میری آنکھ سے لہو کے ابلتے فوارے پر قہقہہ کیوں لگایا گیا، سوا کھینچ کر باہر کیوں نکالا گیا، دوبارہ کیوں لہرایا گیا، میری دوسری آنکھ میں کیوں پرویا گیا، مجھ سے بندر پوچھتا ہے انسانوں کے اس جنگل میں میرا فیصلہ کون کرے گا، میرا منصف کون ہوگا، میری عدالت کہاں لگے گی، میرا جج، میرا وکیل، میری مسل، میرا مقدمہ، میرا ہرکارہ، میرا ریڈر کہاں ہے، میرا احتجاج کہاں ریکارڈ ہوگا، میری آواز کون سنے گا، میری زنجیر عدل کہاں نصب ہے، میرا جہانگیر، میرا نواز شریف کہاں ہے، مجھ سے بندر پوچھتا ہے، مجھے میری آنکھیں کون لوٹائے گا، میری خاموشی، میری بے زبانی کو زبان کون دے گا، انسانوں کے اس جنگل میں میری ترجمانی کون کرے گا۔

رات کے آخری پہر، کہر میں لپٹی رات کے آخری پہر، میں نے کئی بار سوچا، میں ہاتھ آگے بڑھا کر بندر کے پپوٹوں پر انگلیاں پھیروں، اس کے زخم سہلاؤں، اس کی ٹھوڑی ذرا سی اوپر اٹھاؤں، چٹکی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کروں، جب اس کا چہرہ احساسات کی گرمی سے پگھلنے لگے تو میں اسے مخاطب کر کے کہوں، ”دوست افسوس میں تمہارا مقدمہ نہیں لڑ سکتا کیونکہ تمہاری آنکھیں اس معاشرے نے چھینی ہیں جو برسوں پہلے خود اپنی آنکھیں، اپنی سماعت، اپنا ضمیر دوسروں کے ہاتھ گروی رکھ چکا تھا جو اب صرف ڈالر کی چمک دیکھتا اور پاؤنڈ کی آواز سنتا ہے، جہاں اب صرف اندھے اور بہرے لوگ بستے ہیں، ہاں دوست یہ لوگ تمہیں کچھ نہیں دے سکتے ان میں ایک بھی ایسا اہل نظر اور صاحب زبان نہیں جو تمہارا دکھ دیکھ سکے، جو تمہارا درد سن سکے، جاؤ چلے جاؤ، اس ہستی کے حضور چلے جاؤ جہاں کسی بے زبان کی بددعا بے زبان نہیں رہتی، جہاں ہر مظلوم اور ہر ظالم، ظالم ہوتا ہے، جہاں سارے زخم بولتے اور ساری چیخیں گواہی دیتی ہیں، چلے جاؤ یہاں سے چلے جاؤ یہاں تمہیں کچھ نہیں ملے گا، یہ اندھوں کا شہر ہے، یہاں تمہیں آئینوں کا کوئی خریدار نہیں ملے گا، یہ بہروں کا ملک ہے یہاں تمہارے درد کی ڈفلی کوئی نہیں سنے گا۔“

یزید کے دور میں حسینؓ کی ضرورت

موت سے ایک لمحہ پہلے جب اس کی نیلی، خشک اور سوجی ہوئی زبان منہ سے باہر لٹک رہی تھی، گردن کی ساری رگیں پھول کر رسیاں بن چکی تھیں، چہرے پر خون کے سانپ رینگ رہے تھے اور وحشی دیدے ابل کر پپوٹوں سے باہر جھانک رہے تھے تو سانس کا ایک قطرہ پھٹتے ہوئے پیٹ سے اٹھا اور مردہ رگوں میں بجلی کی طرح دوڑتا ہوا لہو سے بھری ناک میں آ کر ٹھہر گیا، اس نے دکھ میں لتھڑی ہوئی ہچکی لی اور جمشید کوارٹر کا وہ تھانہ اس کی بے نور پتلیوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔

روح نے ایک لمبی انگڑائی لی اور کچلے ہوئے وجود سے باہر آ کر اپنا آپ ٹٹولنے لگی، سامنے محرر کی کرسی کے بالکل اوپر بانی پاکستان کی تصویر آویزاں تھی۔ روح نے ہاتھ اٹھایا اور قائد کا دامن پکڑ کر بولی: ''نانا جی میرا کیا قصور تھا، میں تو گھر سے پراٹھے خریدنے نکلا تھا، مجھے کیا معلوم تھا آپ کی پولیس کے نزدیک پراٹھے خریدنے کی سزا موت ہوتی ہے۔ نانا جی انہوں نے مجھے بہت مارا، میری ٹانگیں ٹوٹ گئیں، میرے گردے ناکارہ ہو گئے، میری بینائی چلی گئی، میرا پیٹ پھٹ گیا اور میری ریڑھ کی ہڈی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، نانا جی میں نے انہیں بار بار آپ کا واسطہ دیا، رو رو کر گڑگڑا کر ان سے کہا، میں قائداعظم کا پڑنواسہ ہوں، مجھ پر رحم کرو، لیکن نانا جی ان کے نزدیک تو آپ سے نسبت پراٹھے خریدنے سے بھی بڑا جرم تھا۔''

اور جب یہ کٹی پھٹی اور کچلی لاش جہانگیر روڈ کی کچی آبادی کے مکان میں پہنچی تو قائداعظم کی نواسی نے اس کا ماتھا چوم کر کہا: ''میرا اسکندر تو نانا جی کی ہو بہو نقل تھا، ایک کو نکالو تو دوسرے کو چھپا لو، رات کو جب پورا شہر سو جاتا تھا تو میرا بیٹا بلب پر لفافہ چڑھا کر پڑھنے لگتا تھا، میں اس سے کہتی تھی سکندر بیٹا، سو جاؤ رات بہت گزر چکی ہے تو وہ کہتا اماں اگر میں بھی سو گیا تو قوم کو کون جگائے گا، ہائے میرا بچہ قوم کو جگاتے جگاتے خود ہی سو گیا۔''

اور جب لاش کے بوڑھے باپ نے اس کی سوجی ہوئی خشک زبان دیکھی تو وہ رگوں کی رسیوں میں جکڑی گردن پر ہاتھ پھیر کر بولا: ''میں اپنے بیٹے کو عظیم انسان بنانا چاہتا تھا، میں چاہتا تھا جب یہ گھر سے نکلے تو لوگ رک رک کر کہیں: ''دیکھو یہ نوجوان جس کی آنکھوں میں ذہانت بجلی بن کر دوڑتی ہے اور جس کے باریک ہونٹوں پر دلیلیں اشارے کی منتظر رہتی ہیں اور جو قد کاٹھ میں رنگ روپ میں، چال ڈھال میں قائداعظم جیسا

ہے، محمد علی جناح کا پڑنواسہ ہے، ان کے بھائی کی بیٹی کا بیٹا ہے، ہاں میں چاہتا تھا میرا یہ بیٹا میری بجائے جناح خاندان کی نسبت سے پہچانا جائے لہٰذا میں سردیوں کے یخ سویروں اور آگ برساتی گرم دوپہروں میں پیوند لگے کپڑوں میں، پاؤں میں گھسی ہوئی ہوائی چپل پہن کر اس نامراد شہر میں پلاسٹک کے شاپنگ بیگ بیچتا رہا، لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کو تعلیم دلاتا رہا کہ میں اس فراموش کردہ خاندان میں ایک اور قائد چاہتا تھا۔''

اور جب لوگ لاش کے بگڑے ہوئے چہرے پر خون کے جمے ہوئے سانپ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تو ایک ہمسائے نے چیخ کر کہا: ''جب اس گھر میں محمود علی آئے تھے تو قائداعظم کی اس نواسی نے ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کہا تھا، ہمیں کچھ نہیں چاہیے، نہ مکان، نہ نوکری اور نہ ہی وظیفہ، بس ہمارے بچے کی تعلیم کا بندوبست کر دیں، بس ہمیں ہمارے خواب کی تعبیر کے راستے پر کھڑا کر دیں۔'' تو محمود علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، انہوں نے بچے کو قریب بلایا، اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور پھر خورشید بہن کو مخاطب کر کے بولے: ''بہن بدقسمتی دیکھیں، ہم آج جس عظیم شخص کی دی ہوئی زمین پر سینہ پھلا کر کھڑے ہیں، اسی کی نواسی اپنے بچے کی تعلیم کے لیے میرے جیسے گنہگار کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے، نہیں بہن ہم لوگ اگر آپ لوگوں کے پاؤں دھو دھو کر پیتے رہیں تو بھی آپ کے خاندان کے احسانات کا بدلہ نہیں اتار سکتے...... یہ بچہ ضرور پڑھے گا، ہر قیمت پر پڑھے گا کہ اس ملک پر اگر کسی بچے کا حق بنتا ہے، تو وہ صرف یہی بچہ ہے۔''

اور لاش کے ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے دیدوں پر نظر گری تو دوسرے ہمسائے نے سسک کر کہا: ''ابھی پچھلے ہی مہینے کی بات ہے، سکندر علی جناح، قائداعظم کی سالگرہ منانے مزار قائد پر گیا تو واپسی پر مرجھائی ہوئی پتیاں سمیٹ لایا، میں نے پوچھا: ''سکندر یہ کیا ہے؟'' ہنس کر بولا: ''چچا یہ نانا جی کی قبر کی پتیاں ہیں، دیکھو مرجھا کر بھی خوشبو دے رہی ہیں۔'' میں نے قہقہہ لگایا اور پوچھا: ''پر تم ان کا کرو گے کیا؟'' تو بڑی سنجیدگی سے بولا: ''میں انہیں اپنی کتابوں میں رکھوں گا، سنا ہے بزرگوں کی قبروں کی پتیاں کتابوں میں رکھنے سے علم سے لگن بڑھتی ہے، آنکھوں کی روشنی تیز ہوتی ہے، انگلیوں سے خوشبو آتی ہے۔''

اور جب لاش کے پھٹے ہوئے پیٹ پر نظر پڑی تو ایک ہمسائی سے چیخ ضبط نہ ہو سکی اور وہ بین کرتی ہوئی بولی: ''آہ! ظالموں نے میرے قائد کی آخری نشانی بھی مٹا ڈالی، لوگ تو نسبتوں کے احترام میں ولیوں کے بدکردار نواسوں تک کے ہاتھ چومتے رہتے ہیں لیکن ان بدبختوں نے نیک انسان کے نیک نواسے ہی کو مٹا ڈالا۔''

اور جب یہ لاش ایک کمرے کے بوسیدہ مکان سے نکل کر قبرستان پہنچی تو لوگوں نے گورکن سے کہا: ''اس لاش کی پائنتی میں ایک قبر اور کھودنا کہ ہم اس میں ایک نعرہ، ایک جھنڈا اور ایک ترانہ دفن کرنا چاہتے ہیں، اپنے خواب، آبرومندانہ زندگی کی خواہش اور عزت نفس سے بھرپور مستقبل کے ارمان دفن کرنا چاہتے ہیں۔ آخر ہم کب تک اپنے نظریوں کی نعشیں اٹھائے پھریں گے۔ گورکن نے گینتی اور بیلچہ پرے پھینکا اور پھر

آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر بولا: ''تم لوگوں کا خیال ہے ابھی ترانہ جھنڈا اور نعرہ زندہ ہے، نہیں ہرگز نہیں، اس قبرستان کی ہر قبر کی پائنتی میں ایک اور قبر ہے جس میں سارے سنہرے خواب، ساری کھنکتی خواہشیں اور سارے چمکتے ارمان دفن ہیں، یہ قبریں انسانوں کی نہیں خوابوں اور نظریوں کی ہیں...... خدا کی قسم اگر نظریے اور خواب زندہ ہوتے تو کیا سکندر علی جناح کی یہ لاش ہر ایک سے اپنا جرم پوچھتی پھرتی۔''

اور گمان یہ کہتا ہے جب یہ چمکتی، دمکتی اور مہکتی لاش بارگاہ رسالت ﷺ میں پہنچی ہوگی تو محبوب خدا نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا ہوگا، اسے سینے سے لگایا ہوگا، اس کا ماتھا چوما ہوگا، اس کی سوجی ہوئی زبان پر انگشت مبارک پھیری ہوگی، اپنے دست مبارک سے اس کی گردن کی ساری سلوٹیں صاف کی ہوں گی، آنکھوں پر پھونک مار کر اذیت کے سارے نشان مٹائے ہوں گے اور پھر اپنی نظر مبارک سے لاش کے سارے چیختے چلاتے شکوے دھو کر آگے پیچھے دیکھا ہوگا اور پھر ہجوم سے پوچھا ہوگا: ''محمد علی کہاں ہے؟'' قائداعظم فوراً لوگوں کو چیر کر سامنے آ کھڑے ہوئے ہوں گے، آپ ﷺ انہیں دیکھ کر مسکرائے ہوں گے اور پھر کندھے پر ہاتھ رکھ کر مہکتے لہجے میں فرمایا ہوگا: ''محمد علی تم اپنے حسین سے نہیں ملو گے، دیکھو آج اس پر کتنا روپ ہے۔'' قائدؒ نے ادب سے سر جھکایا ہوگا، آنکھیں نیچی کی ہوں گی اور پھر عرض کیا ہوگا ''یا رسول اللہ ﷺ میرا حسین مجھ سے پوچھتا تھا، نانا جی آخر مجھے کیوں قتل کیا گیا؟'' حضور ﷺ نے یہ سن کر تبسم کیا ہوگا اور پھر قائد سے مخاطب ہو کر فرمایا ہوگا:

''محمد علی تم اس سے کیوں نہیں کہہ دیتے یزیدوں کے دور میں حسینوں کی ضرورت نہیں رہا کرتی۔''

موہنجوداڑو میں زندگی کی تلاش

ملاقاتیوں کی فہرست میں ایک نام دیکھ کر جنرل ضیاء الحق کا رنگ سرخ ہو جاتا تھا، چہرے پر پسینہ آ جاتا تھا اور وہ غصے اور نفرت سے اس نام پر اتنی بار قلم پھیرتے تھے کہ کاغذ پھٹ جاتا تھا اور اگر کبھی کسی میٹنگ، کسی اجتماع یا کسی تقریب میں ان کا سامنا اس ''ذات شریف'' سے ہو جاتا تو مرحوم صدر ملاقات سے پرہیز کرتے تھے اور یہ بھی دیکھا گیا کہ اگر کبھی انتہائی مجبوری میں جنرل کو ''ان'' سے ہاتھ ملانا پڑ جاتا تو انہوں نے خلاف معمول ہاتھ فوراً واپس کھینچ لیا، یہ طرز عمل صدر کے مزاج شناس ساتھیوں کے لیے پریشان کن تھا، لہٰذا وہ معاملے کی ٹوہ میں لگ گئے، لیکن انہیں بری طرح ناکامی ہوئی کیونکہ اس شخص کا نام سنتے ہی صدر کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا، مخاطب کو غصے سے دیکھتے تھے اور فائل میز پر پٹخ کر کہتے تھے ''کیا آپ کوئی اچھی بات نہیں کر سکتے؟'' اور مخاطب سہم کر فوراً باہر نکل جاتا۔

ایک روز جب مرحوم انتہائی خوشگوار موڈ میں ٹہل رہے تھے تو جنرل رفاقت نے محتاط انداز سے بلوچستان کی سیاست کا ذکر چھیڑ دیا، صدر مسکرائے اور اپنے مخصوص انداز میں قبائلی سرداروں کے چٹکلے سنانے لگے، جب گفتگو خوب رواں ہو گئی تو جنرل رفاقت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: ''آپ جام صاحب سے اتنا انائیڈ کیوں ہیں؟'' یہ سنتے ہی مرحوم کا رنگ سرخ ہو گیا، غصے سے سانس چڑھ گیا اور قدم وہیں رک گئے۔ انہوں نے جنرل رفاقت کو گھور کر دیکھا اور پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولے: ''رفاقت مجھے معلوم ہے، آپ لوگوں کو میرا بدلا ہوا رویہ اچھا نہیں لگ رہا لیکن میں کیا کروں، جب بھی یہ شخص میرے سامنے آتا ہے میرا جی چاہتا ہے میں اس کا خون پی جاؤں، اس کی بوٹی بوٹی الگ کر دوں لیکن میں مجبور ہوں۔'' جنرل رکے ایک لمبا سانس لیا اور بھاری قدموں سے چلتے ہوئے لان چیئر پر ڈھیر ہو گئے۔ جنرل رفاقت مغموم سے ہو کر سامنے کھڑے ہو گئے، جنرل ضیاء نے ان کی طرف دیکھا اور چہرے پر تاسف، دکھ اور اذیت میں ڈوبی مسکراہٹ سجا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا، جنرل رفاقت فوراً جھکے اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ مرحوم صدر چند لمحوں تک اپنی پھولی ہوئی کنپٹی شہادت کی انگلی سے سہلاتے رہے، جب سانس کچھ ٹھنڈی ہوئی اور چہرے کی حدت میں کچھ کمی واقع ہوئی تو وہ تھکی تھکی آواز میں بولے:

''رفاقت ایک روز جب میں آفس سے گھر لوٹا تو آپریٹر نے سامنے ٹیلیفون پیغامات رکھ کر کہا ''سر کوئی لڑکی صبح سے فون کر رہی ہے، آواز سے بہت پریشان محسوس ہوتی ہے۔'' میں نے لڑکی کا نمبر پوچھا تو آپریٹر نے بتایا، وہ کسی پی سی او سے بات کر رہی تھی، میں نے پیغامات کی شیٹ واپس کی اور آپریٹر کو ہدایت کی اب اگر اس لڑکی کا فون آئے تو میں جہاں بھی ہوں میری اس سے فوراً بات کرائی جائے، آپریٹر سلیوٹ کر کے چلا گیا۔ خوش قسمتی سے آدھ گھنٹے بعد ہی اس بچی کا فون آگیا، میری آواز سنتے ہی لڑکی نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا، میں پریشان ہوگیا، میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے بات ہی نہیں نکل رہی تھی۔ آخر میں نے اس لڑکی سے کہا: ''بیٹا آپ ایک منٹ کے لیے پی سی او کے مالک کو فون دیں۔'' لڑکی نے اضطراری کیفیت میں ریسیور قریب کھڑے شخص کو پکڑا دیا، میں نے اس سے پی سی او کی لوکیشن پوچھی اور اسی وقت ڈرائیور بھیج کر لڑکی کو ایوان صدر بلا لیا، رفاقت تم اندازہ نہیں کر سکتے اس بچی کی کہانی کتنی ہولناک تھی۔ وہ لڑکی بہت ہی غریب تھی لیکن دن رات کی محنت سے ایف ایس سی کر گئی۔ میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے اپلائی کیا تو دو نمبروں سے رہ گئی۔ پھر کسی نے بتایا وزیر اعلیٰ کے پاس چند نشستیں ہیں اگر وہ چاہے تو اسے اپنے کوٹے سے داخلہ دلا سکتا ہے۔ بچی نے وزیر اعلیٰ تک اپروچ کی کوشش کی تو پتا چلا کوئٹہ میں اس سے ملاقات ناممکن ہے۔ ہاں البتہ جب وہ دورے پر اسلام آباد جائے تو بلوچستان ہاؤس میں ملاقات نسبتاً آسان ہوتی ہے۔ اب یہ لڑکی وزیر اعلیٰ کے دورہ اسلام آباد کا انتظار کرنے لگی، بدقسمتی سے ایک ہی ہفتے بعد وزیر اعلیٰ ''صاحب'' اسلام آباد آ گئے۔ یہ لڑکی بھی ادھار پکڑ کر اس کے پیچھے پیچھے یہاں پہنچ گئی۔ تھوڑی بہت کوشش سے بلوچستان ہاؤس میں اس کی ملاقات ''ان'' سے ہو گئی۔ وزیر اعلیٰ صاحب نے عرض سنی تو مسکرا کر بولے ''ہاں یہ تو کوئی کام ہی نہیں لیٹر پیڈ اور مہر اندر ہے، آؤ میرے ساتھ ابھی لکھ دیتا ہوں اور بچی اس بزرگ کے ساتھ اندر چلی گئی...... اور رفاقت اگر تم میری جگہ ہوتے، تم نے بھی خود اپنے ہاتھوں سے اس مظلوم بچی کے زخم دھوئے ہوتے، اس پر پٹیاں باندھی ہوتیں، اس بچی کو پہننے کے لیے اپنی بیٹی کے کپڑے دیئے ہوتے اگر میری ہی طرح تم نے بھی اس کے آنسو پونچھ کر کہا ہوتا'' بیٹے اپنے یہ پھٹے ہوئے کپڑے یہیں چھوڑ جانا کہ جب بھی وہ شخص تمہارے اس بوڑھے باپ کے سامنے آئے تو غصے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو جائیں، ہاں رفاقت اگر تم بھی اس تجربے سے گزرے ہوتے تو اس شخص کو دیکھ کر تمہارا خون بھی کبھی ٹھنڈا نہ رہتا، اسے دیکھ کر تم بھی اطمینان سے کافی نہ پی سکتے! تم بھی اس سے گپ نہ لگا سکتے!''

اس واقعے سے ٹھیک چودہ برس بعد ملتان کی ایک اور بنی بلو میں چند خواب باندھ کر اپنے محروم، پریشان اور بیروزگار بھائی کے لیے نوکری لینے اسلام آباد آئی تو راہبر اسے ایک وفاقی وزیر کے دفتر لے گئی، اسے نرم گداز اور خوشبودار صوفے پر بٹھایا اور ''میں وزیر صاحب کا پتا کرتی ہوں'' کا کہہ کر چلی گئی اور پھر چند لمحوں بعد جب ابھی بہاء الدین ذکریا یونیورسٹی کی اس سیدھی سادی طالبہ نے پوری طرح ڈیڑھ لاکھ روپے کا

فانوس بھی نہیں دیکھا تھا، انگلیوں سے لاکھوں روپے کے امپورٹڈ وال پیپر کا گداز بھی محسوس نہیں کیا تھا اور اپنے پاؤں تلے بچھے نرم و ملائم قالین کی حدت بھی جذب نہیں کی تھی کہ نوکری دینے والے آ گئے ''لیٹر پیڈ اور مہر تو اندر ہے'' والے دریا دل حکمران آ گئے اور پھر شاید ہی کسی کان نے اس بچی کی چیخیں سنی ہوں، اس کی آہوں، اس کی سسکیوں اور اس کی بددعاؤں پر کسی نے پلٹ کر دیکھا ہو؟ اور شاید ہی کسی کے دل نے ایک لمحے کے لیے رک کر سوچا ہو ''سنو یہ ایک گلے سڑے، بدبودار سماج کی آخری چیخ ہے'' شاید ہی کسی کے ضمیر نے دستک دے کر کہا ہو ''اس بستی میں ایک بھی شخص زندہ ہے تو آئے کہ کوفے میں زینب اکیلی کھڑی ہے......'' لیکن نہیں وہاں کوئی زنجیر عدل نہیں تھی، کسی کان میں حس سماعت نہیں تھی، کسی سینے میں دل نہیں تھا اور کسی وجود میں ضمیر نہیں تھا۔

جب یہ بچی اپنی خراشیں لیے اس شہر میں در بدر پھر رہی تھی، اپنی پتلی کمزور انگلیوں سے اپنا ریزہ ریزہ وجود چن رہی تھی، اپنے کھٹے دانتوں سے اپنے خوابوں کی گانٹھیں کھول رہی تھی تو کاش میری اس سے ملاقات ہو جاتی تو میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا ''میری بہن تم موئنجو داڑو میں زندگی تلاش کر رہی ہو، چھلنیوں سے پانی مانگ رہی ہو، دکانداروں کے ترازو کو انصاف کا پیمانہ سمجھ رہی ہو کہ اس ملک میں اب ہر وہ لڑکی فقط عورت ہے، جس کے خاندان میں کوئی ایم این اے نہیں، کوئی ایم پی اے اور کوئی وی آئی پی نہیں ہے''

ہاں اس بستی میں اب کوئی ایسا شخص نہیں جو اس بچی کو اپنے سامنے بٹھائے، اس کے زخم دھوئے، اس کی رستی ہوئی کلائیوں اور اس کی کٹی ہوئی جلد پر پٹیاں باندھے، اس کے آنسو پونچھے اور اسے اپنی بیٹی کے کپڑے دے کر کہے ''بیٹی اپنے پھٹے ہوئے کپڑے یہیں چھوڑ جانا'' ہاں ہاں اس شہر میں، اس ملک میں، اس ایوان صدر، اس وزیراعظم ہاؤس اور اس پارلیمنٹ میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جس کی بیٹی کے کپڑے اس بیٹی کو پورے آتے ہیں۔

ہاں جس کوفے کا ہر باسی بے حسی، بے شرمی اور بے غیرتی کے ہاتھ پر بیعت ہو چکا ہو، وہاں حسینؑ کی نعش کو کفن نہیں ملا کرتا، وہاں زینب کی چیخوں کو آواز نہیں ملا کرتی۔

بچے روٹی مانگتے تھے

اس ماں کو شہباز پور سے پنڈی گھیب تک ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا جو اس کے پانچ بچوں کی آنکھیں میں رچی بھوک پڑھ سکتا' تین دن کے خالی پیٹ کی آوازیں سن سکتا' احتجاج کرتی ہوئی نیلی نسیں دیکھ سکتا' چہروں پر پھیلی زردی محسوس کر سکتا...... ہاں ان بے حس لوگوں میں اسے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا' جو بارہ دن کے اس بچے کی آخری سانسیں گن سکتا' جس کے لیے ماں کی چھاتیوں میں دودھ کا ایک بھی قطرہ نہیں تھا۔

ہاں اس اینٹ اور گارے کے شہر کے بجری سے بنے لوگ کیسے اندازہ کر سکتے ہیں غربت میں ٹھٹھری اس ماں نے چھریاں کیسے تلاش کی ہوں گی' انہیں ریتی سے کیسے تیز کیا ہوگا' جب پرانے لوہے کی دھار نکھار رہی ہوگی تو وہ کتنی دیر تک اسے اپنے آنسو پلاتی رہی ہوگی' اس نے اپنے لرزتے کانپتے فیصلے کو فولاد کیسے بنایا ہوگا؟ اس نے صحن میں روٹی کے انتظار میں بیٹھی نو سالہ بچی کو کس زبان سے کہا ہوگا'' آؤ میں تمہیں روٹی کھلاتی ہوں۔'' اس نے بچی کو اندھیرے کمرے میں لٹا کر اس کے منہ پر کیسے ہاتھ رکھا ہوگا' ہاں اس نے اس معصوم بچی کے حلق پر چھری چلاتے ہوئے ممتا کا کلیجہ نکال کر کہاں رکھا ہوگا' پھر وہ گھر کے کسی کونے میں بھوک سے نڈھال پڑے دوسرے بچے کو کیسے اٹھا کر اندر لائی ہوگی اس نے اس کے حلق پر بھی چھری کیسے چلائی ہوگی' پھر تیسرا اور چوتھا بچہ...... اور ہاں آخر میں جب بارہ دن کا وہ بچہ' جو ابھی روشنی اور اندھیرے میں تمیز نہیں کر سکتا' اسے خون میں تر گرم چھری کا لمس کیسا محسوس ہوا ہوگا اور پھر وہ نصیبوں کی ماری ماں کیسے ویرانے میں گھٹنوں خشک آنکھوں سے اپنے شہید بچوں کا ماتم کرتی رہی ہوگی' کہ خالی پیٹ آنکھوں کو آنسوؤں کی اجازت بھی نہیں دیا کرتے اور جب اس ظالم اے ایس آئی نے اپنے فرعونی لہجے میں اس سے پوچھا ہوگا۔

'' او بدبخت عورت تم نے اپنے پانچ بچے کیوں ذبح کئے؟'' تو وہ ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کیسے بولی ہوگی۔'' کیا کرتی وہ مسلسل تین دن سے روٹی مانگ رہے تھے'' اور پھر پتھروں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے کیسے پھوٹے ہوں گے...... ہاں پنڈی گھیب کے بے حس لوگو!...... اور شہباز پور کی بنجر ماؤں کیا تم نے زندگی میں اتنی خوفناک بھوک دیکھی ہے کہ پڑوسن کے باورچی خانے سے اڑ کر آنے والی خوشبو تمہارے بچوں کے معدوں میں آگ لگا کر گزرتی ہو اور چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں تمہارے بچوں کی آنکھوں میں اداسی بچھا جاتا ہو'

نہیں کبھی نہیں' ورنہ پانچ بچے تمہارے اس کربلا میں یوں جان سے گزرتے؟

ہاں یہ وہی شہر ہے جس کے باسی نے اپنے بیٹے کی شادی پر دس لاکھ روپے کا کھانا کھلایا تھا۔ اسی شہر میں وہ حاجی صاحب رہتے ہیں جو جوار رحمت میں خوبصورت محل کے لیے ہر سال مسجد کو ہزاروں روپے چندہ دیتے ہیں۔ اسی شہر میں ایک بچے کے عقیقے پر ۲۰ دنبوں کی قربانی دی گئی تھی' اسی شہر کے ایک سردار کے پاس کروڑوں روپے کے اثاثے ہیں۔ اسی شہر کے شیخ روزانہ لاکھوں کا بزنس کرتے ہیں۔ اسی شہر کے بیوپاری لاکھوں ٹن غلہ خریدتے اور بیچتے ہیں' اسی شہر کی دکانوں پر روزانہ تازہ سبزیاں' رس دار پھل اور پلے ہوئے صحت مند جانوروں کا گوشت آتا ہے اور شام سے پہلے بک جاتا ہے' اسی شہر کے کتے اتنے موٹے' صحت مند اور پلے ہوئے ہیں کہ ان کی ٹانگیں اپنے ہی بوجھ تلے کانپتی ہیں' اسی شہر کی گلیوں سے بھکاری روزانہ تھیلے بھر بھر کر نکلتے ہیں' فراوانی رزق کے باعث اسی شہر کی فضا میں چیلیں اڑتی اور کوے منڈیروں پر بیٹھتے رہتے ہیں' اسی شہر کے باسیوں کے منہ پر ''چوہے اور بلیاں چین نہیں لینے دیتے۔'' کی شکائتیں رہتی ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو روز نئے استری شدہ کپڑے پہن کر باہر نکلتے ہیں اور نوٹ جن کی جیبوں سے جھانک جھانک کر اللہ کے فضل و کرم کی گواہی دیتے ہیں' لیکن یہی ہیں وہ لوگ' جن کی تمام تر دولت' دریا دلی اور فیاضی پانچ بھوکے بچے تک ان کی راہنمائی نہ کر سکی۔

ہاں مجھے یاد ہے کہ جب ایک درویش ہنستی گاتی بستی میں بھوکا سویا تو رزاق کائنات نے اس ساری بستی کا رزق ساکت کر دیا' فصلیں اجڑ گئیں' پھلوں کو کیڑا کھا گیا' درخت' پودے فنا ہو گئے' تھیلوں میں بند اناج بھربھری مٹی بن گیا۔ ان دیکھی بیماری سارے جانور چاٹ گئی' پانی کھارا ہو گیا' ماؤں کی چھاتیاں سوکھ گئیں۔ پھر وہ بستی مٹی کا ٹیلہ بن کر محفوظ ہو گئی جہاں سے گزرنے والا ہر جھونکا اپنے ساتھ عبرت کی تھوڑی سی راکھ اڑا لے جاتا ہے کہ شاید راستے میں پڑتی ہنستی گاتی بستیوں کو اس کی ضرورت پڑ جائے۔

اور مجھے یقین ہے شہباز پور کے کربلا میں بھوک کے شمر کے ہاتھوں مرنے والے یہ پانچ بچے اللہ کی نظر میں شہید ہیں اور خدا انہیں ابد تک قبروں میں رزق پہنچا کر زندہ رکھے گا کہ جب شہباز پور کے حاجی' شیخ اور سردار صاحب کی پکڑ ہو اور وہ خالق کائنات کا دامن تھام کر اپنا گناہ پوچھیں تو یہ شہید کھڑے ہو کر گواہی دے سکیں ''ہاں یہی ہیں وہ لوگ' جن کے باورچی خانے سے اڑتی خوشبو نے ماں کو ہمارے گلے پر چھری چلانے پر مجبور کر دیا تھا۔''

اور مجھے یہ بھی یقین ہے جب فرشتوں نے خالق کائنات سے پوچھا ہوگا یا باری تعالیٰ اتنا بڑا ظلم ہوا لیکن آپ نے اس بستی پر کوئی عذاب نازل نہیں فرمایا تو محسن انسانیت ﷺ کے رب نے کہا ہوگا۔

''جہاں بے حسی ہو وہاں کسی دوسرے عذاب کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

گدھوں کے شہر میں انسان کی موت

موت سے ذرا دیر پہلے اس نے آنکھیں گھما کر دیکھا' سامنے ہسپتال کی کینٹین کے بالکل سامنے پانی کا ڈرم دھرا تھا' جس کی ٹونٹی کی ناب سے پانی کی باریک لکیر اڑ کر دور گر رہی تھی اور اس سے پرے کینٹین کا حبشی نما موٹا' بھدا مالک سالن کے بڑے چمچ سے دیگچیوں پر بیٹھی مکھیاں اڑا رہا تھا اور وہاں بیسیوں لوگ تھے' سب کھا رہے تھے' سب پی رہے تھے اور سب قہقہے لگا رہے تھے' لیکن وہ...... ہاں اس نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوچا کیا میں بھی علی اصغر کی طرح فرات کے کنارے پیاسا ہی مر جاؤں گا اور جب حساب کے فرشتے آ کر میری دھندلائی آنکھوں میں جھانکیں گے تو انہیں پانی کی لکیر کے سوا کچھ نہیں ملے گا...... اور پھر اس نے اپنے اوپر جھکی بوڑھی نانی کو دیکھا جس کے چہرے پر شام غریباں کا دھواں اور آنکھوں میں کوفے کی ویرانیاں تھیں تو اس نے اپنے آپ سے پوچھا "کیا میں پہلی بار مر رہا ہوں۔

نہیں' ایک آواز اندر سے ابل کر باہر آئی' دس بار' پندرہ بار یا بیس بار میں تو کئی بار مرا ہوں۔ ہاں اس نے سوچا وہ ہر عید پر مرتا رہا جب اس کے سارے دوست نئے کپڑے پہن کر ہاتھوں میں "نئے نکور" نوٹ لے کر گھروں سے نکلتے تھے تو ان کے قہقہے اس کے دل میں چھید کر جاتے تھے اور موت تو اسے کئی بار کھلونوں کی دکانوں پر بھی آئی تھی جب شوکیسوں میں سجے ہاتھی' گینڈے اور بھالو دیکھ کر وہ رک جاتا تھا تو اس کی ماں کے بے چین قدم تیز ہو جاتے تھے اور وہ ٹھیلوں والوں کی ان آوازوں پر بھی تو مرتا رہا جو روز ان کی گلی میں آ کر صدا لگاتے تھے اور وہ خیال ہی خیال میں کبھی ٹھنڈے میٹھے گولے چوستا' کبھی کرچ کرچ خستہ مرونڈا کھاتا اور کبھی نرم ملائم برفی کی ڈلیاں اس کے حلق میں گھل جاتیں...... ہاں اس نے سوچا یہ موت ان موتوں سے زیادہ سفاک تو نہیں۔

اور پھر وہاں صفائی کا وقت ہو گیا' ہسپتال کے سارے خاکروب جھاڑو اور ٹاکیاں لے کر نکل آئے۔ ایک جمعدار نے مور کی دم جیسا جھاڑو ہوا میں لہرایا اور پاس کھڑے ٹاکی بردار سویپر سے بولا "یہ بچہ مرتا ہے اور نہ ہی مائی یہاں سے جاتی ہے دیکھو خون سے سارا فرش گندا کر دیا۔ اگر صاحب راؤنڈ پر آ گئے تو بے عزتی تو ہماری ہی ہو گی نا۔" ٹاکی بردار نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "چلو اس مائی کی چھٹی کرائیں۔"

دونوں چلتے ہوئے آخری سانسیں لیتے بچے کے قریب آئے اور بوڑھی نانی سے مخاطب ہو کر بولے "بڑی اماں تمہیں کتنی بار سمجھایا ڈاکٹر صاحب میٹنگ میں ہیں تم اسے کسی پرائیوٹ ہسپتال میں کیوں نہیں لے

جاتی' اس کی جان کی دشمن کیوں بنی ہو۔"

اس نے خالی آنکھوں سے اوپر کھڑے خاکروبوں کو دیکھا اور سوچا کیا موت کے فرشتے ایسے ہوتے ہیں' بھدے' بدبودار اور گندے...... نہیں اس کے اندر سے آواز آئی' فرشتے تو نور ہی نور ہوتے ہیں' ان کے پروں سے بھینی بھینی خوشبوئیں نکلتی ہیں اور ان کے لبادوں سے نرم اور ٹھنڈی روشنیاں پھوٹتی ہیں تو پھر وہ کہاں ہیں' اس نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں اور ساتھ ہی کانوں میں آوازوں کا ہجوم ٹھٹک کر رک گیا' اس نے ایک لمبی ہچکی لی اور ہسپتال کے کوریڈور میں گونجتی ہوئی چیخ کے ساتھ ساری روشنیاں بجھ گئیں' اب امن ہی امن تھا' سکون ہی سکون اور باہر پرائیوٹ ایمبولینس کے ڈرائیور نے اپنے ساتھی سے پوچھا" بڑھیا کے کھیسے میں کچھ ہے بھی یا نہیں۔"

چھوٹے نے ٹاکی سے ہاتھ صاف کئے اور بولا" استاد اگر اس کے پاس پیسے ہوتے تو وہ بچہ کسی ڈاکٹر کو نہ دکھا لیتی۔ بیچارہ یوں ہسپتال کے فرش پر تو نہ مرتا۔" استاد نے نفرت سے گردن کو جھٹکا دیا اور گاڑی سٹارٹ کر کے وہاں سے فرار ہو گیا۔

اور وہاں لاش پر مجمع لگا تھا نادار' غریب اور بے بس لوگوں کا مجمع سب تاسف سے ہاتھ مل رہے تھے' سب قاتل ڈرائیوروں کو گالیاں دے رہے تھے۔ سب دبے دبے لفظوں میں ہسپتال کی انتظامیہ کو کوس رہے تھے' لیکن وہاں لاش کو گھر پہنچانے والا کوئی نہ تھا۔ بوڑھی نانی کے بازو میں اتنی طاقت کہ وہ حسین کو اٹھا کر ملتان کی تنگ گلیوں میں راستہ تلاش کرتی' مکھیوں نے سوچا ہم ہی اس ننھی لاش کو کفن دیں کہ کفن کے بغیر لاشیں برہنہ ہوتی ہیں۔

اور ذرا دور سٹور میں درجنوں نئے سٹریچر پڑے تھے لیکن سٹور کیپر کو انہیں باہر نکالنے کی اجازت نہیں تھی ایمرجنسی میں نصف درجن بیڈ خالی تھے لیکن الاٹ کرنے والا کلرک کھانا کھانے گیا تھا۔ فریج میں خون کی بوتلیں اور زندگی بچانے والے سینکڑوں انجکشن تھے لیکن ڈاکٹر صاحب میٹنگ میں تھے...... اور وہاں کینٹین کے ڈرم کی ٹونٹی سے پانی کی لکیر اڑ کر ذرا دور گر رہی تھی' موت کھلونوں کا طواف کر رہی تھی اور سڑکوں پر ڈرائیوروں کی ریس ابھی تک جاری تھی۔

لیکن مکھیوں کے کفن میں چھپی لاش چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی' جہاں احساس نہیں ہوتا وہاں انسان نہیں گدھ بستے ہیں اور گدھوں کے شہر میں انسانوں کو مر ہی جانا چاہیے۔

مجھے یقین ہے حساب کے فرشتے جب یہ ننھی سی لاش اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کریں گے تو خالق کائنات کا دامن تھام کر ضرور کہیں گے" یا باری تعالیٰ آپ اجازت دیں تو مردہ ضمیروں کے اس شہر کو قبرستان بنا دیں۔"

تو باری تعالیٰ مسکرا کر کہیں گے" نہیں شہروں کو قبرستان بنانا فرشتوں کا نہیں انسانوں کا کام ہے۔"

(یہ کالم ملتان کے ایک اخبار میں شائع ہونے والی اس تصویر سے متاثر ہو کر لکھا گیا جس میں ایک بوڑھی خاتون ہسپتال کے فرش پر پڑی دس سالہ بچے کی لاش کے قریب بیٹھی ہے۔)

خودکشی

میں نے اپنے دوست کی گاڑی میں ایک عورت کو دیکھا اور میری کنپٹیوں میں آگ لگ گئی۔

ایک سال پہلے تک جب یہ عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ ہمارے گھر آتی تھی تو اس کی مقناطیسی آنکھوں میں محرومی اور آرزو کی کانٹوں جیسے ہونٹوں پر مہنگائی کے شکوے ہوتے تھے' وہ چائے پیتے ہوئے اکثر میری بیوی سے پوچھتی تھی "باجی آپ نے یہ کپ کتنے میں خریدے؟" اور میری بیوی اکثر اس کی بات سنی ان سنی کر دیتی تھی اس کے بچوں کی آنکھیں کھلونے اور کپڑے دیکھ کر مدہم پڑ جاتی تھیں' وہ جب کبھی اکیلے ہمارے گھر آتے تو مجھے مخاطب کر کے کہتے "انکل جب ہمارے پاس ایک ہزار روپے جمع ہو جائیں گے تو آپ ہمیں سائیکل لا دیں گے" تو "امارات" کے ایک گہرے احساس کے ساتھ میرا سینہ پھول جاتا اور میں لہجے میں ایک مصنوعی جذبہ ترحم لا کر ان سے پوچھتا "آپ لوگوں کے پاس اب کتنے پیسے ہیں؟" وہ گہرے دکھ سے جواب دیتے "اڑھائی سو روپے۔" اور میں انہیں ایک کھوکھلی سی تشفی دیتے ہوئے کہتا "چلو کوئی بات نہیں ہزار روپے جمع ہوتے ہوئے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟" ...... اور ہر صبح جب میں دفتر کے لیے نکلنے لگتا تو میری بیوی مجھے روک کر کہتی ...... "اگر ہم ان بچوں کو سائیکل لے دیں تو کیا حرج ہے؟" تو میں موٹر سائیکل پر ٹا کی مارتے ہوئے کہتا "بے وقوف عورت تم ان بچوں کو بھکاری بنانا چاہتی ہو آج یہ ہم سے سائیکل لیں گے تو کل کوئی خواہش انہیں کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دے گی۔" اور "بے وقوف" عورت قائل سی ہو کر گردن ہلا دیتی لیکن پتہ نہیں یہ دلیل دیتے وقت میں اپنی بیوی سے آنکھیں کیوں چراتا تھا؟

اور اس عورت کا خاوند ...... وقت بہت پہلے جس کی کنپٹی پر چمکتا تھا اور دکھ جس کی آنکھوں میں بچھا رہتا تھا' کسی پرائیویٹ فرم میں ساڑھے تین ہزار پر ملازم تھا' اس کی آدھی تنخواہ مکان کے کرائے پر اٹھ جاتی تھی اور باقی چار افراد کے پیٹ کا ایندھن بن جاتی تھی لہذا کبھی سر ننگا اور کبھی پاؤں ...... اور جب کبھی میری بیوی نے مجھے اسے کوئی پارٹ ٹائم کام دلانے کا کہا میں "اچھا کچھ کرتے ہیں" کا گرز چلا کر کروٹ بدل کر سو گیا۔ میں اب سوچتا ہوں تو یاد پڑتا ہے' میں اگر اس شخص کے لیے کچھ کرنا چاہتا تو باآسانی کر سکتا تھا' میرے اپنے دفتر میں بڑی گنجائش تھی۔ میرا ایک وزیر دوست میرے اشارے کا منتظر تھا' ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا کنٹری منیجر میرا جاننے

والا تھا اور اگر میں چاہتا تو اپنے پاس روزانہ آنے والے لوگوں میں سے بھی کسی کو کہہ سکتا تھا...... لیکن میں نے کچھ نہیں کیا!...... پتہ نہیں کیوں نہیں کیا؟......

میری بیوی نے مجھے ان بچوں کو کسی اچھے سرکاری سکول میں داخل کرانے کے لیے بھی تو کہا تھا لیکن سیکرٹری تعلیم اور ڈائریکٹر سکولز سے روز ملاقات کے باوجود میں نے ذہانت سے لبریز ان بچوں کے لیے چھوٹے منہ سے سفارش کا ایک لفظ نہیں کہا' یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے ایک فقرے سے ان بچوں کا مقدر بدل سکتا ہے' روز جب دفتر سے واپسی پر میری بیوی مجھے دروازے پر روک کر پوچھتی "ان بچوں کے لئے کچھ ہوا؟" تو میں بڑے آرام سے کندھے اچکا کر کہتا "سیکرٹری کوئٹہ سے ہی واپس نہیں آیا" اور میری بیوی کی آنکھوں میں شک کی بجلیاں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑتے لگتیں اور میں خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے معمولی باتوں پر تلخ ہو جاتا اور وہ "بے وقوف" عورت پرائے بچوں کو بھول کر میری ناز برداری میں لگ جاتی اور میں نہایت مکاری سے دیواروں کو آنکھیں مارتا رہتا۔

لیکن آج جب میں نے اسے ایک "اوباش" دوست کی گاڑی میں بدن کے تیشے سے زندگی کی نہر کھودتے دیکھا تو نا جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا یہ عورت اب پیالیوں کی قیمت نہیں پوچھے گی' اب اسے مہنگائی کا شکوہ نہیں ہوگا۔ اب اس نے کسی کا قرض نہیں دینا ہوگا' اب مالک مکان اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر "نکلو باہر" کا نعرہ نہیں لگائے گا۔ اب گلی کی نکڑ کا دکاندار اس کا راستہ نہیں روکتا ہوگا' اب وہ ترکاری والے سے نہیں الجھے گی' اب اس کا خاوند گھی' پتی اور چینی ختم ہونے پر اسے نہیں مارے گا' اب اسے خاوند کی "پارٹ ٹائم" ملازمت کے لیے کسی کی منت نہیں کرنا پڑے گی' اب اسے بچوں کو سرکاری سکول میں داخل کرانے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔

اس کی خواب گاہ میں اب اے سی لگ جائے گا' اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر درجنوں خوشبویات ہوں گی' اس کی وارڈ روب کپڑوں اور جوتوں سے بھر جائے گی' اب اس کے پاس نت نئے زیورات ہوں گے...... اور ہاں اب اس کا خاوند سائیکل پر دفتر نہیں جائے گا' اب لوگ اسے "اوئے" کی بجائے ملک صاحب' سردار صاحب یا شیخ صاحب پکاریں گے' یہ لوگ اب کسی اچھی جگہ گھر لے لیں گے ان کے پورچ میں گاڑی کھڑی ہو جائے گی' گھر میں ملازم رکھ لیں گے...... اور یہ امر بھی قیاس کی حدوں سے دور نہیں کہ اب یہ لوگ کسی شاپنگ سنٹر میں کھڑے ہو کر یہ نکال دیں' یہ بھی پیک کر دیں' میرے لیے کوئی چیز لائے ہیں' نہیں یہ سٹائل تو بہت پرانا ہے' یہ رنگ اچھا ہے دے دیں' کتنا بل بنا' ہاں یہ پانچ سو روپے اس سیلز مین کو دے دیں' قسم کی گفتگو کریں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے اب یہ عورت درباروں پر حاضری دے' فقیروں میں سو دو روپے تقسیم کر کے درازی عمر اور وسعت رزق کی دعا کرائے' مسجد کو باقاعدگی سے چندہ دے' فلاحی اداروں کی خدمت کرے' غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرے۔

پھر میں نے سوچا کیا اس کے پاس اس کے علاوہ بھی کوئی راستہ تھا؟...... ''نہیں شاید نہیں' کوئی نہیں' محروم لوگوں کے پاس اپنے ہی بدنوں میں کود کر خودکشی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا......''۔

جن معاشروں میں انسانوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی وہاں جسم بہت قیمتی ہوتے ہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

یہ بات اچھی نہیں

''میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا' لوگوں نے ایک شخص کا منہ کالا کر کے اسے گدھے پر سوار کر رکھا تھا اور شہر کے بچے اس کے پیچھے پیچھے شور مچاتے جا رہے تھے' گدھے پر سوار شخص خاصا پریشان تھا' میں نے معاملہ پوچھا تو پتہ چلا کہ شخص چند روز قبل ایک لڑکی اغوا کر کے لے گیا تھا' آج محلے والوں کے قابو آ گیا تو انہوں نے اسے سزا دینے کے لیے منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا دیا اور اب اسے تھانے لے جا رہے ہیں' اگلے ہی روز میں نے پھر یہی منظر دیکھا لیکن اس بار ایک شخص گھوڑے پر سوار تھا' اس نے اپنا منہ ریشمی تاروں سے ڈھانپا ہوا تھا اور بہت سے بچے شور مچاتے ہوئے اس کے آگے آگے چل رہے تھے' میں نے اندازہ لگایا یہ شخص معاشرے میں قدرے برتر مقام کا حامل ہو گا تبھی اسے گدھے کی بجائے گھوڑے پر سوار کیا گیا نیز اسے یہ سہولت بھی دی گئی کہ وہ اپنا منہ ریشمی تاروں سے ڈھانپ لے' مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کیونکہ ایک جیسے جرم پر دو طرح کی سزائیں دینا تو عدل کے اصولوں کے منافی ہے۔''

یہ عطاء الحق قاسمی کی ایک ''منحنی'' سی تخلیق ''ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور'' کا ایک ''ٹوٹا'' ہے جس کے بارے میں میرا خیال ہے اگر عطاء الحق قاسمی آج سے دس پندرہ برس پہلے ہی لکھنے لکھانے سے تائب ہو جاتے تو بھی یہ سفرنامہ انہیں اردو ادب میں دو چار صدیوں تک زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا' آج سے ڈیڑھ دو برس پہلے جب میں نے ان سے اس سفرنامے کی ''وجہ تخلیق'' پوچھی تھی تو قاسمی صاحب نے اپنے سدا کے تر و تازہ لہجے میں جواب دیا ''جن دنوں پاکستان کا ہر ادیب شاعر اور دانشور یورپ کے جھوٹے سچے سفرنامے گھڑ رہا تھا تو میں نے سوچا کہ اگر کوئی غیر ملکی سیاح لاہور آئے' چند روز یہاں رہے اور واپسی پر اسے سفرنامہ لکھنے کی شہوت ہو تو وہ ہمارے بارے میں کیا لکھے گا بس یہ سوچنے کی دیر تھی پورا لاہور میری نظروں میں گھوم گیا اور میں نے عطاء الحق قاسمی کی جگہ ٹام بن کر یہ سفرنامہ لکھ مارا۔'' بہر حال ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور کی وجہ تخلیق کچھ بھی ہو' یہ عطاء الحق قاسمی نے قاسمی بن کر لکھا ہو یا ٹام' ڈک یا ہیری بن کر' یہ طے ہے پاکستانی معاشرے پر اس سے خوبصورت طنز' ہماری غیر فطری روایات پر اس سے بڑی پھبتی اور ہماری اجتماعی بیمار سوچ کا اس سے بڑا آپریشن آج تک ادب میں نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی ہو گا۔

آج صبح جب میں نے اخبار پڑھنے شروع کئے تو میں نے بھی ''ایک غیر ملکی سیاح کے سفرنامہ لاہور'' کے ''مصنف'' کی طرح ایک عجیب وغریب منظر دیکھا' ایک معاصر اخبار کے صفحہ اول پر ایک گدھا گاڑی کی تصویر چھپی تھی' گاڑی کا مالک گدھے کی پشت پر ہاتھ رکھے پیدل چل رہا تھا' گاڑی کے پیچھے مختلف عمروں کے لوگ کھڑے تھے جبکہ گاڑی پر تین نعشیں لدی تھیں' مرنے والے چہروں مہروں سے نوجوان دکھائی دیتے تھے ان کی پنڈلیاں ننگی تھیں' ان کے پیروں سے جوتے غائب تھے' ان کے کپڑے اپنے ہی لہو سے تر تھے اوران کی گردنیں ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھیں' میں نے گھبرا کر تصویر کے کیپشن پر نظر ڈالی' لکھا تھا ''گوجرانوالہ' پولیس مقابلے میں مارے جانے والے ڈاکوؤں کی نعشیں گدھا گاڑی پر مردہ خانے جا رہی ہیں۔'' میں نے تصویر سے متعلقہ خبر کی تلاش میں صفحے پر نظر دوڑائی' قریب ہی ایک دو کالمی خبر چیخ رہی تھی' خبر کے مطالعے سے پتہ چلا یہ تینوں ڈاکو محلہ باغبانپورہ کے ایک گھر میں داخل ہوئے' اہل خانہ سے پستول کی نوک پر چھ ہزار آٹھ سو روپے لوٹے' فرار ہونے سے قبل انہوں نے خاتون سے بیرونی دروازے کی چابی مانگی' تلخ کلامی ہوئی تو خاتون نے ایک ڈاکو کی انگلی چبا ڈالی' ڈاکو نے چیخ ماری' ہمسائے جاگ گئے اور انہوں نے پولیس کو اطلاع کر دی' پولیس فوراً پہنچ گئی پولیس مقابلہ ہوا اور تینوں ڈاکو ''پار'' ہو گئے بعد ازاں ان ڈاکوؤں کی نعشیں گدھا گاڑی پر لاد کر مردہ خانے لے جائی گئیں' خبر ختم ہوئی تو میں نے قاسمی صاحب کا نام ڈک اور ہیری بن کر دوبارہ تصویر پر نظر ڈالی تو تصویر چیخ کر ابھ رہی تھی گدھا گاڑی پر پڑی یہ نعشیں' جن کی پنڈلیاں ننگی اور پاؤں سے جوتے غائب ہیں' جن کے کپڑوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے ہیں اور جن کی گردنیں ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی ہیں' کا جرم رات کے تین بجے کسی کے گھر کو لوٹنا نہیں تھا' ان کا قصور پستول کی نوک پر رقم لوٹنا نہیں تھا' ان کی غلطی وارننگ پر خود کو پولیس کے حوالے نہ کرنا بھی نہیں تھی ان کا جرم تو فقط اتنا تھا کہ انہوں نے چھ ہزار آٹھ سو کی بجائے چار ارب آٹھ کروڑ روپے نہیں لوٹے تھے' ان میں سے کوئی بینک ڈیفالٹر نہیں تھا' ان لوگوں کا نام ''ای سی ایل'' پر نہیں تھا' انہوں نے کوئی سرے محل نہیں خریدا تھا' انہوں نے ایک رات میں پچیس تیس کروڑ ڈالر ملک سے باہر منتقل نہیں کئے تھے' یہ کسی سیاسی جماعت کے ٹکٹ ہولڈر نہیں تھے' ان کا کوئی چاچا' ماما رکن اسمبلی نہیں تھا' ان کا کوئی تعلق کسی جاگیردار' سیاستدان اور بیورو کریٹ گھرانے سے نہیں تھا' انہوں نے کوئی کوآپریٹو سوسائٹی نہیں بنائی تھی' کوئی حمید اصغر قدوائی ان کا دوست نہیں تھا' ان کا گھر کسی مہران بنک کے راستے میں نہیں پڑتا تھا' ان کی منجیر وں سے کبھی ہیروئن برآمد نہیں ہوئی تھی' تصویر کہہ رہی تھی ان کا جرم واقعی سنگین تھا' خدا کی پناہ ڈاکوؤں کی مملکت میں صرف چھ ہزار آٹھ سو کا ڈاکہ اور وہ بھی ''نسبت'' کے بغیر' ان کی نعشیں تو واقعی گدھا گاڑی پر ہونی چاہیے تھیں۔

میرا خیال ہے اگر عطاء الحق قاسمی کا مسٹر نام گدھا گاڑی پر لدی یہ نعشیں بھی دیکھ لے اور پھر اس کے قریب سے ہوٹر بجاتی ہوئی گاڑیوں کا ایک قافلہ گزرے جس کے آگے اور پیچھے پولیس کے مستعد کمانڈوز کی درجنوں جیپیں ہوں اور ہر چوک' ہر موڑ پر ایک سمارٹ سارجنٹ انہیں سفید دستانوں کا سمارٹ سلیوٹ پیش

کرتا ہو تو وہ بڑے دکھ سے کہے یہ بات اچھی نہیں' ایک ہی جرم پر دو طرح کی سزائیں' ایک کو پولیس نعش بنا کر گدھا گاڑی پر ڈالے لے جا رہی ہے اور دوسرے کو بلٹ پروف مرسیڈیز میں' ہوٹر بجاتے ہوئے' سلیوٹ پیش کرتے ہوئے' یہ تو بڑی زیادتی ہے' یہ تو کوئی انصاف نہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

مرنے کا حق

الطاف گوہر پاکستان میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو امریکہ میں ہنری کسنجر کو حاصل تھی' جوان تھے تو مولوی فضل حق' حسین شہید سہروردی' سکندر مرزا' ملک فیروز خان نون اور ایوب خان کے سیکرٹری رہے۔ پاکستان کے بیوروکریٹک سسٹم کے بنیادی ستون رہے۔ پاکستان کا پہلا کرنسی نوٹ چھپوایا' پاکستان کی ایکسپورٹ اینڈ امپورٹ پالیسیاں بنائیں' تیس چالیس رائفلوں کے لائسنس جاری نہ کر کے بھٹو کی دشمنی مول لی۔ جنگ ستمبر میں ایوب خان کی مشہور تقریر لکھی' ایوب خان کی بائیوگرافی "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" لکھی' یحییٰ خان کے عتاب کا شکار ہوئے ۳۰۳ سرکاری افسروں کے ساتھ نوکری سے فارغ کر دیئے گئے' قید تنہائی میں رکھے گئے' تفہیم القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ "ڈان" کے ایڈیٹر بنے' لندن کے مشہور اخبار "گارڈین" کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر رہے' بین الاقوامی جریدے "ساؤتھ" کے ایڈیٹر رہے اور جب "مسلم اخبار چڑھے دریا کی طرح کناروں سے باہر ابل رہا تھا تو اس کے ایڈیٹر بنے۔ بوڑھے ہوئے تو ان ساری بیکار سرگرمیوں سے فارغ ہو گئے طبیعت مضمون نویسی کی طرف مبذول ہو گئی پھر واہ' کیا خوب مضامین لکھے' کوثر و تسنیم سے دھلی زبان' احساسات سے مہکتے خیالات اور دلوں میں اتر جانے والے الفاظ۔ واہ واہ کیا کہنے

جب الطاف گوہر "ساؤتھ" کے ایڈیٹر تھے تو انہوں نے تھرڈ ورلڈ کے اہم رہنماؤں کے انٹرویو شروع کئے۔ افریقی رہنما ان کا بنیادی "ہدف" تھے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے ان کی ملاقات کالوں کے حریت پسند لیڈر ریورنڈ ایلن بوساک (Reverend alan boesak) سے ہوئی اس دور میں افریقی بوساک کی اسی طرح پوجا کیا کرتے تھے جس طرح ہندو ماتما گاندھی کی۔ متحمل مزاج الطاف گوہر نے بوساک سے پوچھا: "سیاہ فام قوم انسانی حقوق حاصل کر لے گی؟" بوساک نے سگار کا کش لے کر پورے اطمینان سے جواب دیا "مسٹر گوہر! سو فیصد" "لیکن کب تک؟" یہ الطاف گوہر کا دوسرا سوال تھا۔ "بہت ہی جلد" بوساک نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ "کیا آپ کے پاس اس پیشین گوئی کی کوئی مضبوط دلیل ہے؟" ایلن بوساک نے سگار کا گل جھاڑ کر کہا "ہاں ہے۔" گوہر صاحب اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر رہ گئے' بوساک نے آنکھیں بند کیں اور جمے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا "موت' میرے عزیز موت! اس پیشین گوئی کی مضبوط ترین وجہ ہے۔ ہم لوگ'

ہمارے ماں باپ' ہمارے بیوی بچے یہ جان چکے ہیں کہ ہمیں صرف ایک ہی حق حاصل ہے اور وہ ہے مرجانے کا حق۔ لہٰذا ہم نے یہ حق طے کر لیا ہے ہم اب یہ حق کسی دوسرے کو استعمال نہیں کرنے دیں گے۔ ہم خود استعمال کریں گے' جب چاہیں گے جس طرح چاہیں گے۔"

آرائے بازار راولپنڈی کا محمد ابراہیم بھی بڑا بے وقوف تھا' اگر اس میں رتی بھر عقل ہوتی تو وہ جعل سازی' فراڈ اور ڈکیتیوں کی بجائے یوں پھیری لگا کر منیاری کا سامان بیچتا۔ روز رخ دوپہریں اور برف شامیں یوں دربدر بھٹکتے گزارتا۔ اس میں رتی بھر عقل ہوتی تو وہ کسی بینک سے دو چار کروڑ لون لینے کے بجائے یوں دودھ والے' کریانہ مرچنٹ اور سود پر رقم دینے والوں سے بچتا پھرتا' اپنے کپڑے کٹوا کر بیٹے کے لیے شلوار قمیص سلواتا' روز بیوی کو مارتا' برتن توڑتا' خود کو گالیاں دے کر تلخی بجھانے کی سعی کرتا' یوں خواہشوں کے پٹرول سے اپنا جسم داغتا۔

محمد ابراہیم بے وقوف تھا۔ چار بچوں کو جنازے کی طرح اٹھائے اٹھائے پھرتا رہا۔ اس میں رتی بھر عقل ہوتی تو صائمہ' افشاں' فوزیہ اور ندیم کی خواہشوں کے لیے ڈاکے ڈالتا' لوگوں کو باہر بھجوانے کا جھانسہ دے کر نوٹ بٹورتا' سرکاری پٹرول بیچتا' فائلوں کی کمائی کھاتا' سرکاری املاک پر قبضہ کرتا' سڑکیں "کھا" جاتا' تاریں اتار کر بیچ ڈالتا' سمگل شدہ گاڑیوں کے جعلی کاغذات تیار کرتا' کسی رکن اسمبلی کا دست و بازو بن جاتا اور کسی وزیر کا کاروباری ساتھی ہو جاتا۔

محمد ابراہیم بیوقوف تھا' کرپشن' لوٹ کھسوٹ اور ہیرا پھیری کی اس زمین پر بھی افلاس اس کی رگوں کا لہو چوستی رہی' غربت اس کا حوصلہ چاٹتی رہی' فاقے اس کی برداشت کی بنیادیں ہلاتے رہے' محرومی اس کی آنکھوں کی چمک اور بیماری اس کے لہجے کی شوخی چراتی رہی وہ اندر سے بنجر اور باہر سے ویران ہوتا رہا' اس کے خون کا ابال اپنی ہی رگوں سے الجھتا رہا' اس کا غصہ بیوی کے چہرے کے زخموں اور بچیوں کے بدن کے نیل میں ڈھلتا رہا۔

محمد ابراہیم واقعی بیوقوف تھا۔ تین روز کے فاقے بھی اس میں جرأت نہ پیدا کر سکے۔ برسوں کی بے روزگاری بھی اسے انتقام پر نہ ابھار سکی' بیوی کی آنکھوں کی وحشت اور بچیوں کے معصوم چہروں کی ویرانی بھی اسے وقت سے لڑنے کا حوصلہ نہ دے سکی۔ وہ واقعی بیوقوف تھا' چولہے کی بجھی راکھ' بچوں کے خشک ہونٹ اور بیوی کی بھوکی نظریں دیکھ کر بپھر گیا' اپنے کل اثاثے چار لحاف' تین چار پائیوں' دو دریوں' ایک کرسی اور ٹوٹے پلنگ کو آگ لگا دی۔ مٹی کے ٹوٹے برتنوں کی ٹوکری سے کند چھری نکالی اور ۱۲ سالہ صائمہ کو دکھا کر بولا" میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" بھوک سے نڈھال بچی میں تو اٹھنے کا بھی حوصلہ نہیں تھا' چنانچہ بزدل باپ نے جب چھری چلائی تو پانی سے بھری انتڑیوں کو باہر آتے دیر ہی کتنی لگی۔ افلاس کے مارے دل کو آخری جھٹکا کھاتے لمحے ہی کتنے لگے اور روٹی کی منتظر آنکھوں کو بجھتے وقت ہی کتنا لگا۔ بزدل باپ خون سے بھیگی چھری

لے کر پلٹا اور ننھی افشاں اٹھ کر بھاگی' لیکن نقاہت کی ماری ٹانگیں کہاں تک جا سکتی تھیں۔ تین ٹانگوں والی میز سے ٹکرا کر گر گئی۔ باپ اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا تو آٹھ سال کی بچی نے گڑگڑا کر کہا "ابا' ابا میں جینا چاہتی ہوں' خدا کے لیے مجھے نہ مارو' مجھے بڑا درد ہوگا۔" لیکن بزدل باپ نے چیخ کر کہا "روز روز مرنے سے ایک بار کا مرنا ہی ٹھیک ہے۔" اور ننھی افشاں کی انتڑیاں بھی اچھل کر باہر آ گئیں۔ سکتے کی شکار ماں اور خوف سے کانپتے بیٹے نے جب باپ کو اپنی طرف پلٹتے دیکھا تو چیختے چیختے گلی میں آ گئے' محمد ابراہیم ان کے پیچھے بھاگا لیکن صائمہ اور افشاں کی چیخوں سے کمال آباد کے لوگ گھروں سے باہر آ چکے تھے' لہٰذا مجبوراً ابراہیم نے چھری پھینکی اور مرنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔

ہاں محمد ابراہیم واقعی بیوقوف انسان تھا۔ اسے یہ تک معلوم نہیں تھا جب موت مقدر ہی بن گئی تو پھر کیوں نہ اسے ہتھیار بنا کر جیا جائے' صائمہ اور افشاں کو مارنے کے بجائے ان لوگوں کے بچے مارے جائیں جو صائمہ اور افشاں کی موت کے اصل ذمہ دار ہیں' جن کی وجہ سے اس ملک کی لاکھوں صائمہ اور افشاں مہینوں فاقے کاٹتی ہیں' اپنی ننھی ننھی خواہشیں پلوؤں میں باندھے پھرتی ہیں' جن کی آنکھوں میں ستارے نہیں روٹیاں چمکتی ہیں اور جن کے ہونٹوں سے ترانے نہیں منتیں جھڑتی ہیں۔

ہاں محمد ابراہیم واقعی بے وقوف تھا۔ موت کو ہتھیار نہ بنا سکا' اس نے سیاستدانوں کا انتقام اپنے ہی اہل خانہ سے لیا' بے وقوف نہ ہو پاگل نہ ہو۔

لیکن شاید یہ ابراہیم اس وقت تک ایسی حماقتیں کرتے رہیں' ایسی ہی بیوقوفیوں کے مرتکب ہوتے رہیں' جب تک انہیں کوئی ایسا ریونڈ ایلن بوساک نہیں مل جاتا جو انہیں جمع کر کے بتا سکے "میرے بھائیو اور میری بہنو! ہم لوگ' ہمارے ماں باپ' ہمارے بیوی بچے یہ جان چکے ہیں' ہمیں صرف ایک ہی حق حاصل ہے اور وہ ہے مر جانے کا حق اور اب ہم نے طے کرنا ہے کہ آج سے یہ حق ہم خود استعمال کریں گے' جب چاہیں گے' جس طرح چاہیں گے اور میرا یہ اعلان ہے ہم میں سے کوئی شخص اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک وہ دس پندرہ ظالموں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچا دیتا۔"

معافی ...... یارسول اللہ ﷺ ...... معافی

موت سے چند لمحے پہلے

ہاں موت سے چند لمحے پہلے انہوں نے یقیناً سوچا ہوگا اگر وہ اس راستے کا انتخاب نہ کرتے تو آج قاہرہ میں ان کا بھی شاندار بزنس ہوتا' کاک ٹیل پارٹیاں ہوتیں' فرانس کی خوشبوئیں اور جاپانی سوٹ ہوتے پہلو میں مصر کا جادو ساری ساری رات پگھلتا رہتا اور ہر صبح خمار کا پیغام لے کر طلوع ہوتی اور ان میں ایک ایسا بھی تو تھا جو جب یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بولتا تھا تو لفظ کانوں میں نہیں دلوں میں اترتے تھے اور سامعین کے ہاتھوں میں کافی کے کپ حدت بھول جاتے تھے اور رات کو جب وہ گرلز ہاسٹل کے قریب سے گزرتا تھا تو کتنی ہی سرگوشیاں اس کے لبادے سے الجھتی تھی لیکن وہ ان پر توجہ دیئے بغیر گزر جاتا تھا کہ حسن' جنس اور آرام دہ زندگی اس کا مطمح نظر نہیں تھا...... اور ہاں ان میں سے ایک نے سوچا اس بار بھی جب برف پگھلے گی تاجک خچروں پر سوار ہو کر پہاڑوں کی طرف چل پڑیں گے اور پھر اس کا شہر آوازوں سے پہاڑی گیتوں سے اور براق جھرنوں جیسی عورتوں سے خالی ہو جائے گا ایسی عورتیں جن کے سرخ گال اور رسیلے ہونٹوں کے نظاروں کے لئے سیاحوں کے مخمل لگ جایا کرتے تھے...... اور ان میں جو سب سے چھوٹا تھا اس کی آنکھوں میں ماں کا چہرہ لہرایا جس نے چلتے وقت اس کا دامن پکڑ کر کہا تھا بیٹا جب تم شہید کی وردی پہن کر خدا کی بارگاہ میں جاؤ تو اپنے آباؤ اجداد کی بخشش کی دعا کرنا کہ وہ قزاق تھے او جہالت نے ان کے ہاتھوں سے بڑے ظلم کرائے تھے......

اور ان میں جو نسبتاً زیادہ بزرگ تھا اس نے رائفل میں میگزین چڑھاتے ہوئے یقیناً سوچا ہوگا افسوس آج ہمیں انہی لوگوں پر گولی چلانا پڑی جن کی حفاظت کے لیے ہم گھروں سے نکلے تھے۔

اور پھر جب ان کی آنکھیں روشنی سے خالی ہو گئیں' دھڑکنیں مردہ وجود میں جذب ہو گئیں' اعضاء سے حرکت اڑ گئی اور نسیں قطرہ خون سے خالی ہو گئیں تو ان کی نعشیں ٹوٹی دیواروں گرتی چھتوں اور کٹے پھٹے دروازوں سے کھینچ کر باہر لائی گئیں انہیں ننگی زمین اور کھلے آسمان کے نیچے پٹخ دیا گیا اور ذرا دور ایک مکان کے سائے میں ستاتے سپاہی نے رائفل کا میگزین اتار کر گولیاں گنیں اور اپنے قریب لیٹے سپاہی کو مخاطب کر کے بولا "کیا تم نے زندگی میں ایسے لوگ دیکھے ہیں جو مسلسل چھ روز تک بغیر سوئے لڑتے رہے ہوں؟" دوسرے

سپاہی نے ہاتھ سے آنکھیں صاف کیں اور بولا ''کیا تم نے پہلے کبھی ایسا منظر دیکھا کہ ایک شخص کلمہ شہادت کا نعرہ لگاتے ہوئے اور اپنا سینہ گولیوں کے استقبال کے لئے پیش کر دے۔'' پہلے سپاہی نے بھی آنکھیں صاف کیں اور بولا ''بس یار ہم تو حکم کے غلام ہیں......'' اور ذرا دور پولیس کا ایک اعلیٰ افسر نعشوں پر کھڑا وائرلیس پر مرنے والوں کا حلیہ بیان کر رہا تھا اور کچھ دور اسلامی دنیا کے سب سے بڑے ملک کے دارالحکومت میں بیٹھے چند لوگ پوری دنیا کو'' آپریشن از اوور' آپریشن از اوور'' کے پیغامات دے رہے تھے۔

اگلے روز جب قاہرہ کے ایک اخبار نے ان مرے ہوئے ''دہشت گردوں'' کی تصویر شائع کی تو ایک نوجوان نے اخبار ہوا میں اچھال کر پہلو میں سوئے بت کا بوسا لیا اور بولا ''تھینک گاڈ میں اس کی باتوں میں نہیں آیا نہیں تو آج میں بھی...... چلو چھوڑو ابھی بہت صبح ہے۔''...... دور یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں ایک نوجوان کو کافی کا گرم کپ تنگ کر رہا تھا لیکن وہ اس پر توجہ دیے بغیر مسلسل سوچ رہا تھا شاید وہ واقعی نفع میں رہا ہو مرتو میں نے بھی جانا ہے ایکسیڈنٹ میں' کسی ان دیکھے مہلک مرض سے یا بڑھاپے میں بچوں کی توجہی سے لیکن وہ ہاں شاید ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا ہو......'' ادھر جب تاجک قبائل خچروں پر مشکیں کسنے لگے تو ایک چھوٹا سا بچہ بھاگتا ہوا آیا اور سردار کا دامن تھام کر بولا: ''میرا بھائی اللہ کی راہ میں شہید ہو گیا بابا کیا میں بھی شہادت کا درجہ پاؤں گا'' تو مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت سے لبریز سردار نے جھک کر بچے کے گال پر بوسا دیا اور بولا ''یہ سعادت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی......'' اور جب ماں نے اپنے مرے ہوئے بچے کی تصویر دیکھی تو آنکھوں سے لگا کر بولی: ''میرا بچہ بھی شہید ہوا اب میں بھی فاطمہؓ ہوں......'' اور جوان میں نسبتاً بڑا تھا اس کے باپ نے ہاتھ اٹھائے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کی اور پھر تسلی کے لیے آنے والوں کو مخاطب کر کے بولا: ''سب نے چلے جانا ہے لیکن مبارک باد کا مقام ہے کہ میرا بچہ بارگاہ رسالتؐ میں میرا استقبال کرے گا۔''

اور آج دنیا کہہ رہی ہے وہ جنونی تھے پاگل تھے فاتر العقل تھے کہ انھوں نے زندگی کے مقابلے میں موت کو ترجیح دی جب پولیس انہیں جان بخشی کی پیشکش کر رہی تھی انہیں گرفتاری دینے کے لیے قائل کر رہی تھی تو ہاتھ اٹھا کر باہر آجاتے اور تھوڑا سا جھک کر زندگی کی بخشش لے لیتے...... لیکن یہ سب سود وزیاں کی اس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں جہاں ''گیو اینڈ ٹیک'' سب سے بڑا اصول ہے جہاں صرف دینا بے وقوفی حماقت اور پاگل پن ہے اور یہ بھی تو کسی دانا نے ہی کہا تھا کہ پاگل پن میں بھی ایک مسرت ہوتی جس سے صرف ایک پاگل ہی لطف اٹھا سکتا ہے...... اور یہی تو سچ ہے ورنہ دوسرا راستہ تو حضرت حسینؓ کے لیے بھی کھلا تھا اور اس سے پہلے حضرت موسیٰ بھی فرعون کی بات مان کر پوری قوم کو نقل مکانی کے عذاب سے بچا سکتے تھے اور ہاں سقراط بھی تو اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن کیا ان لوگوں نے ان جیسے سینکڑوں ہزاروں لوگوں نے نقصانات کا سودا کیا؟ ہو سکتا ہے کیلیفورنیا کے کسی آرام دہ فلیٹ میں بیٹھے کسی شخص یا لندن کے کسی کلب میں ناچنے والے ''سمجھدار'' انسان کا جواب ہاں میں ہو لیکن وہ لوگ نہ صرف دنیا کو عارضی ٹھکانہ سمجھتے ہیں بلکہ مرنے کے بعد حبیب خداؐ کی

بارگاہ میں حاضری کو بھی اٹل حقیقت جانتے ہیں وہ چند سانسوں کے بدلے لاکھوں کروڑوں سال کی شرمندگی کا سودا کیسے کر سکتے ہیں؟

اور یہ بھی تو ایک فلسفہ ہے کہ اگر ٹیپو سلطان گیدڑ کی سو سالہ زندگی قبول کر لیتا تو کیا اس کی سانسیں بڑھ جاتیں' زندگی اس پر سارے دروازے کھول دیتی؟ نہیں ہرگز نہیں کہ خدا نے ہر شخص کی سانسیں معین کر رکھی ہیں یا پھر لوگ حادثہ یا بیماری کی موت کے بجائے عشق رسول ﷺ جہاد فی الدین اور مرگ پر رضا الٰہی کی دائمی زندگی کا انتخاب کیوں نہ کرتے؟ لیکن افسوس وہ لوگ جو گھروں سے کافروں کو مارنے یا ان کے ہاتھوں مرنے کا خواب لے کر نکلے وہ اپنوں ہی کی گولیوں کا شکار ہو گئے اور اس میں قصوروار کون ہے؟ آیئے اس کا جواب تاریخ پر چھوڑ دیں لیکن اس سرزمین پر بسنے والے ہر مسلمان سے میری اپیل ہے وہ بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا کر اس گناہ کی معافی ضرور مانگے کہ جب ایک خاندان اپنے مقتول کے جواب میں لہو مانگتا ہے تو خدا اپنے شہید کا قتل کیسے معاف کر دے گا؟

معافی یا رسول اللہ ﷺ معافی...... مجاہد بدر و حنین کے صدقے...... شہداء کربلا کے صدقے۔

نیک نیتی

ان دنوں نواب آف کالا باغ امیر محمد خان پورے مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ بعض سرکاری معاملات پر بات چیت کے لیے بھارت جانا ہوا' دہلی میں جب بھارت کی صف اول کی قیادت سے ملاقات ہوئی تو نہرو سمیت تمام بڑے رہنماؤں نے جان بوجھ کر بھارت کی زرعی اور صنعتی ترقی کا تذکرہ چھیڑ دیا' جسے سن کر نواب صاحب کو کمتری کا احساس سا ہوا۔ چنانچہ دورے کے اختتام پر انہوں نے میزبانوں سے مشرقی پنجاب کے ذاتی دورے کی اجازت مانگی' جس پر ظاہر ہے بھارتی حکومت کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یوں نواب آف کالا باغ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گاڑیوں پر مشرقی پنجاب کی ہریالی میں اتر گئے اور یہ دیکھ کر واقعی حیران رہ گئے کہ جو زمینیں قیام پاکستان سے قبل صرف جھاڑیاں' کانٹے اور سیم پیدا کرتی تھیں اب ان پر صحت مند' قد آور اور ہری بھری فصلیں کھڑی ہیں۔ وہ ہریانہ کے قریب جب حیرت کے ایک گہرے احساس کے ساتھ ایک ایسے ہرے بھرے ٹیلے پر کھڑے ہو گئے جو چند برس تک ''مبہ'' کہلاتا تھا اور گزرنے والوں کو اس کی ویرانی' خشکی اور بنجر پن سے وحشت ہوتی تھی' تو میزبان نے انہیں ٹوک کر کہا: ''نواب صاحب آپ نے ہمارا کمال دیکھا' ہم نے زمین کے ایک ایک انچ کو پیداواری بنا دیا۔'' نواب صاحب نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر اس برہمن سیکرٹری سے پوچھا: ''لیکن آپ نے یہ سب کچھ کیا کیسے؟'' سیکرٹری نے تفاخر سے سینہ پھلایا اور پاکستانی وفد پر نفرت کی ایک نگاہ ڈال کر بولا: ''یہ سارا چمتکار ہمارے انجینئرز کا ہے۔'' نواب صاحب نے اپنے مخصوص انداز سے مونچھیں دونوں مٹھیوں میں جکڑیں اور انہیں بل دے کر بولے: ''پر کیسے؟'' برہمن سیکرٹری مسکرایا اور پھر آہستہ سے بولا: ''ہم نے دیکھا' ہمارے پاس ساٹھ کروڑ بھوکے پیٹ اور تھوڑی سی قابل کاشت زمین ہے' ہم نے دیکھا' ہم نے اس زمین سے ان سارے بھوکوں کے پیٹ پالنے ہیں' ہم نے سوچا' ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں' تو ہم نے فیصلہ کیا' ہم اپنی قابل کاشت زمین کے ایک ایک انچ سے فائدہ اٹھائیں گے اور پھر دنیا نے دیکھا ہم نے ریت' ٹیلوں اور گھاٹیوں میں گیہوں اگائے' چنے' مکئی اور کماد کی فصلیں کاشت کیں۔'' نواب صاحب نے مونچھوں کو ایک بار پھر بل دے کر دوبارہ پوچھا: ''پر کیسے؟'' برہمن سیکرٹری پھر مسکرایا اور بولا: ''نواب صاحب' ہمارے انجینئروں نے ایسی مشینیں ایجاد کیں جنہوں نے پہاڑوں تک میں

چھپی زرخیزی کھود کر باہر نکال لی۔''

اس ساری بحث کے بعد پاکستانی وفد کے دل میں وہ زرعی آلات دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی' جن کی مدد سے بھوکا' ننگا بھارت خوشحال ہو گیا۔ مہمانوں کے اصرار پر میزبان وفد کو زرعی آلات کے ایک کارخانے میں لے گئے۔ پاکستانی وفد نے اپنے سامنے زمین ہموار کرنے' کیاریاں بنانے' سہاگہ پھیرنے' بیج ڈالنے' کھاد بکھیرنے' گوڈی کرنے' ادویات کے چھڑکاؤ کرنے' پکی فصلیں کاٹنے اور بھوسا اور دانے الگ کرنے کی سینکڑوں مشینیں دیکھیں تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اسی حیرت' شرمندگی اور بے حسی کے احساس کے ساتھ نواب صاحب نے فیکٹری کی انتظامیہ سے ان آلات کے بروشر طلب کیے' کچھ تصاویر اور نقشے حاصل کیے اور برہمن سیکرٹری کا شکریہ ادا کر کے واپس دہلی آ گئے' جہاں سے اگلے روز یہ لوگ لاہور پہنچ گئے۔

بتانے والے بتاتے ہیں' ان دنوں جو بھی نواب آف کالا باغ سے ملنے جاتا' انہیں نقشے سامنے رکھے کسی نہ کسی انجینئر سے محو گفتگو پاتا' ان آلات کے لیے کتنی بڑی فیکٹری چاہیے' کتنی افرادی قوت درکار ہے' ماہرین کی کتنی ٹیمیں ہونی چاہئیں' اس پر لاگت کتنی آئے گی اور عام کسانوں کو یہ آلات کتنے میں ملیں گے' وغیرہ وغیرہ' نواب صاحب کا مرغوب موضوع ہوتا۔ یہ سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا' جس میں طویل اور تھکا دینے والی ملاقاتوں' بحثوں اور تخمینوں کے بعد نواب صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ منصوبہ تقریباً ناممکن ہے کیونکہ آلات اور مشینری کے لیے جس قدر ماہرین' وسیع نیٹ ورک اور فیکٹریاں چاہئیں' وہ ملک میں دستیاب نہیں۔ دوسرا اگر موجود ڈھانچے سے کام چلایا جائے تو تیاری کے بعد آلات اتنے مہنگے پڑیں گے کہ کسی بھی زمیندار' کسان یا کاشتکار کے لیے خریداری ممکن نہیں ہو گی اور بالفرض اگر کوئی کاشتکار ہمت کر بھی لے تو آلات کے استعمال کے بعد فصل کی قیمت میں اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ منڈی سے عام خریدار خالی ہاتھ واپس آنے کو ترجیح دے گا۔ بہر حال قصہ مزید مختصر نواب صاحب بری طرح مایوس ہو گئے' لہٰذا انہوں نے پاکستان کے کاشتکاروں کو بیلوں اور روایتی ہلوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

انہی دنوں گورنر ہاؤس کا ایک کارندہ ایک چھوٹے سے صنعتکار کو لے کر گورنر کے آفس آیا اور اس کا یہ کہہ کر تعارف کرایا: ''یہ کشمیری ہیں' لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے کے مالک ہیں' نہایت ہی پرہیزگار شخص ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ آپ کی مشکل حل کر سکتے ہیں۔'' نواب آف کالا باغ نے پچھلی عمر کو دستک دیتے اس سرخ سپید رنگت کے کمزور سے شخص کو دیکھا تو انہیں کوئی خاص انسپائریشن نہ ہوئی' لہٰذا انہوں نے عادتاً مونچھیں مٹھیوں میں جکڑیں اور انہیں بل دے کر بولے: ''میاں صاحب یہ ناممکن کام ہے' پاکستان کے تمام بڑے انجینئر معذرت کر چکے ہیں۔ یہ آپ کے بس کی بات نہیں' اپنا پیسہ اور وقت برباد کریں اور نہ میرا۔'' میاں صاحب نے سنا تو بڑی شائستگی سے بولے: ''نواب صاحب آپ کا فرمانا بجا' لیکن کوشش میں تو کوئی حرج

نہیں۔'' نواب صاحب نے مونچھیں چھوڑ کر بلند بانگ قہقہہ لگایا اور پھر بولے: ''اگر آپ کی نظر میں کوشش اور حماقت میں کوئی فرق نہیں' تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' ساتھ ہی وہ اپنے سیکرٹری کی طرف مڑے اور مہمان کی طرف اشارہ کر کے بولے: ''آپ انہیں آلات کے نقشے' تصاویر اور بروشر دے دیں۔''

واقفان حال کا کہنا ہے چند ماہ بعد جب کشمیری صنعت کار کو متعارف کرانے والے سرکاری اہلکار نے نواب صاحب کو زرعی آلات تیار ہونے کا مژدہ سنایا تو انہوں نے حیرت سے کہا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اہلکار نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''لیکن حضور یہ ہو چکا ہے۔'' گورنر نے معمول کی ساری مصروفیات منسوخ کر کے آلات دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ بتانے والے بتاتے ہیں جب نواب آف کالا باغ پورے ریاستی کروفر کے ساتھ لاہور کے مضافات میں قائم اس فونڈری میں داخل ہوئے تو معمولی مشینری' چند مزدور اور ادھوری عمارت دیکھ کر ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی اور انہوں نے فونڈری کے مالک کی طرف مڑ کر پوچھا: ''میاں صاحب آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ نے اس کارخانے میں دنیا کے جدید ترین آلات تیار کئے ہیں؟'' مالک نے عجز سے گردن جھکا کر کہا: ''جی حضور'' اچھا' نواب صاحب نے ایک طویل قہقہہ لگایا' بتانے والے بتاتے ہیں' لیکن جب صحن میں پڑے آلات پر گورنر کی نظر پڑی تو حیرت سے ان کے قدم زمین پر گڑ گئے اور ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ انہوں نے مالک کی طرف دیکھا اور شرمندگی' حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساس کے ساتھ بولے ''کیا یہ سب کچھ آپ نے بنایا ہے؟'' کشمیری مالک نے انگلی اوپر آسمان کی طرف اٹھائی اور عجز سے بولا: ''میں نے کچھ نہیں کیا' صرف اس کی توفیق نے کیا۔'' بتانے والے بتاتے ہیں' جب گورنر نے اس انجینئر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی' جس کی نگرانی میں یہ آلات تیار ہوئے تھے تو کشمیری مالک نے اپنے کارخانے کے چالیس پچاس مزدور سامنے کھڑے کر دیئے اور عرض کیا: ''اس سارے منصوبے کے ماہرین' انجینئر اور تکنیک کار یہی لوگ ہیں۔'' گورنر مزید مرعوب ہو گیا' رخصتی سے ذرا دیر پہلے نواب صاحب کشمیری مالک کو ایک طرف لے گئے اور اس سے سرگوشی میں کہا: ''میں حیران ہوں آپ نہ تو زیادہ پڑھے لکھے ہیں' نہ ہی بڑے کارخانے کے مالک ہیں' انجینئر آپ کے پاس نہیں ہیں' پیسہ بھی نہیں ہے' پھر آپ نے وہ آلات آدھی سے کم لاگت میں کیسے بنا لئے' جنہیں اس ملک کے بڑے بڑے انجینئر ہاتھ لگانے کے لیے تیار نہیں تھے۔'' میاں صاحب نے دوبارہ عجز سے سر جھکایا اور آہستہ سے بولے: ''نیک نیتی سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔''

یہ میاں صاحب' میاں نواز شریف وزیر اعظم پاکستان اور میاں شہباز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب کے والد میاں محمد شریف ہیں۔

جب ہم لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہیں کہ وہ کون سی طاقت ہے' جس سے ایک چھوٹی سی فونڈری کے مالک کو پاکستان کا بڑا صنعتکار بنا دیا۔ وہ کون سی طاقت ہے' جس نے گمنامی کے پردوں میں چھپے اس خاندان کو عالمی میڈیا کا مرغوب ترین موضوع بنا دیا۔ وہ کون سی طاقت ہے جس نے عام ذہنی سطح اور واجبی تعلیم کے مالک اس کشمیری خاندان کو پاکستان کا کامیاب ترین سیاسی گھرانہ بنا دیا' تو یقین جانئے طویل بحث

ومباحثے کے باوجود ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے۔

آخر میں' میں بے اختیار کہتا ہوں" ہو سکتا ہے وہ طاقت نیک نیتی ہی ہو۔" سب سنتے ہیں' آہستہ آہستہ گردن ہلاتے ہیں اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

فرہاد

وہ سکاٹش تھا' ایک درمیانے درجے کا سول انجینئر جو چھوٹے موٹے ٹھیکے لے کر اپنے خاندان کا پیٹ پالتا تھا۔ آمدن کے ذرائع بہت ہی محدود تھے' لہٰذا گھر کے تمام افراد مہینے میں ایک بار ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے' پندرہ دن بعد پکنک پر جاتے اور دن میں صرف دو بار ڈائننگ ٹیبل پر آتے تھے۔ ڈورتھی' اس کی بیوی کو سیاحت کا بہت شوق تھا لیکن اتنی محدود آمدنی' جس میں ایک ڈبل روٹی خریدنے کے لیے بجٹ پر بار بار نظر ثانی کرنا پڑے' میں اتنا مہنگا شوق پاگل پن لگتا تھا' لیکن خاتون تھی بڑی کفایت شعار وہ ہر ماہ کسی نہ کسی طریقے سے چند ڈالر بچا لیتی تھی' جو سال بعد سوسوا سو ڈالر بن جاتے تھے' لہٰذا یوں سال بعد جب وہ لوگ ''ممفیس'' سے باہر نکلتے تو یہ ان کے لیے بڑا یادگار دن ہوتا۔

۱۹۵۱ء میں بھی جب وہ لوگ ڈورتھی کی کفایت شعاری کے طفیل واشنگٹن ریلوے سٹیشن پر اترے تو کیمونز ان درجنوں سیاحتی کتابوں کی مدد سے' جن کا وہ دوران سفر مطالعہ کرتا رہا' ایک ایسا ہوٹل تلاش کر چکا تھا جو قابل فخر حد تک آرام دہ اور پرآسائش تو نہیں تھا لیکن واشنگٹن بھر میں ایسے لوگوں کے لیے' اس سے بہتر شاید ہی کوئی ہوٹل ہو' جو چند سینٹ خرچ کرنے کے بعد بار بار ساری رقم گنتے ہوں۔ بہر حال ہوٹل کا کرایہ' سفر کے اخراجات اور کھانے پینے کے نرخ کی طویل جمع تفریق کے بعد خاندان نے اندازہ لگایا کہ وہ چار روز تک باآسانی واشنگٹن میں قیام کر سکتے ہیں چنانچہ کیمونز نے اس ہوٹل میں رہنے کا اعلان کر دیا جس کے بعد تمام لوگوں نے سامان کھولا اور بستروں میں اوندھے لیٹ گئے۔ آخر سفر مسافروں کو تھکا تو دیتا ہے۔

چار روز بعد جب وہ لوگ اپنے سامان کے ساتھ تفریح کی حسین یادیں بھی باندھ رہے تھے تو ہوٹل کا بیرا بل لے حاضر ہوا' کیمونز نے جستی ٹرے سے بل اٹھایا تو اس کے منہ سے سسکی سی نکلی اور اس نے بل سوٹ کیس کے بکل درست کرتی ڈورتھی کے سامنے رکھ دیا' جس نے جب کاغذ کے اس ٹکڑے پر نظر ڈالی تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ دونوں پیکنگ کا ''ٹاسک'' ترک کر کے ویٹر کی طرف مڑے جو ان دونوں پر گزرتی قیامت سے لاتعلق اپنی کالی بھدی اور سوکھی انگلیوں سے ٹرے بجا رہا تھا: ''آپ لوگ ۸ ڈالر کرائے کے کمرے کا ۲۲ ڈالر یومیہ کیوں وصول کر رہے ہیں؟'' کیمونز نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا: ''سر واشنگٹن کے تمام ہوٹل

کرائے کے علاوہ یومیہ دو ڈالر فی بچہ وصول کرتے ہیں' آپ کے ساتھ ۵ بچے ہیں' لہٰذا ۸+۱۰=۱۸ ڈالر باقی ۴ ڈالر ٹیلی ویژن دیکھنے' ہال میں میوزک سننے' گرم پانی استعمال کرنے اور کافی شاپ جانے کا کرایہ وغیرہ کل ملا کر ۲۲ ڈالر یومیہ بن جاتے ہیں۔'' ویٹر نے ٹرے پر انگلیاں بجاتے ہوئے کہا۔ ''ہوٹل انتظامیہ کی اس کھلی دھاندلی پر کیمونز کا خون کھول اٹھا لیکن کیونکہ جھگڑا کرنا اس کی فطرت نہیں تھا' لہٰذا اس نے خون کے گھونٹ بھرے اور پلٹ کر کمرے میں ٹہلنے لگا جبکہ ڈورتھی نے تھوڑی دیر کی تکرار کے بعد کانپتے ہاتھوں سے ویٹر کو ادائیگی کر دی۔

رخصتی سے ذرا پہلے کیمونز نے کمرے میں ٹہلنا ترک کیا اور اپنے بیوی کے قریب کھڑے ہو کر کہا: ''ڈورتھی میں دنیا میں انتہائی جدید' پُر آسائش اور سستے ہوٹل بناؤں گا' جن میں سوئمنگ پول ہوں گے' ہر کمرے میں ٹیلیفون' ٹی وی اور میوزک چینل ہوگا' ہر کمرے کا اپنا علیحدہ آراستہ باتھ روم ہوگا' ہوٹل میں چوبیس گھنٹے ڈاکٹر اور ڈسپنسری ہوگا اور جہاں بچوں کا الگ کرایہ وصول نہیں کیا جائے گا۔'' ڈورتھی نے ہتھیلی پر پڑے سینٹ گننے کا کام ترک کیا اور شبے سے بھری نظروں سے اپنے خاوند کو دیکھ کر بولی: ''کیونز مسٹ بی جوکنگ'' کیمونز واپس مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کھڑکی کے قریب گیا اور باہر جھانک کر بولا: ''ڈورتھی میں ۴۰۰ ہوٹلوں کی چین بنا کر ثابت کروں گا کیمونز ہی ہوٹل کے بزنس کا ہرکولیس ہے۔''

اور وہ جب بیوی اور پانچ بچوں کے ہمراہ اپنے شہر کے سٹیشن پر اترا تو اس کا چہرہ جذبات سے تپ رہا تھا' اس کی سانسیں گرم اور ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں...... اور آخر ایسا کیوں نہ ہوتا کہ اس کی جیب میں دنیا کے جدید ترین ہوٹل کا نقشہ تھا۔ وہ نقشہ جس میں وہ ریل کے تھکا دینے والے سفر میں مسلسل دو دن تک رنگ بھرتا رہا اور جب اس شام وہ اپنے دیرینہ دوست ''ایڈی بلوسٹین'' کے پاس پلان لے کر گیا تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا: ''گویا تم ...... بنانا چاہتے ہو۔'' کیمونز نے سنا تو چیخ کر بولا: ''ہاں میرے ہوٹلز کی چین کا یہی نام ہو گا۔'' اور ایک طویل عرصے بعد جب اس نے اپنے ہوٹل کی گیارہ سوویں برانچ کا افتتاح اسی دوست سے کرایا تو بوڑھے ایڈی نے روندھی ہوئی آواز میں صحافیوں سے کہا: ''یہ نام تو میں نے انگریزی فلم میں سنا تھا اور صرف کیمونز کا مذاق اڑانے کے لیے دہرایا تھا' مجھے کیا پتا تھا' میں جس شخص کا مذاق اڑا رہا ہوں' وہ اپنی محنت' حوصلے سے دنیا فتح کرے گا۔''

کیمونز کا پہلا ہوٹل ۱۹۵۲ء میں ممفیس میں کھلا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس کامیابی پر اس نے اسی برس شہر کے دوسرے تینوں کونوں میں بھی ہوٹل کھول دیئے جس کے بعد شہر کے سارے ہوٹل ویران ہو گئے۔ سرمایہ آیا' کامیابی کا شہرہ دور دور تک پھیلا تو اس نے اپنے ۴۰۰ ہوٹلز کی چین کے منصوبے میں رنگ بھرنا شروع کر دیا۔ دوستوں سے مشورے کئے' سرمایہ داروں سے ملاقاتیں کیں' منصوبہ سازوں سے ملا اور آخر کار فیصلہ ہوا ہوٹلز کی اس چین کے لیے حصص کا اعلان کیا جائے' لہٰذا اگلے ہی روز ایک لاکھ ۲۰ ہزار شیئرز کا اعلان کر دیا گیا۔ ہر شیئرز ۷.۵۰ امریکی ڈالر کا تھا۔ ساکھ بن چکی تھی' لہٰذا ایک ہی ہفتے میں سرمایہ جمع ہو گیا اور منصوبے پر عملی کام

شروع ہو گیا۔

صرف چھ برس بعد ۱۹۵۸ء میں یہی بھوکا ننگا انجینئر ڈایئر برگ میں اپنے ۵۰ ویں ہوٹل کا افتتاح کر رہا تھا۔ اس کا سوواں ہوٹل ۵۹ء میں کھلا۔ جبکہ امریکہ سے باہر اس کا پہلا ہوٹل ۱۹۶۰ء میں مانٹریال میں بنا اور پانچ سوواں ہوٹل جانسن ٹاؤن میں ۶۱ء میں شروع ہوا۔ ۲۸ برس کی جہد مسلسل کے بعد جب ہوٹل کے ایک کوریڈور میں اسے چکر سا گیا تو اس نے دیوار کا سہارا لے کر سوچا: ''ہاں کیموںز اب تم بوڑھے ہو چکے ہو۔'' اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے تینوں بیٹوں کو بلایا اور دنیا بھر میں پھیلا اربوں ڈالر کا بزنس ان کے حوالے کر کے ہوٹل سے باہر آ گیا۔ پورچ میں ابھی اس نے گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اس کے پرسنل سیکرٹری نے آ کر کہا: ''ایکسیلینسی سر کل ہم دنیا میں ۱۷۵۹ ہوٹل کے مالک بن جائیں گے۔'' کیموںز نے ایک بیزاری کے عالم میں یہ خوشخبری سنی اور کالر جھاڑتے ہوئے بولا: ''جان کرسی پر بیٹھے بیٹھے میری کمر پر نشان آ چکے ہیں' آج ۲۸ برس بعد بستر پر لیٹنا چاہتا ہوں۔''

اگست ۹۷ء کی آخری ساعتوں میں جب دنیا کے نقشے پر پھیلے دو ہزار ایک سو ستر ''ہالی ڈے ان'' ہوٹلز کا مالک یہ بوڑھا کیموںز ولسن اپنی زندگی کا پہلا اور آخری لیکچر دینے کے لیے ہلز کالج کے آڈیٹوریم میں داخل ہوا تو دنیا بھر کے تاجروں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا ہال دنیا کے اس کامیاب ترین انسان کے لیے ۱۳ منٹ تک تالیوں سے گونجتا رہا اور پھر اس نے بزنس کی دنیا کے نئے مسافروں کو مخاطب کر کے کہا: ''مجھے اس اعتراف میں کوئی شرمندگی نہیں کہ جب میں اپنے پہلے ''ہالی ڈے ان'' کا نقشہ لے کر ایڈی کے گھر آیا تو واپسی پر میری جیب میں ٹرام کا کرایہ نہیں تھا لیکن آج زندگی کے طویل اور کامیاب سفر کے بعد میں اعلان کرتا ہوں' کامیابی کے لیے پیسے نہیں جذبے کی ضرورت ہوتی ہے...... آپ پوچھیں گے میں نے زندگی کا یہ ہمالیہ کیسے سر کیا تو نوجوانو میری کامیابی کے صرف تین اصول تھے۔ میں نے کبھی کسی ناکامی پر حوصلہ نہیں ہارا' میں کبھی کسی غلطی پر پشیمان نہیں ہوا اور میں نے کبھی ایک سیکنڈ ضائع نہیں کیا۔ آپ یقین کریں مجھے پوری زندگی خدا سے یہی گلہ رہا کہ اس نے دن کو ۹۰ گھنٹے کا کیوں نہیں بنایا۔''

اور جب وہ بوڑھا بزنس مین ہال سے رخصت ہونے لگا تو ایک صحافی نے روک کر پوچھا: ''مسٹر ولسن زندگی میں آپ کبھی تھکے ہوں۔'' وہ چند لمحوں کے لیے رکا اور پھر گردن موڑ کر بولا: ''میرے بچے اگر مالی تھک جائے تو پودوں پر پھل نہیں لگا کرتے۔''

اور جب میں اس بوڑھے کیموںز کی داستان پڑھ رہا تھا تو میں نے اپنے آپ سے سوال کیا'' کیا ہر شخص فرہاد بن سکتا ہے؟'' تو جواب آیا: ''ہاں اگر اسے کوئی شیریں جیسی تحریک مل جائے۔''

ہڈحرام

لوگ اسے کسی بس سٹاپ' بک شاپ یا شاپنگ سنٹر میں پا کر رک جاتے ہیں' ایک دوسرے کی پسلیوں میں کہنیاں چبھو کر اس کی طرف اشارے کرتے ہیں' اور پھر سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں' وہ دیکھو: ''اینڈریو'' کھڑا ہے اور پھر بچے ادب سے جھک کر سلام کرتے ہیں۔ خواتین ''ہائے مسٹر اینڈریو'' کہہ کر ہاتھ ہلاتی ہیں اور نوجوان بڑے رشک سے ساتھیوں سے پوچھتے ہیں: ''کیا ہم بھی اینڈریو گرو جتنی ترقی کر سکتے ہیں؟'' اس لمحے وہ اس طرح چونک کر آگے پیچھے دیکھتا ہے جیسے پورا نیویارک کسی دوسرے شخص سے مخاطب ہو اور وہ یہ سوچنے میں بے بھی حق بجانب کہ ایک ایسا شخص جس کا باپ گوالا اور ماں کلرک تھی' غربت جس کی تعلیم کی راہ میں کھڑی ہوئی' جس نے شکم کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے ۱۲ برس کی عمر میں مزدوری شروع کی' جو آج تک اچھی انگریزی نہیں بول سکتا' جو سپ لیتے ہوئے قمیص پر جوس گرا دیتا ہے' وسیع لانوں اور پرتعیش کمروں میں' جس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے' جسے اپنی تعریف سن کر پسینہ آ جاتا ہے اور جو عموماً خریدی ہوئی چیزیں دکان پر ہی بھول آتا ہے وہ خود کو دنیا کی ساتویں بڑی فرم کا ''مالک'' کیسے سمجھ سکتا ہے خود کو ۹۷ء کا سب سے بڑا شخص اور بیسویں صدی کا انتہائی دماغ کیسے مان سکتا ہے؟

دسمبر ۲۵ء کی وہ رات آج تک اس کے حافظے سے چپکی ہے جب روسی ہنگری میں داخل ہوئے اور وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ فرار ہو کر آسٹریا آ گیا، جہاں سے وہ ایک گروپ میں شامل ہو کر نیویارک چلا آیا، شہر اجنبی تھا، لوگ اور ماحول پریشان کن اور خود وہ اس قدر نالائق کہ کسی سے نام تک نہیں پوچھ سکتا تھا لہٰذا بے چارگی، بے بسی اور مسافرت تھی، بغیر کچھ کھائے پیے چار چار دن گزر جاتے تھے، ہفتہ ہفتہ ٹوٹے ہوئے پائپوں، پلوں اور متروک عمارتوں میں گزرتا، یہ فاقہ مستی پورے سات ماہ تک اس کے ساتھ رہی۔ یہاں تک کہ ۵۷ء کے وسط تک اسے بس کنڈیکٹری کی نوکری مل گئی۔ اس کے بعد وہ خود کو خوشحال اور سرمایہ دار سمجھنے لگا۔ جیب میں کچھ پیسے آئے تو اس نے سوچا: ''کیا اس نے زندگی بھر مسافروں کی گالیاں ہی سننی ہیں؟'' اندر سے آواز آئی، نہیں، زندگی اس سے کہیں زیادہ کا تقاضا کرتی ہے، پھر سوچا کیا کیا جائے، جواب آیا ترقی اور کامیابی کے زیادہ تر راستے علم سے نکلتے ہیں۔ پھر سوچا، تعلیم کے لیے رقم کہاں سے آئے گی، جواب آیا اگر دن میں

ایک بار کھانا کھالیا جائے، کافی کا ایک کپ پیا جائے اور ریل کے بجائے پیدل سفر کیا جائے تو انسان مر تو نہیں جاتا؟ چنانچہ اس منصوبہ بندی پر عمل درآمد شروع ہوا تو چھ ہی ماہ میں تکیے کے نیچے اتنے پیسے جمع ہو گئے جن سے سٹی کالج نیویارک میں داخلہ لیا جا سکتا تھا۔

کالج میں پہلا دن بھی کم دلچسپ نہیں تھا۔ اینڈریو گروو کی انگریزی بہت واجبی اور سائنس کا علم نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ مثلث، زاویے اور عمودی خطوط میں تفریق نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس کوتاہ علمی کے باوجود وہ ''ماڈرن سائنسز'' رکھنے پر مصر تھا، جب اصرار ضد بن گیا تو پرنسپل اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر بولا: ''اگر کوئی چار فٹ کا بونا دس فٹ اونچی چھلانگ لگانا چاہے تو ہم اسے روکنے والے کون ہوتے ہیں؟'' پرنسپل کا یہ فقرہ بھی اس کے دماغ سے چپک گیا، لہٰذا آنے والے دنوں میں جب بھی وہ نوٹس بنا بنا کر تھک جاتا، کتابوں پر سر کھپا کھپا کر زچ ہو جاتا، ناحل پذیر فارمولوں اور ناقابل فہم تراکیب سے الجھ الجھ کر بور ہو جاتا تو اس کے اندر سے آواز آتی: ''چار فٹ کے بونے کو دس فٹ اونچی چھلانگ لگانے کے لیے یہ سب کچھ تو سہنا پڑے گا۔'' اور وہ سر جھٹک کر دوبارہ کتابوں میں غرق ہو جاتا۔ بونے اور چھلانگ کی یہ ترکیب پی ایچ ڈی تک اس کے ساتھ رہی، بلکہ نہیں، اس کے بعد بھی جب زندگی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تو وہ اسی فقرے سے ہدایت لیتا۔

۶۴ء کی وہ رات بھی اس کے حافظے میں ابھی تک زندہ ہے جب وہ ایوا (اس کی ویٹرس گرل فرینڈ) کے ساتھ ایک تھیٹر سے نکلا اور دونوں ڈرامے کے مکالمے دہراتے ہوئے پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑے۔ اس رات فٹ پاتھ پر بیئر کے خالی ٹن اور فاسٹ فوڈ کے کچلے ہوئے ڈبے بکھرے پڑے تھے۔ اس نے ایک چپکے ہوئے ٹن کو ٹھوکر ماری اور رک کر ایوا پر نظریں گاڑ کر بولا: ''سویٹ ہارٹ تم جانتی ہو میں کیا بننا چاہتا ہوں۔'' ایوا نے گھبرا کر اسے دیکھا اور فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ ''ہوں'' اس نے ہنکارا بھرا اور ساتھ ہی دونوں بازو پھیلا کر بولا: ''دنیا کا سب سے بڑا انسان۔'' ایوا نے سنا تو پورا منہ کھول کر قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستی چلی گئی اور وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ایوا رکی، ہونٹ سکیڑے اور پھر نسبتاً ذرا سنجیدگی سے بولی: ''اینڈریو ماؤنٹ ایورسٹ اونچی تو ہرگز نہیں، آخر بڑے لوگ بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں، ڈیڑھ سو پاؤنڈ وزنی، دو آنکھوں، دو ہاتھوں اور ایک پاؤ دماغ والے انسان، پھر میرا اینڈریو ان میں سے ایک کیوں نہیں ہو سکتا؟'' اس نے فوراً ہاتھ نیچے گرائے اور ایوا کی ٹھوڑی چھو کر کہا: ''ہاں ایوا صرف عقل اور محنت ہی لوگوں کو بڑا بناتی ہے اور میرے پاس یہ دونوں ہیں۔''

۶۸ء میں اس کی زندگی نے ایک اور کروٹ لی اس نے گارڈن مور اور رابرٹ نائیس کے ساتھ مل کر ''انٹیل'' کی بنیاد رکھی (یہ اب دنیا میں کمپیوٹر کی سب سے بڑی فرم ہے) اس وقت اس چھوٹے سے دفتر کو دیکھ کر دنیا کا کوئی شخص پیشین گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ صرف آٹھ برس بعد (۱۹۷۶ء) میں انٹیل امریکہ میں بزنس کا ریکارڈ توڑ دے گی، لیکن اینڈریو گروو کو یہ یقین تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل اور محنت دونوں سے نواز رکھا تھا۔

اینڈریو گروو کا نام آج دنیا کی ساتویں بڑی فرم کے ساتھ آتا ہے۔ ایک ایسی کمپنی جس کے اثاثے ۵۰ بلین ڈالرز سے تجاوز کر چکے ہیں (پاکستان کے کل بیرونی قرضے ۳۲ بلین ڈالرز ہیں) یہ کمپنی ہر سال ۵.۱ بلین ڈالر منافع کماتی ہے۔ (پاکستان کا کل بجٹ ۵۶.۷ بلین ڈالرز ہے) اینڈریو کے ذاتی اکاؤنٹ میں ۳۰۰ ملین ڈالر ہیں۔ اس کمپنی نے پچھلے تیس برسوں میں ساڑھے تین ہزار لوگوں کو کروڑ پتی بنایا۔ ایک سروے کے مطابق ۹۷ء میں دنیا بھر پر ۳۳ ملین کمپیوٹر فروخت ہوئے جن میں سے ۹۰ فیصد کمپیوٹرز میں اینڈریو کی کمپنی کے مائیکرو پراسیسر نصب ہیں، لیکن اس تمام تر کاروباری ٹِش پٹش کے باوجود وہ ابھی تک ۲.۵ × ۲.۷ میٹر کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ اس کا ذاتی عملہ فقط تین افراد پر مشتمل ہے، اس کے پاس کوئی بڑی گاڑی نہیں، کوئی بڑا گھر، کوئی قیمتی چیز نہیں، وہ اپنا کپ خود دھوتا ہے، وہ کمپنی ہی کی کینٹین پر عام کلرکوں، انجینئروں، چپڑاسیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے، برے لینے کے لیے خود کاؤنٹر پر جاتا ہے۔

اس اینڈریو گروو نے ۹۷ء میں مائیکرو چپ ''پینٹیم ٹو'' بنا کر ڈیجیٹل کی دنیا میں ایٹمی دھماکہ کر دیا۔ ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے پور پر سما جانے والے اس مائیکرو چپ کو دیکھ کر کون یقین کرے گا کہ اس نصف انچ کے ٹکڑے پر ۵.۷ ملین (۷۵ لاکھ) ٹرانسسٹر نصب ہیں اور یہ ایک منٹ میں ۵۰۰ ملین ہدایات بجا لاتا ہے اور جس کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے پینٹیم ٹو کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم آج تک زمانہ قبل مسیح میں زندگی گزارتے رہے ہیں جبکہ اینڈریو گروو کا دعویٰ ہے کہ ''میں اس مائیکرو چپ سے ثابت کروں گا انسان اس نصف انچ کے ٹکڑے کے بغیر ادھورا ہے۔''

''ٹائم'' کی ٹیم نے جب اس سال کے آغاز میں اینڈریو پر کور سٹوری چھاپنے کا فیصلہ کیا اور درجنوں صحافی اینڈریو گروو کی جستجو میں لگ گئے تو اس کے اسسٹنٹ جان ڈائز نے صحافیوں کو مخاطب کر کے کہا: ''واٹ اے ٹپیکل باس ہی از، میں نے اس کے ساتھ چھ برس کام کیا، میں نے اس سے عجیب و غریب باس پورے امریکہ میں نہیں پایا۔ یہ آپ کو قتل تک معاف کر دے گا لیکن اس کے نزدیک کام میں کوتاہی، وقت کے ضیاع اور دوران ڈیوٹی فضول گپ شپ کی کوئی معافی نہیں۔'' ایوا اس کی بیوی نے مسکرا کر جواب دیا: ''اینڈریو گروو کسی شخص نہیں ایک جدوجہد کا نام ہے۔'' اس کے بچوں نے کہا: ''ہم نے تو اسے ایک شفیق انسان پایا جو بڑی سے بڑی بات ہنس کر پی جاتا ہے۔'' اس کے اکاؤنٹنٹ نے کندھے اچکا کر کہا: ''یہ شخص ناقابل فہم ہے، اس نے اپنی ساری آمدنی فلاحی کاموں کے لیے وقف کر رکھی ہے، ہر سال کیمسٹری کے دس وظیفے جاری کرتا ہے، ہنگری سے آنے والے نوجوانوں کو تلاش کر کے سیٹل کراتا ہے، خیراتی اداروں کو فنڈز دیتا ہے، انٹرنیشنل ریسکیو کمیٹی کو رقم فراہم کرتا ہے اور پراسٹیٹ کینسر کے مریضوں کا علاج کراتا ہے۔''

اور جب اسے ''مین آف دی ۹۷ء'' کے ٹائٹل کی اطلاع دی گئی تو وہ اپنی لیبارٹری میں کام کر رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا، چشمہ اتار کر میز پر رکھا، ایک ادھورا سانس لیا اور پھر مسکرا کر بولا: ''ٹھیک ہے لیکن ابھی

اینڈریو کا مشن پورا نہیں ہوا، تھینک یو ویری مچ جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیجیے گا، میں کام کے دوران شور پسند نہیں کرتا۔''

جب ''ٹائم'' کی ٹیم نے اس کا انٹرویو شروع کیا تو وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا اور اس کے لہجے میں ہنگری کے دیہاتیوں کا گنوار پن تھا، وہ جب پینیٹم ٹو کا نقشہ اٹھانے کے لیے مڑا تو خاتون صحافی نے اپنے ساتھی سے سرگوشی میں پوچھا: ''کیا واقعی یہی وہ شخص ہے جسے مین آف دی ایئر کہا جاتا ہے؟'' اس کے حساس کانوں نے یہ سرگوشی سن لی، وہ وہیں سے مڑا اور خاتون کو مخاطب کر کے بولا: ''میڈم اینڈریو گروو کو اینڈریو گروو اس کی زبان نے نہیں اس کے ہاتھوں نے بنایا ہے۔''

اور پھر جب پوچھنے والوں نے پوچھا: ''کیا آپ دنیا بھر کے بیروزگاروں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟'' اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں، لمبا سانس لیا اور پھر صحافیوں سے مخاطب ہوا: ''میرا خیال ہے دنیا میں کوئی بیروزگار نہیں کہ جس شخص کو قدرت نے عقل سے نوازا ہو، دو ہاتھ دیئے ہوں، وہ بیروزگار کیسے رہ سکتا ہے، محروم، نادار اور مسکین کیسے ہو سکتا ہے؟'' خاتون صحافی نے پوچھا: ''لیکن اس وقت دنیا میں بیروزگاروں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔'' اس نے قہقہہ لگایا اور پھر چمکتی ہوئی نظریں خاتون صحافی پر گاڑ کر بولا: ''آپ غالباً پست حوصلہ اور ہڈ حرام لوگوں کو بیروزگار کہہ رہی ہیں۔''

اعتماد

وہ پڑھاتے پڑھاتے تھک جاتا تو اکتا کر کیمپس سے باہر آ جاتا، باہر چٹا گانگ کے دیہات تھے، غربت، مصیبت اور بیماری کے مارے دیہات جن کی کیاریوں میں بھوک اگتی اور مشقت کاشت ہوتی تھی۔ وہ کھیتوں سے گزرتا اور باریک پسلیوں پر منڈھی سیاہ جلد کی تحریر پڑھتا جاتا، زرد، میلی اور بے زار آنکھوں کے شکوے جمع کرتا جاتا، زندگی کی ارزانی اور بے قدری کے نوحے چنتا جاتا اور سوچتا جاتا: ''میں محمد یونس چٹا گانگ یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کا پروفیسر، لوگوں کو معاشیات کی تعلیم دینا جس کا کام ہے، عملی طور پر ان لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ میری زندگی اور میرے اقوال میں کتنا تضاد ہے'' یہاں پہنچ کر ایک گہرا دکھ اسے آ گھیرتا اور وہ گھبرا کر واپس پلٹتا اور تیز تیز قدم اٹھاتا دوبارہ کیمپس میں پناہ گزین ہو جاتا، یہ اس کا معمول تھا۔

ایک روز جب تھکا ہارا سورج خلیج بنگال پر جھک کر اپنا منہ دیکھ رہا تھا، تو وہ حسب معمول کیمپس کے ایک قریبی گاؤں میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے چلنے لگا، آج پھر وہ فیصلہ کر کے آیا تھا، وہ فیصلہ جو وہ پچھلے چند ماہ سے مسلسل باندھ رہا تھا، لیکن بوڑھیا کی ڈیوڑھی آتے ہی توڑ کر آگے نکل جاتا، بوڑھیا آج بھی معمول کے مطابق کھردرے بان کے موڑھے بنا رہی تھی، آج بھی اس کی کچی ڈیوڑھی میں جلتا ہوا کڑوے تیل کا چراغ ٹمٹما کر شام غریباں کا پیغام دے رہا تھا، پروفیسر رکا کھنگار کر گلا صاف کیا اور سلام کر کے بوڑھیا کے قریب کھڑا ہو گیا۔ بوڑھیا نے چونک کر اوپر دیکھا، اس کے مشین کی طرح چلتے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے اور آنکھوں میں وحشت بجلی کی طرح کوندگئی، پروفیسر فوراً گھبرا گیا، اس نے پرائمری کے کند ذہن بچے کی طرح شکستہ لہجے میں پوچھا: ''اماں تم اتنے موڑھوں کا کیا کرتی ہو؟'' بوڑھیا نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے ہاتھ دوبارہ چلنے لگے، چند ساعتیں گزر گئیں، بوڑھیا رکی اور نہ ہی پروفیسر ٹلا، یہاں تک کہ موڑھے کا پیندا مکمل ہو گیا۔ بوڑھیا نے اسے پرے پھینکا اور ٹانگیں پسار کر بولی: ''کرنا کیا ہے، شام کو ٹھیکیدار کو دے دیتی ہوں۔'' پروفیسر وہیں چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ ''ٹھیکیدار آپ کو کتنے پیسے دیتا ہے؟'' اس نے پوچھا ''دو ٹکے'' بوڑھیا نے مختصر سا جواب دیا۔ ''ٹھیکیدار یہ کتنے کا بیچتا ہے؟'' ''بیس ٹکے کا!'' بوڑھیا نے فوراً جواب دیا۔ ''اس طرح تو ۱۸ ٹکے ٹھیکیدار لے جاتا ہے'' اس کی آواز میں لرزش تھی ''ہاں لے جاتا ہے۔'' بوڑھیا نے اکتا کر کہا ''آپ

بازار میں خود موڑھے کیوں نہیں بیچتیں؟'' لرزش کی جگہ حیرت نے لے لی'' میں موڑھے بناؤں یا بیچوں؟'' بوڑھیا نے دوبارہ ٹانگیں تہہ کیں اور موڑھا اٹھا کر تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔

اس روز پروفیسر واپس آیا تو خوشی سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہاتھوں میں سنسناہٹ تھی، اس نے آتے ہی کمرہ اندر سے بند کیا اور کاغذ قلم لے کر معاشی دنیا کا نیا فارمولا تیار کرنے لگا، اس نے لکھا بوڑھیا اس لیے ۲۰ ٹکے کا موڑھا ۲ ٹکے میں فروخت کرنے پر مجبور ہے کہ اسے شام کو روٹی کے لیے پیسے چاہئیں۔ اگر کوئی شخص اسے ہفتے بھر کے راشن کے پیسے دے دے تو وہ مال تیار کر کے شہر لے جائے اور سینکڑوں روپے کما کر واپس آئے۔ اس رات وہ دیر تک کام کرتا رہا، یہاں تک کہ صبح صادق کی کرنوں نے اس کی کھڑکی پر دستک دی۔ اس نے چونک کر آسمان کے کناروں سے منعکس ہوتی روشنی پر نگاہیں گاڑ دیں اور ایک مسرت سے بھرپور سانس لے کر کہا'' تھینک گاڈ اب میں بنی نوع انسان کے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔''

اس نے آئندہ چند روز میں اس گاؤں کے ایسے ۴۲ خواتین و حضرات کی فہرست بنائی جو موڑھے بنا کر ٹھیکیداروں کو فروخت کرتے تھے، اس نے ان لوگوں کے انٹرویوز کیئے، ان کے اقتصادی مسائل سنے تو پتا چلا اگر کوئی شخص ان لوگوں کو ۳۰ ڈالر قرض دے دے تو یہ لوگ ٹھیکیداروں کے چنگل سے ہمیشہ کے لیے رہائی پا سکتے ہیں۔ اس نے اپنی جمع پونجی گنی تو وہ کچھ اتنی ہی نکلی، اس نے پیسے لیے اور اس گاؤں چلا گیا۔ ۴۲ لوگوں کو جمع کیا، ان کی ایک ''فرم'' بنائی اور ۳۰ ڈالر ان کے حوالے کر دیئے۔ زبانی ایک سمجھوتا طے پایا کہ وہ لوگ موڑھے بنا کر براہ راست مارکیٹ میں بیچیں گے، ۸۰ فیصد منافع اپنے پاس رکھیں گے اور ۲۰ فیصد اسے ادا کریں گے، فریقین نے گردنیں ہلا کر سمجھوتے کی تصدیق کر دی۔

کام شروع ہوا تو دنوں ہی میں نہ صرف ڈاکٹر یونس کے ۳۰ ڈالر واپس آ گئے بلکہ ان ۴۲ لوگوں کے چہروں پر بھی خوشحالی ٹھاٹھیں مارنے لگی، مکان پکے ہونے لگے، گھروں میں تین تین وقت روٹی پکنے لگی، بچوں اور خواتین کے چار چار جوڑے کپڑے بننے لگے، تجربہ کامیاب ہو گیا۔

۱۹۷۶ء کے اواخر میں ڈاکٹر یونس نے بینکوں میں ملازم اپنے پرانے طالب علموں کو چائے کی دعوت دی، سارے طالب علم بخوشی حاضر ہو گئے، چائے سرو ہوئی جب سب آدھا آدھا کپ ''سپ'' کر چکے تو ڈاکٹر یونس نے یہ قصہ سنایا، سب نے دلچسپی سے سنا آخر میں ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ نہ صرف اس کے ۳۰ ڈالر واپس مل چکے ہیں بلکہ اسے روزانہ چالیس پچاس ٹکے بھی موصول ہو رہے ہیں۔ سب نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا، ڈاکٹر خوش ہوا اور اپنا پلان ان کے سامنے رکھ دیا۔ ''صاحبو اگر میری جگہ کوئی ادارہ یا بینک لے لے تو اگلے ۲۰ برسوں میں ۶۸ ہزار دیہات کی تقدیر بدل سکتی ہے۔'' طالب علموں نے سنا تو قہقہہ لگا کر بولے: ''سر آپ کس خیالی دنیا میں رہ رہے ہیں، دنیا کا کوئی بینک اتنا بڑا رسک نہیں لے گا۔ آپ پڑھانے پر توجہ دیں، اکانومسٹ نہ بنیں۔'' ڈاکٹر یونس کو ان کا مذاق برا لگا، لہٰذا اس نے اپنا پلان کامیاب بنانے کا فیصلہ کر لیا، ہر

قیمت پر، ہر صورت میں۔

ڈاکٹر یونس نے طالب علموں سے مایوس ہو کر بینکوں کے اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ وہ ان سے ملتا، اپنا پلان ان کے سامنے رکھتا، انہیں بتاتا "جتنا ایماندار غریب آدمی ہوتا ہے، اتنا کوئی امیر نہیں ہو سکتا۔ آپ اس پر اعتماد کر کے دیکھیں، وہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔" لیکن کوئی بینک ۳۰ ڈالر سے کئے گئے تجربے کی بنیاد پر اتنا بڑا رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ڈاکٹر یونس مسلسل ۶ ماہ تک ایک بینک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں دھکے کھاتا رہا، لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

۷۷ء کے شروع میں ایک بینک نے اس کی ذاتی گارنٹی پر کسانوں کو قرضے دینے کی حامی بھر لی۔ ڈاکٹر یونس تیار ہو گیا، اس نے ایک پسماندہ گاؤں منتخب کیا اور اپنی گارنٹی پر لوگوں کو آسان شرائط پر قرضے لے دیے، چھ ماہ بعد بڑے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے، تمام کسانوں نے نہ صرف بروقت قسطیں ادا کر دیں بلکہ خوشحال بھی ہو گئے۔ بینک کو حوصلہ ہوا اور اس نے مزید دو تین دیہات کے لوگوں کو قرضے جاری کر دیئے۔ اس بار بھی نتائج حوصلہ افزا نکلے۔ بینک کے اعلیٰ عہدیداروں نے ڈاکٹر یونس کو بلایا اور دیر تک تالیاں بجا کر اس کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ڈاکٹر یونس اپنی کرسی پر براجمان ہوا اور بنگلہ دیش کے بڑے بڑے بینکاروں کو مخاطب کر کے بولا: "حضرات آپ لوگ ایک ایسا بینک کیوں نہیں بناتے، جو صرف غریب دیہاتیوں کو قرضے دے۔" بینکاروں نے تجویز کی تائید کر دی۔

۱۹۷۷ء کی وہ صبح ڈاکٹر یونس کے لیے عظمت کا پیغام لے کر طلوع ہوئی کیونکہ دنیا میں غریبوں کا پہلا بینک قائم ہو چکا تھا۔ "دی گرامین بینک" ایک ایسا بینک جس کے نوے فیصد شیئرز ان غریب دیہاتیوں کے پاس تھے جنہوں نے گرامین سے قرض لے کر زندگی کے دیے میں تیل ڈلوایا (حکومت کے پاس صرف دس فیصد شیئرز ہیں) ایک ایسا بینک جو قرض دیتے ہوئے کوئی گارنٹی طلب نہیں کرتا، جس کی شرح سود نہ ہونے کے برابر ہے، جو فارم پر دستخط اور انگوٹھا بھی نہیں لگواتا، صرف اعتماد کرتا ہے اور جواب میں اعتماد پاتا ہے۔

گرامین بینک صرف ۱۰۰ ڈالر قرضہ دیتا ہے، قرضہ لینے کی دو شرطیں ہیں۔ ایک، آپ غریب ہوں، دوسرا آپ اپنا کوئی "بزنس" سیٹ کرنا چاہتے ہوں۔ ریڑھی لگانا چاہتے ہوں، سائیکل رکشہ خریدنا چاہتے ہوں یا دستکاری کی چھوٹی ورکشاپ بنانا چاہتے ہوں یا پھر کوئی بھی ایسا کام کرنا چاہتے ہوں جو آپ کے حالات بدل دے۔

ان ۲۱ برسوں میں بنگلہ دیش میں گرامین کی ۱۰۴۱ برانچیں قائم ہوئیں، جن میں ۱۱ ہزار لوگ ملازم ہیں، ان ۱۱ ہزار لوگوں نے بنگلہ دیش کے ۳۴ ہزار دیہاتوں کے ۲۰ لاکھوں بنگالیوں کی تقدیر بدل دی۔ انہیں غربت کے جہنم سے نکال کر باوقار زندگی کے راستے پر کھڑا کر دیا۔

گرامین دنیا کا واحد بینک ہے، جس میں کوئی نادہندہ نہیں، جس کے بزنس میں ہر سال دو گنا اضافہ ہوتا ہے، جس کے بورڈ آف گورنرز کے ۱۳ میں سے ۹ ممبر عام ان پڑھ دیہاتی ہیں۔

عظیم ہے ڈاکٹر یونس، جس نے دنیا کے غریب کا اعتماد بحال کیا اور عظیم تر ہیں چٹاگانگ کے وہ دیہاتی جنہوں نے ڈاکٹر یونس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچا کر دنیا بھر کے غریبوں، اقتصادی معذوروں اور ناداروں کے لیے نیا راستہ کھول دیا، کامیابی اور روزگار کا راستہ۔

لیکن نظر سوال کرتی ہے، کیا پاکستان کی ۱۵ کروڑ کی آبادی میں ایک بھی ڈاکٹر یونس نہیں جو ایدھی کی طرح جھولی پھیلا کر نکلے اور ایک نئے ''گرامین'' کی بنیاد رکھے کہ غریب خواہ بنگلہ دیش کا ہو یا پاکستان کا جاگیردار، سرمایہ دار اور بزنس مین سے کہیں زیادہ ایماندار ہوتا ہے۔

کوئی ہے جو پاکستان کے غریب پر بھی اعتماد کرے؟

معجزے

جونہی بحر الکاہل کی یخ بستہ ہوائیں طیارے کے پروں سے ٹکراتی ہیں، سرخ بتیاں آن ہو جاتی ہیں، مسافر سگریٹ بجھانا شروع کر دیتے ہیں، فضائی میزبان گلاس، بوتلیں اور گتے کی پلیٹیں سمیٹنے لگتے ہیں، سیفٹی بیلٹس کی کلک، ٹک اور شیٹ کی آوازیں ابھرنے لگتی ہیں، اچانک اس کروٹ لیتے ماحول میں ایک سریلی، مدہم اور روح تک اثر کرنے والی نقرئی آواز گونجتی ہے۔ ''خواتین و حضرات ہم چند لمحوں میں اوسا کا پہنچنے والے ہیں، اگر آپ اپنی نظریں کلاک کے ڈائل پر مرکوز کر لیں تو ٹھیک دس سیکنڈ بعد آپ اپنی کھڑکی سے دنیا کا حیرت انگیز ایئر پورٹ دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ پانی پر بنا دنیا کا پہلا ایئر پورٹ، خواتین و حضرات وقت کی آواز سنیں۔'' نقرئی آواز خاموش ہو جاتی ہے جس کے ساتھ ہی سپیکر سے گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک نشر ہونے لگتی ہے، ٹھیک پانچ سیکنڈ بعد سارے مسافر اپنی ناک کھڑکیوں کے شیشوں سے جوڑ لیتے ہیں اور پھر آنکھوں میں حیرت نمی بن کر تیرنے لگتی ہے، چہرے خوف اور استعجاب سے پیلے پڑ جاتے ہیں اور ہونٹوں پر سسکیاں چپک جاتی ہیں۔

گہرے، نیلے اور ٹھنڈے سمندر میں گھرا ''اوسا کا'' جاپان کا ایسا شہر ہے جسے جب بین الاقوامی ہوائی اڈے کی ضرورت پڑی تو شہر میں طویل رن وے، لاکھوں مسافروں کے لیے سینکڑوں ایکڑ پر پھیلے لاؤنج، ریسٹورنٹس، بکنگ آفیسز، شاپنگ سنٹرز اور ٹیکسی سٹینڈز کے لیے ایک چپہ زمین نہیں تھی لیکن جب سیاہ آنکھوں اور پستہ ناکوں والے زرد رو جاپانی سر جوڑ کر بیٹھے تو انہوں نے سوچا زمین بھی نہیں اور ایئر پورٹ بنانا بھی ضروری ہے، کیا کیا جائے؟ نقشے سامنے پھیلا دیئے گئے، محدب عدسے اور کاربن پنسلیں نکال لی گئیں، تھرماس میں گرم کافی بھر لی گئی اور پھر گفتگو شروع ہو گئی، دلیل کے جواب میں دلیل اور سوال کے مقابلے میں سوال اٹھنے لگا۔ ایک گھنٹہ گزرا، دوسرا گزرا، تیسرا گزرا، یہاں تک کہ شام ہو گئی، لیکن کاربن پنسلیں چلتی رہیں، کافی کے کپ خالی ہوتے رہے۔ گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، جب بات کسی نتیجے پر پہنچتی نظر نہ آئی تو اچانک چیف انجینئر نے ہاتھ اٹھائے اور سب کو مخاطب کر کے بولا: ''بس طے ہو گیا ہم شہر سے پانچ کلومیٹر دور عین سمندر میں ہوائی اڈہ تعمیر کریں گے۔'' سننے والوں کے چہرے دھواں ہو گئے، ایک نوجوان انجینئر نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا

''لیکن سر یہ کیسے ممکن ہے؟'' چیف انجینئر مسکرایا، کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا: ''جب اتنی لمبی چوڑی دنیا پانی پر قائم رہ سکتی ہے تو چند میل لمبا رن وے کیوں نہیں ٹھہر سکتا،'' ایپی انجیکشن'' سب انجینئر جاپانی روایات کے مطابق رکوع میں جھکے اور یک آواز ہو کر بولے ''تو تو سر۔''

پھر دنیا کا یہ حیرت انگیز پراجیکٹ شروع ہو گیا، موٹے موٹے غبارے رسیوں کے ساتھ باندھ کر پانی میں ''مارکنگ'' کی گئی بڑے بڑے بحری جہازوں پر چین سے پتھر لائے گئے، اوساکا کے ساحل پر نصب کرش مشینوں کے ذریعے ان کی بجری بنائی گئی، مارکنگ والی جگہ کو ایک سانچے کی شکل دی گئی۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو اس سانچے کو سیمنٹ، تارکول اور کیمیکل سے بھرنے کا موقع آیا، جاپانی اٹھے اور سینکڑوں ایکڑ طویل سانچے میں ۲۰ میٹر گہرائی تک کرش بھرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ پانی میں خشکی کا ایک طویل، مضبوط اور ہموار ٹکڑا ابھر آیا۔

ایک روز جب اوساکا شہر کی آسمان بوس عمارتیں پانی میں ٹھہرے خشکی کے اس ٹکڑے کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں تو پستہ قامت چیف انجینئر جو اس پر چہل قدمی کر رہا تھا، مڑا اور پھر قریب کھڑے جونیئر کو مخاطب کر کے بولا: ''شیکو موتو جب ہماری تخلیق کردہ اس زمین کا شہر سے رابطہ ہو گا اور دنیا بھر کے مسافر یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آئیں گے تو انسانی عقل پانی پر قائم اس مصنوعی شہر کا وجود کیسے تسلیم کرے گی۔'' شیکو موتو نے عقیدت سے آنکھیں جھکا کر کہا ''سر کانسائی ایئر پورٹ انسانی زندگی کے عظیم معجزوں میں سے عظیم ترین معجزہ ہے۔''

اور پھر بجری، سیمنٹ اور تارکول سے تخلیق کردہ خشکی کے اس ٹکڑے پر ایئر پورٹ کی تعمیر شروع ہو گئی، لاؤنج بنائے گئے، برآمدے بنائے گئے، ریسٹورنٹ اور بکنگ آفسز بنائے گئے، کارگو کے گودام اور ٹیکسی سٹینڈ بنائے گئے، آگ بجھانے کے سنٹرز اور سمندری طوفان سے بچاؤ کے لیے حفاظتی بند باندھے گئے، زلزلوں سے حفاظت کے لیے خصوصی نظام تشکیل دیئے گئے، جہازوں کو سمندری ہواؤں، برفباری اور بارش سے بچانے کے لیے خصوصی شیڈ بنائے گئے، جب یہ سب کچھ مکمل ہو گیا تو اسے ''موٹر وے'' اور ریلوے کے خصوصی نظام کے ذریعے شہر سے ملا دیا گیا اور اب دنیا کے اس عجیب و غریب ایئر پورٹ پر بیک وقت ۴۱ طیارے ''پارک'' ہو سکتے ہیں۔ (اسلام آباد ایئر پورٹ جبکہ کراچی ایئر پورٹ پر ۴۲ طیاروں کی پارکنگ کی گنجائش ہے۔) دنیا بھر سے ایک لاکھ مسافر روزانہ آ اور جا سکتے ہیں جبکہ اوساکا شہر کے کسی بھی کونے سے ریل کے ڈبے، بس یا ٹیکسی کے ذریعے کوئی بھی شخص ۳۰ منٹ میں کانسائی ایئر پورٹ کے گیٹ پر پہنچ سکتا ہے۔

۱۹۹۴ء میں جب یہ ایئر پورٹ مسافروں کے لیے کھولا گیا، تو پہلی امریکی فلائٹ سے اوساکا پہنچنے والے مسافروں نے منصوبے کے ''خالق'' سے ملنے کی آرزو کی۔ پراجیکٹ منیجر مسکرا کر بولا: ''آؤ میرے پیچھے آؤ'' حیرت زدہ امریکی اس زرد رو جاپانی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ منیجر انہیں رن وے کی دیوار کے قریب

لے گیا جہاں ایک پستہ قد زرد جاپانی سر پر آہنی ٹوپی رکھے کام کا جائزہ لے رہا تھا۔ منیجر نے تالی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور ہجوم کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' اس نے خوش دلی سے سر سے آہنی ٹوپی اتار کر جاپانی لہجے میں پوچھا ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' ایک امریکی نے آگے بڑھ کر تعارف کرایا ''میں پیشے کے لحاظ سے صحافی ہوں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں آپ نے پراجیکٹ کتنے عرصے میں مکمل کیا۔'' جاپانی انجینئر عجز سے جھکا، پھر سیدھا ہوا اور گردن اکڑا کر بولا ''سکس ایئرز'' ''اوہ نو۔'' ہجوم کے منہ سے سسکی نکلی۔

''لیکن آپ نے یہ کیا کیسے؟'' ایک امریکی خاتون بولی: ''ویری سمپل۔'' انجینئر مسکرا کر بولا: ''ویری سمپل'' اس نے شہادت کی انگلی سے اپنی کنپٹی پر دستک دی اور بولا ''اس سے۔'' پھر شہادت کی انگلی اٹھائی پنجہ کھول کر ہوا میں لہرایا اور پھر بولا ''اور اس سے۔'' تھوڑا سا توقف کیا اور پھر ہجوم پر نظریں جما کر بولا: ''دنیا کے سارے معجزے انہی دونوں جگہوں میں چھپے ہیں۔ خواتین و حضرات اگر آپ جاپانی قوم سے کہیں تو وہ چھ برس میں آپ کے سامنے ایک نیا ہمالیہ کھڑا کر سکتی ہے۔'' ساتھ ہی اس نے دوبارہ ہوا میں پنجہ لہرایا اور کہا: ''کیونکہ اس کا یہ'' پھر ہاتھ تہہ کر کے شہادت کی انگلی سے کنپٹی پر دستک دی اور بولا: ''اور اس کا یہ، دونوں کام کرتے ہیں۔''

جونہی میں فیض آباد فلائی اوور پر پہنچا، ایک جھٹکے کے ساتھ چاروں ٹائر کھڈے میں گرے، میں سیٹ سے اچھلا اور میرا سر گاڑی کی چھت سے جا ٹکرایا، ساتھ ہی آنکھوں میں تارے چمکنے لگے، میں نے فوراً بریک لگائی چرچراہٹ کی آوازیں اٹھیں اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں سٹیئرنگ پر گر گیا، میرے ساتھ بیٹھے آفتاب نے میرے گال تھپتھپائے۔ میرے کندھوں کو جھٹکے دیئے، میرا سر سہلایا تو میں نے آنکھیں کھول کر ایک لمبا سانس لیا اور پھر آفتاب کو مخاطب کر کے کہا: ''چودھری میں چوٹ سے نہیں بلکہ یہ سوچ کر بے ہوش ہوا ہوں کہ ایک قوم چھ برس میں سمندر پر خشکی اگا دیتی ہے، لیکن دوسری قوم، جو تعداد اور عقل میں اس سے کئی گنا بڑی ہے ساڑھے چھ برس میں ایک فلائی اوور مکمل نہیں کر سکتی، آخر کیوں؟'' آفتاب نے ایک طویل قہقہہ لگایا اور پھر شہادت کی انگلی سے کنپٹی پر دستک دے کر بولا: ''کیونکہ اس کا یہ'' ساتھ ہی ہاتھ کھول کر پنجہ لہرا کر بولا اور ''اس کا یہ کام نہیں کرتا۔'' میں نے چابی گھما کر گاڑی سٹارٹ کی ایکسیلیٹر پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور جاپانی گاڑی آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔ میں نے دایاں ہاتھ سٹیئرنگ سے اٹھایا اور ہتھیلی سے دل کی جگہ تھپتھپا کر بولا: ''نہیں چودھری آفتاب اس کا صرف یہ کام نہیں کرتا۔''

ہاں جس قوم کے سینے میں دل نہیں ہوتا اس کی عقل اور اس کے ہاتھوں میں معجزے نہیں ہوتے۔

ننگے پاؤں

میری بیوی اس فیصلے کی تشہیر نہیں چاہتی، اس کا کہنا ہے اظہار سے نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں، انسان کو نیت کا پھل نہیں ملتا لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں کیونکہ میری ناقص رائے میں نیکیاں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک وہ جو کسی خاص شخص یا ادارے سے متعلق ہوں، دوسری وہ جو پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہیں، پہلی قسم کی نیکیاں یقیناً پوشیدہ رہنی چاہئیں کہ ان کے اظہار سے خدا کے بندوں کی عزت نفس پر زد پڑتی ہے جبکہ دوسری قسم کی نیکیاں چھپائے رکھنا ''گناہ'' ہے کیونکہ یہ تو چھوٹے موٹے احساسات، جذبات اور چھلک پڑنے والے لمحے ہوتے ہیں جو پورے معاشرے کا مزاج طے کرتے ہیں، ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلاتے ہیں، ایک پھول سے دوسرا پھول کھلاتے ہیں، اگر یہ جذبے، یہ آنسو اور احساس سے بھیگے یہ لمحے بھی سینوں میں دبک کر رہ جائیں تو شاید معاشرے میں نیکی کی نمو رک جائے، معاشرے میں بے حسی بڑھ جائے اصلاح احوال کی تحریک دم توڑ جائے، لیکن میری بیوی کو میرے اس فلسفے سے اتفاق نہیں۔

کل اسلام آباد کا ایک گرم دن تھا، سورج کی شعاعیں تیر کی طرح جسم میں اتر رہی تھیں۔ پسینہ سانپ کی طرح چوٹی سے تلوؤں کی طرف رینگ رہا تھا، حلق بارش کو ترستی چٹان کی طرح چیخ رہا تھا اور روح بدن کی گرمی سے توے پر گری بوند کی طرح سسک رہی تھی، میں بیوی بچوں کے ساتھ ہاسپٹل کمپلیکس سے بلیو ایریا کی طرف جا رہا تھا، گاڑی میں چیخ و پکار اور ہاہا کار مچی تھی، بیوی شکوہ کر رہی تھی، میں نے گاڑی پارک کرتے ہوئے احتیاط نہیں برتی لہٰذا آدھ گھنٹے میں گاڑی دوزخ بن گئی، بچے بھی مجھے ہی الزام دے رہے تھے، ان سب کا خیال تھا اس حبس، تپش اور پسینے کا واحد مجرم میں ہوں کیونکہ میری روایتی سستی سے انہیں ''یہ دن دیکھنا پڑا'' لیکن میں معمول کے مطابق اس احتجاج پر توجہ دیئے بغیر کان لپیٹے گاڑی چلا رہا تھا، جب ہم لوگ شاہراہ فیصل کے اس چوراہے پر پہنچے، جہاں سے ایک سڑک زیرو پوائنٹ، دوسری فیصل مسجد اور تیسری بلیو ایریا کی طرف جاتی ہے تو سگنل ریڈ ہو گیا، ہم بھی دوسری گاڑیوں کے ساتھ رک گئے۔ میں اس فرصت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹشو سے گردن کا پسینہ خشک کرنے لگا، میرے دونوں بیٹے پچھلی سیٹ پر چاکلیٹ کے لیے دست و گریباں تھے جبکہ بیوی اخبار سے ''اے سی'' کا کام لینے کی کوشش کر رہی تھی، باہر واقعی بہت گرمی تھی۔ یونہی گردن پر ٹشو

رگڑتے رگڑتے میری نظر سامنے گاڑیوں کی دوسری قطار پر پڑی میرا ہاتھ وہیں رک گیا، نظریں ٹھہر گئیں اور دل حلق میں آ گیا، میرے سامنے، بالکل سامنے ایک بچہ تھا، پانچ ساڑھے برس کا بچہ، میرے بڑے بیٹے کا ہم عمر، پر اس سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ پرکشش، لیکن اس میں ایک کمی تھی میرے بیٹے کے برعکس اس کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا، وہ میرے محسوسات سے لاتعلق پگھلے ہوئے تارکول پر پاؤں رکھتا ہوا ایک گاڑی کے قریب پہنچا، انگلی سے اس کے شیشے پر دستک دی، صاحب کار اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے بھیک کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ دیے، یقیناً اس لمحے اس کی آنکھوں میں بھوک، چہرے پر بے چارگی اور آواز میں رحم کی اپیل ہوگی لیکن میں یہ پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں تو اس کے چہرے کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا، میری نظروں کا محور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں تھے جن پر مٹی، دھول اور میل کے دھبوں کے ساتھ ساتھ پگھلے ہوئے تارکول کے داغ تھے، اس کی انگلیاں سوجی ہوئی تھیں اور پیروں کے کوہانوں پر خون کی لکیریں رینگ رہی تھیں، وہ نامہربان دہکتی زمین سے بچنے کے لیے کبھی ایڑیوں کے بل کھڑا ہوتا، کبھی پنجوں پر زندہ جسم کا جنازہ اٹھاتا اور کبھی پورے معاشرے کی بے حسی کا بوجھ تلوؤں پر ڈال دیتا، لیکن تپش تو تپش ہوتی ہے، آگ تو آگ ہوتی ہے، وہ ایڑیوں کو بھی اتنا ہی جلاتی ہے جتنا پنجوں اور تلوؤں کو۔

میں نے غور کیا بچہ شیشوں پر دستک دیتا ہے، ہاتھ باندھتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ گاڑی سے کوئی جواب آئے، تیزی سے دوسری گاڑی کی طرف بڑھ جاتا ہے، میں نے اندازہ لگایا اس ''نقل مکانی'' سے یقیناً اس کے پاؤں کو آرام ملتا ہوگا یا ہو سکتا ہے اسے گاڑی ''والوں'' کے جواب کا ادراک ہو ٹھیک اسی لمحے میری بیوی نے گرمی کی شکایت کی تو میں نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کر دیا، بیوی نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر حیرانی سے اس اشارے کی طرف متوجہ ہوئی تو اس کا ہاتھ بھی رک گیا، آنکھیں پھیل گئیں اور چہرے پر دکھ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

میری بیوی عام پنجابی عورتوں کی طرح بڑی رقیق القلب ہے، اسے بھی رونے کے لیے کسی خاص واقعے یا سانحے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ بھی حسب ضرورت ماچس نہ ملنے، ترکاری جل جانے یا استری سے کپڑے خراب ہو جانے پر سارا دن رو سکتی ہے لیکن یہ منظر تو واقعی سانحے سے کم نہیں تھا، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، میرے بیٹوں کی جنگ بدستور جاری تھی غالباً چھوٹے نے بڑے کے بال کھینچ لیے تھے جس کے جواب میں وہ زور و شور سے چلا رہا تھا جبکہ چھوٹا دانتوں سے چاکلیٹ کی پیکنگ پھاڑنے میں مصروف تھا، بیوی نے میری طرف دیکھا اور اس کے منہ سے سسکی نکلی ''یہ تو ہمارے فیضی جتنا ہے'' اور پھر اس کی دونوں آنکھیں ''نیاگرا'' بن گئیں، میں نے بچے کو بلانے کے لیے ہاتھ باہر نکالا لیکن سگنل گرین ہو چکا تھا پوری کائنات ہارنوں سے گونج اٹھی تھی ٹریفک کی چیونٹی آگے سرکنے لگی اور بچہ دوڑ کر دوسرے سگنل پر کھڑی گاڑیوں میں گم ہو گیا۔

میں نے بیوی سے، ایوان صدر سے شاہراہ دستور کی طرف مڑتے ہوئے کہا ''ہم ساری دنیا کے

بچوں کے دکھ دور نہیں کر سکتے، ہم اس ملک کے سارے محروم بچوں کو کپڑے، جوتے اور کھلونے نہیں دے سکتے، ہم اس شہر کے سارے غریب بچوں کی خواہشیں بھی پوری نہیں کر سکتے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہم اپنی استطاعت کے مطابق چند بچوں کو چند لمحوں کے لیے بھی خوش نہیں کر سکتے؟'' بیوی نے ٹشو سے آنکھیں صاف کیں اور سسکتے ہوئے لہجے میں پوچھا ''کیا مطلب؟'' میں نے کہا ''ہم ہفتے میں ایک بار ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہیں، اگر نہ کھائیں تو کیا مر جائیں گے، ہم ہر مہینے بچوں کے لیے کپڑے خریدتے ہیں، اگر نہیں خریدیں گے تو کیا بچے ننگے رہیں گے؟ ہر تین ماہ بعد نئے جوتے لیتے ہیں اگر نہیں لیں گے تو کیا ننگے پاؤں پھریں گے؟ مہمانوں کے لیے پانچ پانچ ڈشیں تیار کرتے ہیں، اگر ایک آدھ کم ہو جائے تو کیا مہمان بھوکے رہیں گے؟ ہر چھٹی پر ''آؤٹنگ'' کے لیے جاتے ہیں اگر ایک اتوار نہیں جائیں گے تو کیا زندگی ختم ہو جائے گی؟ دو ماہ بعد لاہور کا چکر لگاتے ہیں اگر دو کی بجائے چار ماہ بعد چلے جائیں گے تو کیا حج کا ثواب مارا جائے گا اور روزانہ آئس کریم کھاتے ہیں اگر ایک دن چھوڑ کر کھا لیا کریں گے تو کیا قیامت آ جائے گی؟'' میری آواز میں خلاف معمول حرارت تھی، بیوی نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور سر نفی میں ہلا دیا۔

''ہم ہر ماہ یہ پیسے بچا کر چند بچوں، ہاں چار پانچ ایسے بچوں کو جوتے خرید کر نہیں دے سکتے، انہیں کپڑے، کھلونے، غبارے لے کر نہیں دے سکتے، ان کی فیسیں ادا نہیں کر سکتے؟'' میں خاموش ہوا تو میری بیوی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

ہم نے کل سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم ہر ماہ اپنی تنخواہ سے ایسے ہی بچوں کے لیے ایک ہزار روپے کے جوتے خریدیں گے، (خواہ جتنے بھی آئیں) انہیں گاڑی میں رکھیں گے اور شہر سے ایسے تین چار بچوں کا انتخاب کر کے یہ جوتے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں پہنائیں گے، یہ سلسلہ یہیں نہیں رکے گا جوں جوں ہماری آمدنی میں اضافہ ہوتا جائے گا ہمارے اس ''این جی او'' کا سائز بھی بڑھتا جائے گا، یہاں تک کہ آئندہ برسوں میں (انشاءاللہ) ہم اس کا دائرہ کار کپڑوں، کھلونوں اور کتابوں تک بڑھا لیں گے۔

یہ سچ ہے کل شب جب ہم میاں بیوی اس فنڈ کی ''تشکیل'' پر غور کر رہے تھے تو ایسی بیسیوں چیزیں ہمارے سامنے آئیں جنہیں ہم ترک کر دیں تو ہمارا ''لائف سٹائل'' متاثر نہیں ہوگا۔

جب رات کھڑکیوں سے اندر آ گئی اور میں بتیاں جلانے کے لیے اٹھا تو میں نے سوچا اگر اس ملک کے میرے جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ اپنے اپنے گھر میں ایسے بچوں کے لیے ایک ایک ہزار روپے ماہانہ کا ''این جی او'' بنا لیں تو کیا پھر بھی ہمیں سڑکوں پر ننگے پاؤں چلتے بچے نظر آئیں؟ جواب آیا نہیں!

محترم قارئین! دس ہزار میل لمبی مسافت کا آغاز چھ انچ کے پاؤں سے ہوتا ہے، آیئے آپ اور میں اس مسافت کا آغاز کر دیں کہ سفر کٹ ہی جائے گا، منزل کبھی نہ کبھی آ ہی جائے گی۔

......۞......

ماچس کی تیلی

اس بار عید پر لالہ موسیٰ جانا ہوا تو ایک بزرگ ملاقات کے لیے تشریف لائے، عمر یہی کوئی پچاس پچپن برس ہوگی، چہرے پر سفید داڑھی اور بات چیت میں ایک خاص نفاست تھی، گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا وہ چھ جوان بیٹیوں کے باپ ہیں، تنگی رزق کا شکار ہیں، کبھی فوج میں جونیئر آفیسر تھے کسی غلط فہمی کی بنا پر وہاں سے فارغ کر دیے گئے، سینئر آفیسر نے ان کی فائل میں بعض ایسے ریمارکس لکھ دیے جن کے باعث ان کے بقایا جات اور پنشن رک گئی اور اب وہ کئی برسوں سے اپنے حق کے لیے اس دروازے سے اس دروازے اور اس دفتر سے اس دفتر مارے مارے پھر رہے ہیں، میں نے انہیں مقدور بھر مدد کی یقین دہائی کرائی لیکن انہیں یقین نہ آیا لہٰذا انہوں نے میرے ساتھ ایک عجیب حرکت کی، وہ میرے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولے "جاوید صاحب میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں اگر آئندہ دو ماہ تک مجھے میرا حق نہ ملا تو میں اپنی چھ بچیوں سمیت خود سوزی کر لوں گا۔" ان کے یہ الفاظ میری سماعت پر کتنے گراں گزرے آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے، میں نے انہیں تو تسلی دے کر جیسے تیسے رخصت کر دیا لیکن خود اندر بیٹھ کر دیر تک وہ وجوہات تلاش کرتا رہا جن کے باعث ہم میں سے ہر شخص عام معمولی سی رکاوٹ اور چھوٹی سے تکلیف پر "چن زیب" کی طرح سوچنے لگتا ہے، اپنے دماغ کو گولی سے اڑانے، تیل چھڑک کر خود کو آگ لگانے، پٹڑی پر لیٹنے اور زہر پی لینے کے منصوبے بنانے لگتا ہے، میں دیر تک سوچتا رہا، آخر ہمارے خون سے وہ جذبے نکل کر کہاں چلے گئے جو انسان کو زندہ رکھتے ہیں جو تکلیفیں برداشت کرنے، دکھ سہنے اور آزمائش پر پورا اترنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

میں نے بہت پہلے طالب علمی کے دور میں روسی مصنف دوستوفسکی کا عظیم شہکار "ایڈیٹ" پڑھا تھا، جب میں گیارہ بارہ سو صفحات کا یہ ضخیم ناول پڑھ چکا تو میں نے اسے دوبارہ پڑھا اور پھر تیسری بار پڑھا اور اس کے بعد اسے اتنی بار پڑھا کہ یہ عمل آج تک جاری ہے، دوستوفسکی اور اس کا "ایڈیٹ" دونوں ایک طویل کتاب کے مستحق ہیں کبھی موقع ملا تو اس پر بھی کچھ نہ کچھ لکھوں گا بہرحال یہاں مختصراً اس ناول کے ایک چھوٹے سے کردار کا ذکر کرتا چلوں، اس کا نام "اپولیت" تھا اپولیت ٹی بی کا مریض تھا، اسے ڈاکٹر چند روز کا مہمان قرار دے دیتے ہیں، وہ بیماری سے اس قدر لاغر ہو چکا ہے کہ اپنی چارپائی پر ڈھیر ہو کر موت کا انتظار کرتا اس کا

مشغلہ بن جاتا ہے، جب وہ اس انتظار سے تھک جاتا تو اپنی کھڑکی کے سامنے کھڑی اونچی عمارت پر پڑنے والے سایوں سے وقت کا تعین کرتا رہتا، یہ ایپولیت مرنے سے پہلے ناول کے ہیرو پرنس میکشن کے نام ساٹھ ستر صفحات کا ایک خط لکھتا ہے، آپ یقین فرمائیں، ایپولیت اپنے اس خط میں زندگی کا جتنا شاندار تجزیہ کرتا ہے اتنا عظیم Analysis میں نے آج تک کہیں نہیں پڑھا، اس خط کی چند ایک لائنیں تو اتنی امید افزا ہیں کہ انہیں اگر صحرا میں پھینک دیا جائے تو وہاں بھی سبزہ اگ آئے، ایپولیت کہتا ہے ''دوستو! آپ کے پاس زندگی نام کا ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی مدد سے آپ اپنی ساری محرومیوں، ساری کمیوں کو کامیابیوں میں بدل سکتے ہیں، غریب ہیں تو امیر بن سکتے ہیں، جاہل ہیں تو عالم ہو سکتے ہیں، کمزور ہیں تو پہلوان بن سکتے ہیں، بدصورت ہیں تو خوبصورت ہو سکتے ہیں، لیکن میں وہ بدنصیب ہوں جو خواہش کے باوجود اپنی محرومیوں کو فتح اور اپنی ناکامیوں کو کامیابیوں میں نہیں بدل سکتا کیونکہ میرے پاس زندگی ہی نہیں۔''

اگر اپنے حواس میں رہ کر دیکھا جائے اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے پوچھا جائے کہ جب اللہ نے ایک شخص کو زندگی سے نواز رکھا ہے، اسے صحت دے رکھی ہے، اس کے پھیپھڑے پورا سانس لیتے ہیں، اس کی رگوں کا خون پورا سفر طے کرتا ہے، اس کے ہاتھوں میں طاقت اور اس کے بدن میں چستی ہے لیکن اس کے باوجود وہ شکوؤں سے بھرا ہے، کیوں؟ وہ اپنی محرومی، اپنی ناکامی اور اپنی کمی کا حوصلے، تدبیر اور محنت سے مقابلہ کرنے کی بجائے جل مرنے، پھندا تنگ لگا دینے اور زہر پی لینے کے منصوبے کیوں بناتا ہے۔ تو ہمارے حواس ہمارا باطن کیا جواب دے گا؟ میرا خیال ہے میرے یہ بزرگ اور ان جیسے دوسرے ہزاروں لاکھوں ''چین زیب'' اگر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے صرف ایک لمحے کے لیے اپنے اردگرد آباد ان لوگوں پر ایک نظر ڈال لیں جو چند برس پہلے تک کچھ نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنی کوششوں سے دنوں میں اپنے حالات کو پگھلا کر ایسے سانچے میں ڈھال لیا کہ اب ان کا شمار کروڑ پتیوں میں ہوتا ہے، لوگ ان کے لیے جھک کر دروازہ کھولتے ہیں، ان کے احترام میں کھڑے رہتے ہیں تو شاید وہ واپس زندگی کی طرف لوٹ جائیں، میری اپنی زندگی میں ایسے درجنوں لوگ ہیں، جنہوں نے سفر کا آغاز ریڑھی، خوانچے، تھڑے یا پھیری سے کیا لیکن چند ہی برسوں میں وہ کئی کئی پلازوں، فیکٹریوں اور ملوں کے مالک بن گئے، ذرا سوچئے یہ لوگ اگر برے وقتوں میں مایوس ہو جاتے تو ان کا مستقبل کیا ہوتا، تیل کی دو بوتلیں، ماچس کی ایک تیلی، ہسپتال کا ایک کمرہ، کچھ چیخیں اور ہمدردی کے چند بول لیکن انہوں نے ماچس کی تیلی کی بجائے اس راستے کا انتخاب کیا جس میں زندگی تھی، جو اصل اور سیدھا راستہ تھا۔

اگر ہم زندہ ہیں تو یہ ہمارے لیے خدا کی طرف سے ایک کھلا اور واضح پیغام ہے کہ ہم زندگی کے ہل سے اس کیاری میں اپنی پسند کے پھول اگانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں بس اس کے لیے ذرا سی مشقت درکار ہے، پوچھنے والے نے پوچھا ''اللہ کے نزدیک کتنے گناہ ناقابل معافی ہیں۔'' بتانے والے نے بتایا ''دو''

پوچھنے والے نے پوچھا ''یا رسول اللہ ﷺ کون کون سے؟'' حبیب خدا ﷺ نے فرمایا ''کسی دوسرے کو خدا کی ذات میں شریک کرنا اور نا امید ہونا۔''

میرا ذاتی خیال ہے اگر دل میں زندہ رہنے کی امید قائم ہو تو سمندر میں تیرتے تنکے بھی جہاز کا کام دیتے ہیں لیکن دل اگر مایوس ہونے کا فیصلہ کر چکا ہو تو پھر ان تنکوں کو ماچس کی تیلی بنتے دیر نہیں لگتی اور اگر انسان ایک بار ماچس کی تیلیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہو تو پھر ٹائی ٹینک جیسے انسان بھی ساحل سے سینکڑوں میل دور خشکی پر ڈوب جاتے ہیں۔

محبت اور آزادی

آخر میں شاہ جی بولے:

''یہ جنوری کی ایک یخ رات تھی کائنات کی ہر چیز منجمد ہو چکی تھی، کلفٹن کی سرد لہریں، سمندر کی نمکین ہوا، عروس البلاد کی مدھم روشنیاں، سب کہرے کی چادر اوڑھے اونگھ رہی تھیں، اس ساعت لحاف کی سردی میں میرے میجر نے مجھے حکم دیا کیپٹن ضمیر...............''

''ایک منٹ، ایک منٹ شاہ جی۔'' اقبال نے اپنی روایتی بے چینی سے شاہ جی کو ٹوک دیا۔ ہم نے اسے گھور کر دیکھا، وہ کھسیانا سا ہو کر بولا ''بھئی ایک سوال ہے بعد میں بھول جاؤں گا۔''

''پوچھو، پوچھو، میرے بچے پوچھو'' شاہ جی نے پچکار کر کہا۔''شاہ جی یہ کس سن کی بات ہے؟'' اقبال نے سوال داغ کر ہم سب کو فاتحانہ نظروں سے دیکھا: ''میرے بچے یہ ۴۷ء کی جنوری کی بات ہے پاکستان بننے سے پہلے کی سردیاں، ہماری یونٹ تازہ تازہ کراچی آئی تھی، اس وقت کراچی اتنا بڑا شہر نہیں تھا چند سڑکیں......'' شاہ جی اصل واقعہ بھول کر کراچی کے جغرافیے پر الجھ گئے لیکن اس سے قبل کہ بات ہاتھ سے نکل جاتی، خان صاحب نے ان کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرا کر کہا ''شاہ جی، شاہ جی، پھر میجر نے آپ کو کیا حکم دیا؟'' شاہ جی چونک کر رکے، خان صاحب کو گھور کر دیکھا، پھر ذرا اونچی آواز میں بولے ''کون میجر؟'' خان صاحب گڑ بڑا گئے، میں نے فوراً شاہ جی کو یاد دلایا ''آپ جنوری کی یخ رات کا قصہ سنا رہے تھے۔'' شاہ جی نے اپنے پوپلے منہ پر ہاتھ رکھا اور کھی کھی کر کے ہنستے چلے گئے، ہم سر جھکا کر بیٹھ گئے، وہ رکے، ہمیں عینک کے دبیز شیشوں سے جھانک کر دیکھا اور بولے: ''لو، بکو میں کہاں کی بات کہاں لے گیا، بڑھاپا ہے نا بھائیو! معاف کرنا، ہاں تو میں کہہ رہا تھا، میجر نے مجھے حکم دیا، کیپٹن ضمیر تم ابھی جاؤ اور میجر جنرل چنجر کو یہ چٹھی دے آؤ، ان دنوں پاکستان اور بھارت کی فوج برٹش آرمی کہلاتی تھی اور اس کے بڑے افسر انگریز ہوتے تھے۔ بہر حال تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟'' شاہ جی نے رک کر ہماری طرف دیکھا، ہم نے فوراً گردن ہلا کر تائید کر دی ''ہوں'' انہوں نے اطمینان سے ہنکارہ بھرا ''لو بھئی میں اس کڑاکے دار سردی میں جیپ پر نکل کھڑا ہوا، جنرل چنجر کا گھر بہت دور تھا مجھے پورے ۴۵ منٹ ڈرائیو کرنا پڑی، بہر حال قصہ مختصر، میں آخر کار ٹھٹھرتا ہوا جنرل کے گھر پہنچ

گیا، وہاں ہو کا عالم تھا، سٹریٹ لائٹس کا رواج تھا نہیں، سردی اس قدر تھی کہ دربان کا امکان بھی مفقود تھا، بس وہاں میں تھا اور جنرل کا ریچھ جتنا اونچا کتا، جو سامنے کھڑا مجھے گھور رہا تھا، میں جونہی پاؤں نیچے رکھتا وہ "بھوں" کر کے مجھے پاؤں واپس اٹھا لینے پر مجبور کر دیتا، تم لوگ بور تو نہیں ہو رہے۔" شاہ جی نے ایک بار پھر رک کر پوچھا:

"نہیں، نہیں، ہرگز نہیں۔" ہم یک آواز بولے "چلو پھر ٹھیک ہے۔" شاہ جی نے اطمینان سے گردن ہلائی "بہر حال بھائیو میں نے کتے کو بھگانے کے سو جتن کئے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، ہوتا بھی کیوں آخر انگریز جرنیل کا کتا تھا، میں نے زچ ہو کر ہارن بجانا شروع کر دیا، یہ نسخہ کارآمد ثابت ہوا، صاحب کے سرونٹ کوارٹر سے ان کا دیسی بٹلر دھوتی سنبھالتا ہوا نکلا اور "ٹامی، ٹامی" پکارتا ہوا باہر آ گیا، میں نے اسے چٹھی دکھا کر جنرل سے ملنے کی درخواست کی، اس نے میرے کندھے کے پھول دیکھے، ایک ادھورا سا سلیوٹ کیا اور "ٹامی" کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا، میں جیپ سے اترا اور لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کرتا ہوا رہائشی ایریے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔" شاہ جی ایک لمحے کے لیے پھر رکے ہمیں دیکھا اور استفہامیہ انداز میں بولے: "تمہیں پتا ہے میں اس سردی میں وہاں کتنی دیر کھڑا رہا؟" ہم نے فوراً گردن نفی میں ہلا دی "ہوں" شاہ جی نے ہنکارہ بھرا "پورے ۳۵ منٹ جنٹلمین، تھرٹی فائیو منٹس، اس ہڈیوں میں سرایت کر جانے والی سردی میں کھڑا رہا، میں کیپٹن ضمیر، اس دوران گورا جنرل باہر آنے کی تیاری کرتا رہا، اس نے جرابیں پہنیں، زیر جامہ پہنا، کپڑے پہنے، گرم کوٹ چڑھایا، گردن کے گرد مفلر لپیٹا اور پھر ذرا سا دروازہ کھول کر پوچھا: "وٹ از دی میٹر کیپٹن" میں نے ایڑھیاں بجا کر کہا "ہیر از اے لیٹر فار یو سر" گورے جنرل نے بغیر کچھ کہے ایک ہاتھ باہر نکالا، میں نے جھک کر لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے خط اچک کر دروازہ بند کیا اور میں لکڑی کے بند کواڑوں کو سلیوٹ کر کے واپس آ گیا۔" شاہ جی خاموش ہو گئے، ہم سب ٹھوڑیاں ہتھیلیوں پر جما کر بیٹھے رہے، وہ چند لمحوں تک ہمیں گھورتے رہے، پھر زچ ہو کر بولے: "تمہیں پتا ہے اس جرنیل نے مجھے اندر آنے کی آفر کیوں نہیں کی، کیوں اس ہڈیوں میں اترنے والی سردی میں چائے کے ایک کپ تک کی پیشکش نہیں کی؟" ہم نے فوراً گردن ہلا دی، شاہ جی نے ایک لمبا اور ٹھنڈا سا سانس لیا "ہاں تم اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔" وہ رک کر بولے: "اس لیے میرے بچو کہ میں غلام تھا اور غلاموں کو گھروں میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جاتی، چائے، کافی سرو نہیں کی جاتی، ان کے لیے بیٹھکیں نہیں کھولی جاتیں۔" شاہ جی نے گہرے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔

"پر شاہ جی......" میں نے گلوگیر لہجے میں ان کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی، انہیں کرنٹ سا لگا اور وہ پوری آنکھیں کھول کر بولے: "نہیں ابھی یہ کہانی ادھوری ہے، اس کا آخری حصہ تو ابھی سنانا باقی ہے۔" انہوں نے سر جھٹک کر دکھ بھگانے کی کوشش کی، جب ناکام رہے تو اسی زہریلے لہجے میں بولے: "اس جنوری میں جب میں امریکہ سے لوٹا تو ایئر پورٹ پر مجھے میرے بریگیڈیئر بیٹے نے ریسیو کیا، میں اس کے ساتھ سرکاری

جیپ میں بیٹھ گیا، ہم نے باتیں شروع کر دیں، جیپ چلتی رہی، چلتی رہی، جب رکی تو میں حیران ہو گیا کیونکہ میں جنرل مینجر کے اسی گھر کے سامنے کھڑا تھا، جہاں میں ۵۱ برس پہلے سخت سردی میں ٹھٹھرتا رہا تھا، سامنے میری بہو، میرے پوتے پوتیاں کھڑے تھے، ہاں میرے بچو تم یقین کرو میں نے اپنے بچوں کے ساتھ برآمدے میں پاؤں رکھے، وہاں سے دروازہ عبور کیا، اندر صحن میں آیا، ایک ایک کمرہ پھر کر دیکھا، پورے اعتماد کے ساتھ ہر چیز چھو کر دیکھی، لیکن مجھے کہیں خوف، مرعوبیت اور کمتری کا احساس نہیں ہوا، میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو نہیں ہوئیں، میری کنپٹیوں میں آگ نہیں لگی، میرے ہاتھوں میں پسینہ نہیں آیا، میری گردن نہیں جھکی، میری پلکیں نہیں کانپیں۔'' شاہ جی رکے، ہمیں دیکھا اور پھر ہنس کر بولے: ''میرے بچو! ایسا کیوں ہوا، صرف اس لیے کہ اب میں برٹش آرمی کا ایک غلام کیپٹن نہیں تھا، پاک آرمی کے ایک بریگیڈیئر کا باپ تھا اور ہاں تم لوگ پوچھ رہے تھے اس آزادی نے ہمیں کیا دیا؟ تو میرے بچو! اس آزادی نے ہمیں آقاؤں کے برآمدوں پر چڑھنے کا حوصلہ دیا۔'' شاہ جی پھر رکے، چند لمحوں تک کچھ سوچا اور پھر نسبتاً اونچی آواز میں بولے: ''پر یار تم لوگوں کا بھی کوئی قصور نہیں، یہ آزادی کم بخت ہوتی ایسی ہے، جتنی بھی ہو کم لگتی ہے، جو محبت اور جو آزادی انسان کو قناعت سکھا دے، اسے محدود رہنے، صابر رہنے پر مجبور کر دے، وہ محبت ہی کب ہوتی ہے، وہ آزادی ہی کب ہوتی ہے۔ یارو! تم لوگ جو آزادی پر شاکی ہو، یہی تو اس کے آزاد ہونے کی نشانی ہے، کبھی غلاموں نے بھی کہا ہے: ''اس آزادی نے ہمیں کیا دیا؟''

(نوٹ: اس کالم کے شاہ جی معروف شاعر اور ادیب سید ضمیر جعفری مرحوم ہیں، خان صاحب خوشنود علی خان اور اقبال بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر اقتصادیات اقبال لطیف ہیں۔)

ہیلپ می گاڈ

وہ چھاتی کے کینسر میں مبتلا تھی اور ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔

سسٹر صبح راؤنڈ سے ذرا پہلے آ کر پردہ کھینچتی تو نرم، سنہری اور ممتا کے گرم احساس جیسی دھوپ اس کے پپوٹوں پر دستک دیتی، پلکیں لرزتیں اور نیلے بلور دیدوں کی حیرت کمرے میں بکھر جاتی۔ ''یہ آنکھیں کتنی خوبصورت تھیں۔'' وہ سوچتی: ''نیلی، چمکدار، عمیق'' سینے کا درد انگڑائی لیتا اور وہ ایک اذیت ناک ''اف'' کے ساتھ آنکھیں بند کر لیتی، جس کے ساتھ ہی سارا منظر اندھا ہو جاتا، لیکن نہیں، کچھ منظر تو اس کے اندر بھی تھے، ایسے منظر جو صرف آنکھیں بند ہونے کے بعد ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان میں پال تھا، جوزف پال، اس کا فرسٹ بوائے فرینڈ۔ وہ ہمیشہ اس کے کان پر جھک کر کہتا ''کیتھی، تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں، نیلی چمکدار اور گہری۔'' پال کے مضبوط بازوؤں پر ناخن گاڑ کر وہ چلاتی ''بکواس'' اور پال قہقہہ لگاتا۔ اس کی تکونی ٹھوڑی چٹکی میں دباتا اور کہتا: ''کیتھی، ڈارلنگ، یہ آنکھیں نہیں ہیں، دودھ کے سمندر میں نیلی جھاگ کے جزیرے ہیں۔''

انہی منظروں میں ایک منظر سینٹ لوئیس کے پھولوں کا ہے، ہوا جن سے گزرتے ہوئے سرسراتی تھی اور جب یہ ہوا اس کی کھڑکی پر دستک دیتی تو کمرے میں خوشبو ڈیرے ڈال دیتی۔ اس کا فلیٹ بھی خوشبو کے رخ پر تھا۔ اِدھر سے آئے یا اُدھر سے، ہوا خوشبو کی خیرات دیے بغیر جا نہیں سکتی۔ ایک اور منظر بھی تھا، سینٹ لوئیس کے ڈسکو...... کتنے لوگ تھے جو چند لمحوں کے رقص کے لیے ساری شام اس کا انتظار کرتے۔ ان میں جیفری بھی تھا، جو کہتا تھا: ''کیتھی، جب تک تم گلاس میں انگلی نہ ڈبو دو، وائن پانی لگتی ہے۔''

اور ان منظروں میں،...... وہ رکتی، ایک طویل اور اذیت ناک سانس کھینچتی اور سینے پر کراس بنا کر سوچتی، نہیں کینسر کی ایک ایسی مریضہ کو، جو چند دنوں کی مہمان ہو، یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔ ''ہیلپ می گاڈ'' وہ سسکاری بھرتی اور ذہن کے پردے پر ایک باریک سا نقطہ ابھرتا، وہ اسے دیکھتی، غور سے دیکھتی تو نقطہ پھیلنے لگتا۔ گیند بن جاتا، پھر اس گیند پر آنکھیں بنتیں، آنکھوں کے گرد جلد کے بھنور اگتے، پھر ایک لٹکتی ہوئی ناک ظاہر ہوتی، ناک کے نیچے منہ کا چھوٹا سا دہانہ ابھرتا تو وہ چلاتی ''گرینڈ ما آپ'' اور یہ بوڑھی نانی کے خیال کی

حکمرانی ہوتی۔ وہ نانی سے اکثر پوچھتی تھی "مام آپ چپکے چپکے کیا پڑھتی رہتی ہیں؟" نانی کی آنکھوں کے بھنور گہرے ہو جاتے، ہونٹ لٹک جاتے اور موم کی ناک لرزنے لگتی۔ وہ مسکراتی اور کہتی: "میرے بچے خدا کو جب بھی یاد کرو، چپکے چپکے یاد کرو، اپنے اندر جذب کرتے رہو۔"

وہ حیرت سے پوچھتی: "پر کیوں مام؟" بوڑھی نانی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی کہتی "کیونکہ بچے خدا کی یاد بھی خوراک ہوتی ہے، روح کی خوراک، یہ نہ ملے تو روح بیمار ہو جاتی ہے اور بیمار روحوں والے جسم زیادہ دن صحت مند نہیں رہتے، تم بھی چپکے چپکے خدا کو یاد کیا کرو، ورنہ کروڑوں لوگوں کی طرح اندر سے گل جاؤ گی۔" پھر وہ سوچتی: "خدا کو کیسے یاد کیا جاتا ہے؟" اس کا ذہن جواب دے جاتا۔ سارے منظر دم توڑ جاتے۔

یہ روز کا معمول تھا۔ ہر آنے والے روز کا معمول، جو اسے موت کے قریب تر لے جا رہا تھا۔

دسمبر کی ایک سرد صبح، اس نے اپنے آپ سے سوال کیا: "خدا کو کیسے یاد کیا جاتا ہے؟" تو منظر تحلیل نہ ہوا، ذہن لاجواب نہ ہوا، اس نے سوچا "خدا سے مدد مانگنا ہی اسے یاد کرنا ہے۔" "ہیلپ می گاڈ" اور پھر "گاڈ" اس کے ذہن سے ہی چپک گیا، حتیٰ کہ وہ ہر سانس کے ساتھ آسمان سے سفید دودھیا روشنی کی ایک لکیر اترتے دیکھتی اور بے اختیار دہراتی "ہیلپ می گاڈ"

یہ تین لفظ اس نے کتنی بار دہرائے، اسے نہیں یاد۔ بس یاد ہے تو اتنا کہ جب تک جاگتی "ہیلپ می گاڈ" کے الفاظ دہراتی چلی جاتی۔ جب سو جاتی تو اس کا دل دہراتا رہتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کی نیلی، چمکدار اور عمیق آنکھیں چہرے کا حصہ تھیں، جس طرح تیز دھار ہونٹ اس کے وجود میں شامل تھے، جس طرح وہ اپنے سنہری بالوں کے بغیر ادھوری تھی اور جس طرح وہ اپنی نرم آواز کے بغیر نامکمل تھی۔

مارچ کی اس صبح میڈیکل سائنس کی دنیا دھماکے سے لرز اٹھی۔ سینٹ لوئیس کے اس ہسپتال نے کیتھرائن کو مکمل طور پر صحت یاب قرار دے دیا۔ کینسر کی ایک ایسی مریضہ جو تین ماہ سے موت کی طرف بھاگ رہی تھی اور جو امید کھو چکی تھی، الوداع کہنے سے پہلے کیتھی نے امریکی ڈاکٹروں کو صحت کا نسخہ بتا دیا "ہیلپ می گاڈ۔" ڈاکٹروں نے حیرت سے پوچھا: "وٹ ڈو یو مین" کیتھی نے بتایا: "جب اس نے تین لفظوں کا ورد شروع کیا تو سب سے پہلے اس کا درد ختم ہوا، پھر زخم پر کھرنڈ بنے، پھر کھرنڈ اترے اور آخر میں ایک نئی اور صحت مند جلد نے زخم کے نشان تک مٹا دیئے۔ اب میں سیدھی پال کے پاس جاؤں گی۔" اس نے کہا اور پوچھوں گی: "کیا اب بھی میرے چہرے پر نیلی جھاگ کے جزیرے ہیں؟"

کیتھی کے کیس نے میڈیکل سائنس کو نئی "ڈائی مینشن" دے دی، پورے امریکہ میں سروے کیا گیا، پتا چلا، خدا پر مضبوط یقین رکھنے والے مریض "نان بلیورز" کے مقابلے میں جلد صحت یاب ہو جاتے ہیں، فیصلہ ہوا طبی ماہرین بلیورز اور نان بلیورز کی نگرانی کریں۔ تین مہینے بعد امریکہ کے تمام ماڈل ہسپتالوں سے موصول ہونے والے نتائج نے کیتھی کی تصدیق کر دی جس کے بعد "پازیٹو تھنکنگ" کی تھیوری آئی اور دنیا بھر

کے مریضوں کو شفایابی کی خوشخبری سنا دی گئی۔

وہ جو اس ملک کے مستقبل سے مایوس ہیں، ان سب کی ایک ہی رٹ ہے، یہ ملک نہیں چل سکتا، یہ ٹوٹ جائے گا، دیوالیہ ہو جائے گا، یہاں خانہ جنگی ہوگی، خون کی ندیاں بہیں گی، بارود کی بارش ہوگی، سروں کی فصل کٹے گی، لوگ دانے دانے کو ترسیں گے، ملک بک جائے گا، بھارت قبضہ کر لے گا تو مجھے کیتھی کی کہانی یاد آ جاتی ہے اور میں خود سے سوال کرتا ہوں جب تین سادہ سے لفظ ایک سیکولر سوسائٹی کی سٹریٹ گرل کو موت سے نجات دلا سکتے ہیں تو کیا ۱۴ کروڑ لوگوں کی دعائیں اس ملک کو نہیں بچا سکتیں؟

کیا خدا بے خبر ہے؟

نعوذ باللہ۔ کیا وہ سو رہا ہے؟ کیا اب وہ دعائیں نہیں سنتا؟

مجھے بچائیں

ہاں میں نے ایک گہری اور طویل نیند کے ذریعے یہ تکلیف بھلانے کی کوشش کی، کتابوں کے مورچے میں سر چھپا کر اس خوف سے بچنے کی سعی کی، اپنے آپ سے فرار ہونے کے لیے پشاور کا چکر لگایا، ان تمام دوستوں سے گپ شپ کے لیے گیا جنہیں میں عرصے سے بھول چکا تھا، صبح شام جوگنگ کی لیکن احساسات کی یہ آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ بے چینی، بے کلی اور اضطراب کا گراف نیچے نہیں آیا، اندیشوں کے زہریلے ڈنک کند نہیں ہوئے، آنکھوں کی سیم خشک نہیں ہوئی۔

کاش بہاولنگر کا درمیانی عمر کا یہ شخص فقط ایک کہانی ہوتا، اس کی کہر سے ماری سرسوں جیسی بیوی ایک کردار ہوتی، اس کے چھ سات بچے خیالی دنیا کے باسی ہوتے، کاش اس کے بیمار والدین اور نادار بہن بھائی کسی افسانوی افق کے ٹمٹماتے ستارے ہوتے تو میں، ہاں تو میں یہ داستان کہنے کے بعد خود کو کتنا ہلکا پھلکا محسوس کرتا، یہ کہانی لکھتے ہوئے، یہ افسانہ ''ایجاد'' کرتے ہوئے خود کو کتنا معتبر سمجھتا، لیکن افسوس یہ شخص کہانی ہے اور نہ ہی اس کی بیوی ایک کردار، اس کے بچے خیالی ہیں اور نہ ہی اس کے والدین افسانوی، بھوک، ننگ، اور سفید پوشی کا بھرم ایک ڈرامہ ہے اور نہ ہی اس کے گلے میں دبی چیخیں کسی پلاٹ کا حصہ ہیں، یہ ایک ننگی کھردری اور نکیلی حقیقت ہے۔

میں نے ڈاکٹر اقبال سے پوچھا: ''ڈاکٹر صاحب آپ کی کمپنی کے کتنے برانچ آفس ہیں؟'' ڈاکٹر نے سینہ پھلا کر جواب دیا: ''پاکستان میں نو اور امریکہ میں تین۔'' میں نے پوچھا: ''اندازاً آپ کا ماہانہ بجٹ کیا ہوگا؟'' کاروباری احتیاط سے بولے: ''یہی کوئی تین چار کروڑ روپے۔'' میں نے پوچھا: ''آپ کی فرم کرتی کیا ہے؟'' مزید احتیاط سے بولے: ''موٹر وے جیسے منصوبوں کے ٹھیکے لیتی ہے۔'' میں نے پوچھا: ''پھر تو آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے۔'' خوش دلی سے بولے: ''ہاں ہاں بہت۔'' ''یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔'' میں نے انہیں ستائشی نظروں سے دیکھا، انہوں نے تفاخر سے گردن ہلائی۔ ''ڈاکٹر صاحب مجھے ایک لاکھ روپے چاہئیں۔'' میں مطلب پر آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا رنگ فق ہو گیا۔ چند لمحوں تک مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے، پھر چہرے پر مصنوعی سنجیدگی تان کر بولے: ''کیوں اچانک اتنی بڑی رقم کی کیا ضرورت پڑ گئی؟'' میں نے سائبیریا کی یخ ہوا

جیسے لہجے میں جواب دیا: ''تیرہ افراد کے ایک خاندان کو اجتماعی خودکشی سے بچانا ہے۔'' ڈاکٹر کی آنکھوں میں بجلی سی چمکی اور وہ آگے جھک کر بولا: ''ذرا تفصیل سے بتاؤ۔'' ''ہاں، کیوں نہیں۔'' میں نے اپنے کانپتے ہوئے جسم کو حوصلے کی زنجیروں سے باندھنے کی کوشش کی۔ ''بہاولنگر کا ایک سفید پوش معاشی بدحالی کا شکار ہے، آٹھ سال سے بیروزگار ہے، گھر کی ہر چیز بک چکی ہے۔ مگر خاندانی شرافت کسی شخص کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہیں دیتی، اب دو ہی راستے ہیں، کوئی صاحب ثروت خاموشی سے کاروبار کے لیے ایک لاکھ روپے قرض حسنہ دے دے یا یہ ۱۳ افراد زہر کھا کر زندگی کے زہریلے تالاب سے باہر آ جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کیا آپ ان لوگوں کی مدد کریں گے، اس رب، جس نے آپ کو آپ کی استطاعت سے بڑھ کر دیا، کے کرم سے لوگوں کو ان کا حصہ دیں گے؟'' ڈاکٹر چند لمحوں تک سر جھکا کر سوچتا رہا، پھر سیدھا ہوا، میری طرف دیکھا اور شرمندہ لہجے میں بولا: ''چوہدری صاحب مائنڈ نہ کیجیے گا، آج کل ہاتھ ذرا تنگ ہے۔''

میں نے میاں محمود سے پوچھا: ''آپ نے بینکوں سے کتنا لون لے رکھا ہے؟'' میاں صاحب گھبرا کر بولے: ''لیکن میں تو وقت پر قسطیں ادا کرتا ہوں۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ ''میں بری نیت سے نہیں پوچھ رہا۔'' میاں صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''یہی کوئی ستر اسی کروڑ روپے۔'' ''مجھے آپ سے کام ہے۔'' میں آگے جھکا، وہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ''آپ ان ستر اسی کروڑ میں سے کسی کو ایک لاکھ روپے قرض دے سکتے ہیں۔'' وہ فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ''چوہدری صاحب کیوں مذاق کرتے ہیں۔ یقین کریں میرا سارا پیسہ کاٹن میں پھنسا ہوا ہے، میں تو اپنے بچوں کی فیسیں تک نہیں دے سکتا۔ ایک لاکھ روپے کہاں سے لاؤں گا؟''

میں نے ایک وفاقی وزیر سے پوچھا: ''معاشی صورتحال کیا ہے؟'' قہقہہ لگا کر بولا: ''وزیراعظم سعودی عرب جا رہے ہیں، کچھ نہ کچھ لے کر ہی آئیں گے۔'' میں نے قہقہہ ختم ہوتے ہی کہا: ''کیا خزانے میں ایک لاکھ روپے بھی نہیں؟'' پھر قہقہہ لگا کر بولے: ''خیر ہماری حکومت اتنی بھی گئی گزری نہیں۔'' رکے، چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر سنجیدگی سے بولے: ''پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' میں نے فوراً مدعا بیان کر دیا۔ بولے: ''جاوید یقین کرو اگر تم کہو تو میں دو لاکھ کی منظوری دے دیتا ہوں، لیکن اس منظوری سے چیک بننے تک اتنے مراحل ہیں کہ شاید وہ خاندان پیسوں کی آس ہی میں گزر جائے۔'' میرا خون کھول اٹھا: ''پھر یہ لوگ کیا کریں؟'' وفاقی وزیر تھوڑے سے گھبرائے، چند لمحوں تک آگے پیچھے دیکھا پھر مدھم لہجے میں بولے: ''جاوید میں اپنے دوست احباب سے بات کرتا ہوں، انشاء اللہ چند روز میں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، تم فکر نہ کرو۔'' اور میں بے فکر ہو کر واپس آ گیا، لیکن اگلے روز وہ وفاقی وزیر غیر ملکی دورے پر روانہ ہو گئے۔

میں نے لاہور میں اپنے تاجر دوستوں سے رابطہ کیا، ادھر اسلام آباد میں بلیو ایریا کے سیٹھوں سے بات کی، بلوچستان کے چند سرداروں کو فون کیے، چوہدری شجاعت کے آفس پیغام چھوڑا، لیکن سب کے پیسے کاٹن میں پھنسے ہوتے ہیں، سب کے ہاتھ تنگ ہیں، سب اس نظام کے ''کل آئیے'' سے تنگ ہیں، سب اپنے

اپنے دوست احباب سے بات کر رہے ہیں اور میں ہاں، ادھر میں گہری اور طویل نیند کے ذریعے اپنی تکلیف بھلانے کی کوشش کر رہا ہوں، کتابوں کے مورچے میں سر دیئے لیٹا ہوں، شہر سے باہر بھاگ بھاگ کر جاتا ہوں، گپ شپ کے لیے دوستوں کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں، صبح وشام جوگنگ کرتا ہوں، لیکن آگ ہے کہ ٹھنڈی ہی نہیں ہوتی، بے چینی، بے کلی اور اضطراب پیچھا ہی نہیں چھوڑتا، اندیشوں کے زہریلے ڈنک بیٹھنے ہی نہیں دیتے اور آنکھوں کی سیم خشک ہی نہیں ہوتی۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، ان ۱۱۳ افراد کے کنبے سے پہلے میں مر جاؤں گا...... اگر اس معاشرے میں ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں تو خدا کے لیے مجھے بچائیں۔

تھینک یو ملک صاحب!

آج اتوار ہے اور میں اتوار کو عموماً کالم نہیں لکھتا، اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ ہے میرے بچے۔ ہم نے (میں نے اور میرے بچوں نے) آپس میں ایک "ایم او یو" کر رکھا ہے وہ مجھے ہفتے کے چھ دن ڈسٹرب نہیں کرتے۔ میرے کاغذ، میری کتابیں اور میری پنسلیں نہیں چھیڑتے، میرے ساتھ مارکیٹ جانے، کوئی چیز خریدنے اور کسی کے گھر جانے کی ضد نہیں کرتے۔ جس کے جواب میں میں اس "حسن سلوک" پر انہیں اتوار کا پورا دن دیتا ہوں۔ صبح اٹھ کر شیو نہیں کرتا، کالم نہیں لکھتا، اخباروں کو ہاتھ نہیں لگاتا، دفتر نہیں جاتا، کسی کو فون نہیں کرتا، کسی سے ملنے نہیں جاتا، بس ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتا ہوں، انہیں کہانیاں سناتا ہوں، ان کے ساتھ جوگنگ کرتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

میرے بچے بڑی حد تک اس سمجھوتے پر قائم ہیں البتہ مجھ سے کبھی کبھار وعدہ خلافی ہو جاتی ہے، تاہم وہ میری بھول چوک پر مجھے معاف کر دیتے ہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ میں اس سمجھوتے کے احترام میں اتوار کو کالم نہیں لکھتا۔

مگر آج ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے مجھے یہ توڑنے پر مجبور کر دیا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وعدہ خلافی پر میرے ضمیر پر کوئی بوجھ ہے اور نہ میرے بچے دل گرفتہ، بلکہ اگر دیکھا جائے تو یہ کالم تو مجھ سے لکھوایا ہی میرے بچوں نے ہے، کاغذ میری بیوی نے لا کر دیئے، پنسل میرا بڑا بیٹا لایا اور چائے کے کپ میرا چھوٹا بیٹا لاتا رہا، یوں ہم سب مل کر اس وعدہ خلافی میں شریک ہو گئے۔

یہ کالم "مجھے بچائیں" کا ردعمل ہے، میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جس شخص کو ڈاکٹر اقبال اور میاں محمود سمیت نصف درجن دوستوں سے سوائے مایوسی، دل گرفتگی اور توہین کے کچھ نہیں ملا، اسے یوں بیسیوں لوگ اتنی عزت اتنی توقیر بخشیں گے، جی ہاں اتوار کی صبح کالم شائع ہونے کے صرف ۲ گھنٹے کے اندر مجھے ۳۰ ٹیلی فون کالز موصول ہوئیں، ان میں چھوٹے بچے تھے، گھریلو خواتین تھیں، چھوٹے موٹے دکاندار اور سرکاری ملازمین تھے، چند سماجی تنظیموں کے کارندے اور ایک آدھ بیکار تھا۔

ان سب کا کہنا تھا، ہم بہاولنگر کے اس خاندان کی مدد کرنا چاہتے ہیں، کچھ نے زیورات کی پیشکش

کی، چند ایک نے موٹر سائیکل، ٹی وی اور فریج بیچنے کے عزم کا اظہار کیا، ایک صاحب نے چھ ماہ کی بچت جمع کرانے کی آفر کی لیکن میں نے ان تمام خواتین وحضرات کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر لی کیونکہ اس میں دو رکاوٹیں تھیں، اول ان لوگوں سے پیسے جمع کون کرے گا، دوم، اس ساری کارروائی میں وقت بہت برباد ہوگا جبکہ اس خاندان کو فوری ''ریلیف'' کی ضرورت ہے، لہٰذا میں ان باضمیر لوگوں کے فون نمبر لکھتے ہوئے سوچ رہا تھا، کیا اس ملک میں ایک بھی ایسا صاحب دل مالدار شخص نہیں بچا جو ۱۳ افراد کو موت کے منہ سے نکالنے کے لیے ایک لاکھ روپے ''ضائع'' کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو، یہ سوچ ہوک بن کر میرے جسم سے اُٹھ رہی تھی۔

صبح نو بجے خوشنود صاحب کا فون آیا، کہنے لگے مجھے ابھی ابھی ملک ریاض نے جگایا ہے، میں نے پوچھا: ''کون ملک ریاض؟'' خوشنود صاحب نے جمائی لی ''بحریہ ٹاؤن والے ملک ریاض۔'' ''اچھا!'' میں نے بات آگے بڑھائی، خوشنود صاحب نے اسی نیند سے بھرے لہجے میں کہا: ''ملک ریاض فون پر رو رہا تھا'' میں نے پوچھا: ''کیوں؟'' کہنے لگے: ''یہ تو میں تمہیں مل کر بتاؤں گا، بس تم بہاولنگر کے اس خاندان کو اطلاع کر دو پنڈی آ کر ملک ریاض سے ایک لاکھ روپے لے جائیں اگر وہ یہاں نہیں آ سکتے تو شام تک موبائل پر اسے اطلاع کر دو، وہ خود ان کے گھر جا کر رقم پہنچا آئے گا۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

آپ یقین فرمایئے میں کبھی ملک ریاض سے نہیں ملا، کبھی ملنے کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں، البتہ میں نے خوشنود صاحب سے اس کا ذکر بہت سنا، بالخصوص پاکستانی جیلوں میں بند بنگلہ دیشی قیدیوں کی وطن واپسی کے سلسلے میں تو خوشنود صاحب کی زبان ملک ریاض کے تذکرے سے تھکتی ہی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اس سے ملاقات کی خواہش پیدا نہ ہو سکی، لیکن آج میرا جی چاہ رہا ہے میں اس شخص سے ملوں، اس کے ہاتھ چوم کر اسے سیلوٹ کروں اور کہوں: ''خدا کی اس زمین پر صرف انہی لوگوں کو رہنے کا حق ہے، جو اس کی مخلوق پر زندگی کا سفر آسان کرتے ہیں۔ کاش ملک صاحب! آپ جیسے چند لوگ اور بھی ہوں۔''

ہاں، میرے بہاولنگر والے بھائی تم ایک بار پھر تکلیف کرو، یہاں آؤ، میرے پاس، اس نامراد شہر کے واحد بامراد شخص سے ملو اور نئے سرے سے زندگی کا سفر شروع کرو، اپنے بیوی بچوں کے لیے رزق جمع کرو، ان کی پرورش کرو، انہیں ملک ریاض بناؤ!

ہاں، میرے بہاولنگر والے بھائی، مجھے یقین ہے، یہ غیبی مدد تمہارے رزق کے دروازے پر پڑے قفل کے لیے چابی ثابت ہوگی۔ میرا رب تم پر کشادگی کے سارے دروازے کھول دے گا، ہاں مجھے یقین ہے یہ ایک لاکھ روپے تمہاری محنت، تمہاری ایمانداری سے ایک کروڑ بنتے دیر نہیں لگائیں گے، تمہارے پھٹے پرانے کپڑے، تمہیں ٹیکسٹائل مل کا مالک بنائیں گے، ہاں اگلے بیس برسوں میں تمہارا شمار بھی اس ملک کے متمول لوگوں میں ہوگا .... لیکن جب تم سرمائے کی معراج کو پہنچ جاؤ تو خدا کے لیے اپنے کروڑوں روپے کاش

میں پھنسا کر نہ بیٹھ جانا، ہاتھ تنگ ہونے کا شکوہ زبان پر نہ لانا ''اچھا کرتے ہیں۔'' کو اپنی پالیسی نہ بنانا۔ ہاں خدا کے لیے ملک ریاض بننا، ڈاکٹر اقبال اور میاں محمود نہ بننا۔

تھینک یو ملک صاحب! آپ نے مجھے بچا لیا، میری گردن پر آپ کا قرض ہے، آپ میرے محسن ہیں۔

روشنی ہی روشنی

ابھی انقلاب کی چنگاری کو شعلہ بننے میں کچھ وقت تھا۔

شاہ ایران کا ایک جرنیل درویش صفت خمینی کے پاس آیا، تعظیم کی اور دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ درویش نے پوچھا: ''کیسے آنا ہوا؟'' جرنیل بولا: ''حضور ایلچی بن کر آیا ہوں۔'' درویش نے کہا: ''جی فرمایئے میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' جرنیل نے سر جھکا کر کہا ''حضور شاہ ایران نے پیشکش کی ہے اگر آپ ہجرت کر جائیں تو آپ کے نان نفقہ کے لیے ۲ ملین ڈالر پیش کیے جا سکتے ہیں۔'' درویش کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے چمکتی آنکھوں سے جرنیل کو دیکھا اور سرگوشی میں بولا: ''میری طرف سے شاہ کا شکریہ ادا کر دیجیے گا۔'' درویش ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر ذرا بلند آواز میں بولا: ''شاہ سے کہنا اگر وہ نقل مکانی کر جائیں تو انہیں میں بھی اتنی ہی رقم پیش کروں گا۔'' جرنیل جھکا، آداب کیا اور چلا گیا۔

دوسرے روز ابھی ظہر ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی کہ وہی جرنیل واپس آیا اور ہاتھ باندھ کر درویش کے سامنے کھڑا ہو گیا، درویش نے سر اٹھا کر دیکھا، کچھ دیر توقف کیا اور پھر پوچھا: ''شاہ نے آج آپ کو کیا حکم دے کر بھیجا ہے۔'' جرنیل نے کانپتے ہوئے لہجے میں عرض کیا: ''حضور شاہ ایران پوچھتے ہیں اگر ہم یہ پیشکش قبول کرلیں تو آپ ۲ ملین ڈالر کہاں سے لائیں گے؟'' درویش کا چہرہ غصے سے تمتما گیا، وہ کھڑا ہوا، شہادت کی انگلی سے جرنیل کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور کہا: ''جا کر شاہ سے کہہ دینا میں ایران کی کسی شاہراہ پر کھڑا ہو کر لوگوں کو آواز دوں گا، اے اہل ایران اگر تم شاہ سے نجات چاہتے ہو تو دو، دو تمن لے کر میرے پاس آجاؤ، میں تمہیں ہزاروں برس کی غلامی سے آزاد کرا دوں گا۔'' درویش رکا، ٹھوڑی کے نیچے سے انگلی کھینچی اور واپس مڑ کر بولا: ''ہاں کمانڈر مجھے یقین ہے شام تک ۲ ملین نہیں، ۴ ملین ڈالر جمع ہو جائیں گے۔''

مجھے اب تک بہادر لنگر کے فاقہ زدہ خاندان کے لیے ۴۲ ٹیلی فون کالز موصول ہو چکی ہیں، جن میں گیارہ حضرات نے ایک، ایک لاکھ روپے، نو اشخاص نے پچاس، پچاس ہزار اور باقی بائیس خواتین و حضرات نے پانچ سے تیس ہزار روپے کی پیشکش کی۔ یہ سب میرے اور آپ جیسے لوگ تھے، عام ملازمین، چھوٹے دکاندار، معمولی بزنس مین، ان میں نہیں تھا تو ۲۱۷ ارکان قومی اسمبلی میں سے کوئی نہیں تھا، ۱۳ وفاقی و صوبائی

وزراء سے کوئی نہیں تھا، ۴۸۳ ارکان صوبائی اسمبلی سے کوئی نہیں تھا، ۸۷ سینیٹروں سے کوئی نہیں تھا، ۱۵ ہزار راشی بیوروکریٹس سے کوئی نہیں تھا، ملک کے ۸۰ فیصد وسائل پر قابض ۲۷ ہزار سرمایہ داروں سے کوئی نہیں تھا، ۴۰ ہزار چھوٹے بڑے سیاستدانوں سے کوئی نہیں تھا، ۲ ہزار جاگیرداروں سے کوئی نہیں تھا، بچ کاری کی دلالی سے ہاتھ منہ کالا کرنے والے ۱۱۹ ایجنٹوں سے کوئی نہیں تھا، فیصل آباد کے موٹے تاجروں اور ہال روڈ کے پھولی گردنوں والے بزنس مینوں سے کوئی نہیں تھا، ہاں ان ۴۲ لوگوں میں اشرافیہ، حکمران طبقے اور مالدار اسامیوں سے کوئی نہیں تھا، یہ سب میرے اور آپ جیسے لوگ تھے، عام ملازمین، چھوٹے دکاندار، معمولی بزنس مین۔

آپ نے نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیارؓ کی تقریر ضرور پڑھی ہوگی، جب حضرت جعفرؓ کی خطابت نے حبشیوں کے دل پگھلا دیئے تو نجاشی نے سوال کیا، معزز مہمان آپ کے نئے نبی ﷺ کو سب سے پہلے کن لوگوں نے قبول کیا، حضرت جعفر طیارؓ نے جواب دیا: ''اے بادشاہ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے والے عام لوگ ہیں، غلام ابن غلام ہیں'' نجاشی نے سنا تو بلا خوف تردد بولا: ''اے مہمان تمہارا نبی ﷺ سچا ہے۔''

میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تو طویل عرصے تک اس سوچ میں غلطاں رہا کہ آخر سچائی کا غلاموں کے قبول اسلام سے کیا تعلق ہے، مدت بعد پتا چلا، معاشروں کو تو عام شخص ہی زندہ رکھتا ہے۔ تبدیلیاں دو اطراف سے معاشروں پر اترتی ہیں۔ ایک اوپر سے دوسری نیچے سے، بالائی طبقے سے ہو کر نیچے آنے والی تبدیلی جھوٹی ہوتی ہے جبکہ نچلے طبقے سے اوپر اٹھنے والی تبدیلی سچی ہوتی ہے، انقلابی ہوتی ہے...... اور یہ بھی کہ جب تک عام شخص اچھائی اور برائی پر ردعمل ظاہر کرتا ہے، معاشرے کو موت نہیں آتی، قومیں مرتی نہیں۔

آپ نجاشی کے اس فلسفے کو ایک دوسرے زاویے سے بھی پرکھ سکتے ہیں، آپ پاکستان میں چھپنے والے انگریزی اخبارات اور جرائد اٹھا کر دیکھیں، ان میں اسلام، پاکستان، علمائے کرام اور قائداعظم اور علامہ اقبال جیسے اکابر کے خلاف کیا کچھ شائع نہیں ہوتا، لیکن اس پر کبھی کوئی ردعمل سامنے آیا؟ جبکہ اس کے مقابلے میں آپ اس قسم کا اعشاریہ ایک فیصد مواد اردو اخبار میں چھاپ کر دکھا دیں لوگ سڑکوں پر آ جائیں گے، ہر چیز تہس نہس کر دیں گے، کیوں؟ کیونکہ جتنا عام شخص اسلام، اس ملک اور اس کے اکابرین سے کمیٹڈ ہے، خاص شخص اس کا عشر عشیر بھی نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ثابت کرتی ہے یہ معاشرہ ابھی نہیں مرا، اس میں ابھی ۹۰ فیصد لوگ زندہ ہیں۔

دوسری ''الارمنگ'' بات یہ ہے کہ ہمارا بالائی طبقہ ہمارے زیریں، محروم اور پسے ہوئے طبقے سے اتنا دور جا چکا ہے کہ اس کی ''فیلنگ'' تک تبدیلی ہو چکی ہیں۔ جس بات پر عام شخص چیخ اٹھتا ہے، گھر کا سامان تک بیچ کر امداد کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے، اس پر ہمارے امراء، حکمران اور ''سقراط و بقراط'' ایزی چیئر پر بیٹھ کر فقط مسکراتے رہتے ہیں، عام شخص کی اس حرکت کو تھرڈ کلاس جذباتیت بے ساختہ ردعمل اور خودکشی جیسی حماقت قرار دیتے ہیں۔

ہاں ایک کروڑ بے حس لوگوں کے باوجود یہ معاشرہ ابھی مرا نہیں کہ اب بھی لوگ پاکستانی کرکٹ ٹیم کی شکست قبول نہیں کرتے، سبز ہلالی پرچم نیچے نہیں گرنے دیتے، قائد کی توہین پر تلملا اُٹھتے ہیں، پاک فوج کے جوان کا اُٹھ کر استقبال کرتے ہیں، ہاں آج بھی پاکستان زندہ باد کے نعرے پر جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، ایک خاندان کی بھوک پر اپنا سارا جمع جتھا لے کر حاضر ہو جاتے ہیں۔

ہاں، یقین فرمایئے مجھے یہ ۴۲ ٹیلی فون کالیں بم کی ٹک ٹک محسوس ہو رہی ہیں، مجھے یوں لگتا ہے اگر ان لوگوں کو کوئی ایسا شخص مل گیا جو شاہراہِ دستور پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر سکے ''اے لوگو! اگر تم حکمرانوں سے جان چھڑانا چاہتے ہو، اس نظام کو اُٹھا کر بحرہ عرب میں پھینکنا چاہتے ہو، تو دو، دو روپے لے کر میرے پاس آجاؤ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے نجات دلا دوں گا۔'' تو یہ لوگ اپنا سارا اثاثہ لے کر اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔

مجھے محسوس ہوتا ہے، جیسے میں صبح صادق کے روشن دھند لکے میں لپٹا بیٹھا ہوں، ابھی چند لمحے بعد سحر کی پہلی کرن پھوٹے گی اور اس کونے سے اس کونے تک روشنی ہو گی...... روشنی ہی روشنی۔

قوم تو بری نہیں

قوموں کی زندگی میں اس سے زیادہ برے وقت گزرے ہیں۔

آپ جاپان کی مثال لیں، اس جاپان کی مثال جس کے بارے میں لطیفہ مشہور ہے جب نیل آرم سٹرانگ چاند پر اترا تو اسے وہاں ایک زنگ آلود مشین ملی، اس نے حیرانی سے مشین کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو مشین کی پشت پر "میڈان جاپان" کا سٹیکر چپکا ہوا تھا، لیکن اس جاپان میں آج سے دو صدیاں پہلے کشتی بنانے والے کاریگر کو پھانسی چڑھا دیا جاتا تھا جبکہ جاپانیوں پر اٹھارویں صدی تک سمندری سفر اور غیر ملکیوں سے تجارت پر پابندی تھی، جاپانی شہنشاہ کس قدر جاہل اور غیر سائنسی نظریات کے حامل تھے اس کا اندازہ ۱۶۳۶ء کے اس شاہی فرمان سے لگایا جا سکتا ہے جس کے ذریعے جاپان میں بحری جہازوں کی تیاری کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا لیکن آج نہ صرف دنیا میں سب سے زیادہ سائنس دان اور انجینئر جاپان میں ہیں بلکہ یہی دنیا کی سب سے بڑی تجارتی طاقت بھی سمجھا جاتا ہے۔

آپ چین کی مثال لیں، دنیا اس "سپر پاور" کو ستر اسی برس پہلے تک "افیونی ریاست" پکارتی تھی، چین میں بھی سمندر پار تجارت اور ماہی گیری پر پابندی تھی، اس کے شہنشاہوں نے بھی سائنسی ترقی کا راستہ روکنے کے لیے ۱۷۳۶ء میں ملک بھر کی بھٹیاں بجھا دی تھیں، انقلاب کے بعد کی صورتحال بھی کچھ اتنی حوصلہ افزا نہیں تھی کیونکہ ماؤزے تنگ نے نہ صرف میاں بیوی کے "تعلقات" پر پابندی عائد کر دی تھی بلکہ تعلیمی ادارے بھی بند کر دیئے تھے جو برسوں بند رہے لیکن آج یہی چین دنیا کی جدید ترین اقوام کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہے۔

آپ برطانیہ کی مثال لیں، اس ملک میں فکری آزادی کا یہ عالم تھا کہ ولیم ٹنڈیل کو بائبل کا ترجمہ کرنے کے جرم میں زندہ جلا دیا گیا تھا، سیاسی شعور کی یہ حالت تھی کہ طوائفوں کی سفارش پر سر رابرٹ والپول کو وزیراعظم بنا دیا گیا تھا، رہا انصاف تو ۲۰ ویں صدی کے وسط تک گورے کے ہاتھوں کالے کے قتل کی سزا فقط ۱۶ روپے جرمانہ تھا جن میں سے ۱۴ روپے سرکاری خزانے میں جمع کرائے جاتے تھے، باقی رہی صنعتی پیداوار تو ۱۸۹۴ء میں اس "صنعتی جن" کی شرح پیداوار ایک اشاریہ پانچ فیصد تھی لیکن آج یہی برطانیہ سلیمان رشدی

اور سلیمہ نسرین جیسے شاتموں کی شخصی آزادی کے لیے تڑپ رہا ہے، دنیا جہاں کے ٹیررسٹوں کو سیاسی پناہ دے رہا ہے۔

آپ پورے یورپ کی مثال لیں، اس یورپ کی مثال جس میں ۱۷ ویں صدی تک ارسطو اور افلاطون کے نظریات سے اختلاف کی سزا، سزائے موت تھی، اس اٹلی پر نظر ڈالیں جو آج ڈاکٹر عبدالسلام کی سائنسی خدمات کے اعتراف میں اپنی ایک جدید ترین لیبارٹری ان کے نام منسوب کر دیتا ہے اس میں گلیلیو جیسے سائنس دان کو ''زمین سورج کے گرد گھومتی ہے'' کے اعلان پر سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا تھا، اس سوئٹزرلینڈ کو دیکھیے جسے آج دنیا کی جنت قرار دیا جاتا ہے وہ کل تک کرائے کے فوجیوں کا کیمپ تھا، اس فرانس کو لیجیے آج جس کا جی این پی ۵۲ اسلامی ممالک کے مجموعی جی این پی سے زیادہ ہے اس کے شہنشاہ لوئیس XVI نے اپنی ملکہ میری انٹوئینٹ کو سرے محل سے ہزاروں گنا قیمتی محل ''پیسٹ ٹرایانن'' گفٹ کیا تھا، اٹھارویں صدی کی آخری ساعتوں تک شاہ فرانس ننگا ہی دربار میں آ جاتا تھا جبکہ امراء اور وزراء دربار ہی میں پیشاب ''فرما'' دیتے تھے۔ پرتگال کو دیکھیے، بحری قزاقوں کے اس ملک میں آج بھی ایک ایسی مارکیٹ موجود ہے جس میں چوری کے مال کی خرید و فروخت کو قانونی تحفظ حاصل ہے، باقی رہی یورپ کی مذہبی رواداری تو جتنے چرچ پروٹیسٹنٹ اور کیتھولکس کی جنگ میں جلائے گئے اور جتنے مذہبی رہنما یورپ کی اس ''ڈارک ایج'' میں قتل ہوئے، اس کی مثال دنیا کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔

آپ امریکہ کی مثال لیں، غلاموں کی جتنی بڑی تجارت اس ملک نے کی اتنا ''کریڈٹ'' کسی دوسری قوم کو نہیں جاتا لیکن آج انسانی حقوق کا تحفظ تو رہا ایک طرف امریکہ ہر سال کتوں کی خوراک اور ادویات پر ۱۷ ارب ڈالر خرچ کرتا ہے۔

جی ہاں قوموں کی زندگی میں تو اس سے برے وقت بھی گزرے ہیں، پاکستانی معاشرے کا زوال تو کوئی زوال ہی نہیں، ہمارا بحران تو تاریخ کے بحرانوں میں کوئی معانی ہی نہیں رکھتا، درست ہے ہماری شرح خواندگی ۳۰ فیصد ہے لیکن پھر بھی ہم ان ملکوں سے تو بہتر ہیں جن کے تعلیمی ادارے بحرانوں میں برسوں تک بند رہے، ٹھیک ہے یہاں غربت انتہائی پستی کو چھو رہی ہے لیکن پھر بھی ہم ان ''مہذب معاشروں'' سے تو ہزار درجے بہتر ہیں جن میں سفید فام سیاہ فاموں کے بچے بھون کر کھا گئے تھے، صحیح ہے یہاں شخصی آزادیوں کی پاسداری نہیں ہوتی لیکن پھر بھی ہم ان گوروں سے تو ہزار گنا بہتر ہیں جو بائبل کا ترجمہ کرنے والوں کو زندہ جلا دیا کرتے تھے، سچ ہے یہاں انصاف نہیں لیکن پھر بھی ہم ان منصفوں سے تو لاکھ درجے بہتر ہیں جن کے نزدیک انسانی زندگی کی قیمت فقط دو روپے تھی، حق ہے یہاں بے ایمان سیاسی قیادت ہی برسر اقتدار آتی ہے لیکن پھر بھی ہم طوائفوں کی سفارش پر وزیراعظم بنانے والوں سے تو بہتر ہی ہیں، درست ہے یہاں فرقوں میں وسعت قلبی نہیں لیکن پھر بھی ہم چرچ جلانے اور لاکھوں ''باغیوں'' کے سر قلم کرنے والے کیتھولکس سے تو بہتر ہیں۔

یہ بھی سچ ہے حالات بہتر نہیں، قوم قدم قدم پیچھے کھسک رہی ہے لیکن اس کے باوجود ہم ابھی ان بحرانوں سے کوسوں دور ہیں جن سے امریکہ، جاپان، چین، برطانیہ، روس، جرمنی، فرانس اور اٹلی جیسے ملک گزرے تھے، ابھی شام کو بہت دیر باقی ہے کیونکہ ابھی ہم خدا سے اور خدا ہم سے مایوس نہیں ہوا۔

دوسری جنگ عظیم میں چرچل نے کہا تھا: ''ہم جنگ نہیں ہاریں گے کیونکہ ہمارے پاس ابھی خون، پسینہ، محنت اور آنسو باقی ہیں۔'' لہٰذا قارئین کرام میں بھی جب ''سو کالڈ'' دانشوروں کے منہ سے اس ملک کی بربادی کی ''وعید'' سنتا ہوں تو نا جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے، نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا کیونکہ ابھی اس ملک کے ۱۴ کروڑ عوام کی رگوں میں غیرت مند لہو، تخلیق کے لیے پسینہ، کوشش کے لیے محنت اور بارگاہ الٰہی میں پیش کرنے کے لیے آنسو موجود ہیں لہٰذا ہم بالکل نہیں ہاریں گے، کیا ہوا سیاستدان برے ہیں لیکن قوم تو بری نہیں۔ میرا دعویٰ ہے اس قوم کو آنے والے چند برسوں میں ایک ایسا نجات دہندہ ضرور ملے گا جو اسے ان اقوام کی قطار میں لا کھڑا کرے گا جن کی ترقی دیکھتے ہوئے آج ہمارے سروں سے ٹوپیاں گر جاتی ہیں کیونکہ جب خدا قوموں کا مقدر بدلتا ہے تو وہ بکریاں چرانے والے گڈریوں تک کو پیغمبر بنا کر بستیوں میں اتار دیتا ہے۔

آیئے سوچیں

ویسے تو گاؤں شہر سے صرف تین کلومیٹر تھا لیکن سڑک نہ ہونے کے باعث تیس چالیس میل دور محسوس ہوتا تھا۔ بارشوں کے موسم میں تو اس فاصلے میں بھی کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا۔ پورے گاؤں میں کوئی ٹریکٹر، کوئی ٹیوب ویل نہیں تھا، زمین کھودنے سے کٹائی تک اور کٹائی سے صفائی تک سارے کام بیلوں ہی سے لیے جاتے تھے، ان بیلوں کو ہم اپنی زبان میں ''جوگ'' یا ''جوڑی'' کہتے تھے، جن کسانوں کا آبپاشی کے لیے اپنا کنواں نہیں ہوتا تھا وہ اپنے کھیت کے لیے کسی دوسرے سے پانی مانگ لیتے تھے، ہاں البتہ انہیں اس کام کے لیے اپنے بیل لانے پڑتے تھے لیکن بدقسمتی سے جن لوگوں کے قرب وجوار میں کوئی کنواں نہیں ہوتا تھا وہ زمین ہموار کرتے اس پر بیج بکھیرتے اور بارش کے لیے دربار پر چڑھاوا چڑھاتے چلے جاتے، ان دنوں چڑھاوؤں میں بھی بڑی برکت ہوتی تھی، دعائیں بھی عموماً قبول ہو جاتی تھیں چنانچہ اکثر بیج ضائع ہونے سے پہلے پہلے دو تین بارشیں ہو جاتیں جن کے نتیجے میں ہر گھر میں سال بھر کے لیے غلہ جمع ہو جاتا۔

گاؤں میں کیونکہ بجلی نہیں تھی۔ چنانچہ مغرب سے فوراً بعد پورا گاؤں تاریکی میں دفن ہو جاتا، لوگ ضرورت پڑنے پر مٹی کے تیل کی لالٹین یا سرسوں کے تیل کا دیا جلا لیتے تھے تاہم اس فضول خرچی کو اچھا تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ لوگوں کے پاس کپڑے بھی نہیں ہوتے تھے لہٰذا چھوٹوں سے لے کر بڑوں تک تمام لوگ دھوتی یا تہبند ہی میں ملبوس نظر آتے، گاؤں میں دو تین لوگوں کے پاس کرتے بھی تھے لیکن وہ انہیں عموماً موسم تبدیل ہونے پر ہوا لگوانے یا کسی شادی بیاہ یا پھر گاؤں میں تھانیدار کی آمد پر ہی باہر نکالتے تھے، کھٹی لسی، باجرے کی موٹی روٹی اور اچار گاؤں بھر کا بریک فاسٹ ہوتا تھا اور لنچ بھی۔ رہا ڈنر تو اس میں لسی کی جگہ کچے دودھ کا پیالہ لے لیتا تھا لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ گاؤں میں مرغی یا ترکاری پکتی ہی نہیں تھی۔ یقیناً ایسا حادثہ بھی کبھی کبھار ہو جاتا تھا لیکن اس کے لیے گاؤں بھر کو رائی کھیت یا سبزیوں میں دھنی مٹی کا انتظار کرنا پڑتا تھا، دو تین ہزار کی اس آبادی میں طبیب بھی نہیں تھا اگر کبھی کوئی شخص بیمار ہو جاتا تو وہ مولوی صاحب سے پھونک مروا کر یا تعویز پی کر ہی تندرست ہو جاتا۔ اگر کہیں زیادہ خراب ہوتا تو مولوی صاحب مریض کو کوئی نہ کوئی بوٹی ابال کر پلا دیتے، ایک آدھ بار کسی مریض کو شہر بھی لے جایا گیا لیکن مریض کی واپسی تک لواحقین اس

کے لیے قبر تیار کرا چکے ہوتے تھے کیونکہ ان دنوں ہسپتال جانے والے مریضوں کے بارے میں لوگوں کی یہی رائے ہوتی تھی کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ سکول پورے علاقے میں کوئی نہیں تھا لہٰذا اگر کسی کو دماغ کے خلل کے باعث تعلیم کی حاجت ہو جاتی تو اسے اپنے چین تک پہنچنے کے لیے روزانہ آٹھ دس میل سفر کرنا پڑتا۔ اس پورے گاؤں کی کوئی گلی، کوئی نالی، کوئی چھت اور کوئی گھر پکا نہیں تھا، ایک ایک انچ سے کچی مٹی کی خوشبو آتی تھی۔

یہ آج سے بیس برس پرانا ''شاہ سرمست'' ہے۔ جس میں میرا پورا بچپن گزرا، اس دور میں اس گاؤں میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں تھا، تعلیم نہیں تھی، صحت نہیں تھی، بجلی سڑک اور ٹیلی فون نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہاں غربت نام کی کوئی چیز نہیں تھی، میں نے اپنے پورے بچپن میں غریب، نادار، لاچار، بے چارہ اور ''شہودا'' جیسے لفظ نہیں سنے لیکن ۲۰ برس بعد اب اس گاؤں کی کایا پلٹ چکی ہے، اب اس میں شہر تک پکی سڑک ہے۔ ہر آدھ گھنٹے بعد ایک ویگن یہاں آتی ہے اور ایک یہاں سے واپس جاتی ہے ہر گھر میں بجلی کی ٹیوب لائٹس روشن ہیں۔ ہر چھت پر ٹی وی کا اونچا انٹینا لگا ہے، تقریباً ہر گھر میں بجلی کے پنکھے، فریج اور فلیش سسٹم ہے، گاؤں میں دو درجن سے زائد ٹیوب ویل اور اتنے ہی ٹریکٹر ہیں زمین کی ایک ایک انچ پیداوار دے رہی ہے۔ ایک ایکڑ زمین کا وہ ٹکڑا جو کبھی تین چار بوری اناج دیتا تھا اب اس سے سات آٹھ بوری تک پیداوار حاصل ہوتی ہے، پورے گاؤں میں بچوں سے لے کر بوڑھوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو تین وقت سالن کے ساتھ کھانا نہ کھاتا ہو، کولڈ ڈرنکس سے مہمانوں کی تواضع ہوتی ہے۔ بیٹھے عشرے میں ایک آدھ پتلون کوٹ بھی نظر آ جاتا ہے جسے دیکھ کر اب گاؤں کے کتے بھی دم ہلاتے ہیں۔ تلاش کریں تو ''ہٹیوں'' پر ٹشو پیپر بھی دستیاب ہیں۔ ایک آدھ شخص کے پاس گاڑی بھی ہے۔ موٹر سائیکل تو اکثر لوگوں کے پاس ہے لیکن اس تمام تر خوشحالی اور اللہ تعالیٰ کے کرم کے باوجود میں جب بھی سال چھ ماہ بعد گاؤں گیا میں نے لوگوں کو غربت، پسماندگی اور محرومی کا رونا روتے ہوئے ہی پایا، انہیں لوڈ شیڈنگ، سوئی گیس، ڈبل سڑک، سپیشلسٹ ڈاکٹر، آرام دہ سواری، میٹرنٹی ہوم، ریسٹوران، کھیل کے میدان اور کمیونٹی سنٹر نہ ہونے پر شاکی ہی پایا، تب میں اس گاؤں سے لوٹتے ہوئے ہر بار سوچتا ہوں جب یہ گاؤں مٹی کا ڈھیر تھا تو یہاں غربت نام کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن آج جب اس میں جدید زندگی کی زیادہ تر سہولتیں موجود ہیں تو اس کا ہر باسی غریب ہے اسے پسماندگی، محرومی اور پیچھے رہ جانے کا احساس تنگ کر رہا ہے کیوں؟ آخر کیوں؟

یقین فرمائیے جب میں اس گاؤں سے نکل کر اس پورے ملک پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے اس کی کہانی بھی اپنے ''غریب، پسماندہ اور محروم'' گاؤں سے مختلف نظر نہیں آتی، یہ ملک جب آزاد ہوا تو اس کے پاس کیا تھا صرف ۱۴ ہزار کلومیٹر سڑکیں، ۱۲ ہزار گاڑیاں، ۱۲ ہزار ٹیلی فون لائنیں، ایک ہزار ہیکٹر قابل کاشت رقبہ اور ۲۵ میگا واٹ بجلی .... بس لیکن اس وقت کسی کو اس کی غربت، محرومی اور پسماندگی کا احساس نہیں ہوا، کسی نے نہیں سوچا ہم اس کمزور، نادار اور لاچار ملک میں کیسے زندگی گزاریں گے، ہمیں یہ نہیں چاہیے ہمیں تو بمبئی کلکتہ

یا دہلی میں ہی رہنا ہے لیکن آج جبکہ اسی ملک میں سڑکوں کی لمبائی ۲۲ لاکھ ۸۰ ہزار ہو چکی ہے، گاڑیوں کی تعداد ۳۶ لاکھ ۷۰ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے، اس میں ۲۴ لاکھ ۷۰ ہزار ٹیلی فون لائنیں، ۷۷ ہزار ۱ سو ۶۷ ڈاکٹر اور ۸۶ ہزار ۹ سو ۲۱ مریضوں کے لیے بیڈ ہیں۔ اس میں ۱۳ ہزار ۴۷ میگا واٹ بجلی پیدا ہوتی ہے، اور اس کی برآمدات چار سو چوالیس ملین ڈالر سے نو ہزار ملین ڈالر ہو چکی ہیں تو یہ ہمیں غریب، پسماندہ اور محروم نظر آنے لگا ہے، جب اس کے پاس چند ٹوٹی بندوقوں اور گیلے بارود کے چند بکسوں کے سوا کچھ نہیں تھا تو یہ ہمیں اتنا عزیز تھا کہ ہم اپنی بیٹیاں اپنی بیویاں اور اپنے بہوئیں سینکڑوں میل دور چھوڑ کر آگئے اور کبھی اس قربانی پر ملول نہیں ہوئے لیکن جب یہ ملک ایٹمی طاقت بن گیا، امریکہ تک اس کی رائفلوں اور گولیوں کے خریدار بن گئے تو یہ ہمیں برا لگنے لگا، ہم اس سے بیزار ہو گئے.......... کیوں، آخر کیوں؟

آیئے آپ اور میں دونوں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں کہیں ہمارے ساتھ کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہو گئی، کہیں ہم اپنے دشمنوں کے پروپیگنڈے کا شکار تو نہیں ہو گئے، آیئے سوچیں کہیں ہمارے دشمن میکاؤلے کے اس فلسفے پر تو عملدرآمد نہیں کر رہے ''اگر تم کسی قوم کو جنگ کے بغیر فتح کرنا چاہتے ہو تو اسے احساس کمتری کا شکار بنا دو، وہ ہمیشہ تمہاری غلام رہے گی۔'' آیئے سوچیں جس قوم کو اس کا ایٹم بم بھی غربت، پسماندگی اور محرومی کے احساس سے نہیں نکال سکتا، جسے صاف پانی کی کمی اور ٹوٹی پھوٹی سڑکیں تو نظر آتی ہیں لیکن زمین اور آسمان سے نازل ہونے والے انعامات و اکرامات دکھائی نہیں دیتے، کیا اسے زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، آیئے سوچیں.......... آیئے مہلت ختم ہونے سے پہلے سوچیں۔

خانیوال سٹیشن پر اُترتے ہوئے تم نے کہا تھا ''اپنے اندر کی تلخی کم کرو، ہنسنا بھی سیکھو، ڈوڈو'' میں نے وعدہ کر لیا۔ آج اس وعدے کی نویں برسی ہے۔

تم خود دیکھ لو، میں وعدے کا کتنا پکا، قول کا کتنا کھرا ہوں، میں ہنس رہا ہوں، اس کے باوجود ہنس رہا ہوں کہ حالات کا تھور میرے حلق اور نظام کی سیم میری زبان تک پہنچ چکی ہے، باہر کی تلخی میرے اندر کی تلخی سے مل کر زہر بن چکی ہے اور یہ زہر دل کی ہر حرکت کے ساتھ میری رگوں سے اُلجھتا اور میری سانسوں سے جھگڑتا ہے۔

میں ان نو برسوں میں تلخی کا سوداگر ہو چکا ہوں، کڑواہٹ کا بیوپاری بن چکا ہوں، میں روز اس معاشرے سے کڑواہٹ خریدتا ہوں، اسے کات کر، بن کر اس کی چادر بناتا ہوں تلخی کی چادر...... اور پھر اس چادر کو لفظوں کے چند قطروں اور زندگی کی چند شرمندہ سانسوں کے بدلے اسی معاشرے کے ہاتھوں بیچ دیتا ہوں، یہ میری زندگی ہے اور یہی میرا ہنر، لیکن تم تو بس اتنا دیکھو، میں اپنے قول کا کتنا کھرا اور اپنے وعدے کا کتنا پکا ہوں۔

ایک وعدہ تم نے لیا تھا، ایک وعدہ آج میں تم سے لینا چاہتا ہوں، اگر تم کسی بک سٹال، کسی ریلوے سٹیشن کے کسی شوکیس میں یہ کتاب دیکھو تو تم صرف اس صفحے، اس تصویر پر اکتفا کرنا کہ تمہیں اس صفحے، اس تصویر کے سوا کہیں کوئی خوشخبری، کہیں کوئی خوشی نہیں ملے گی کیونکہ میں نے جب بھی یہ وعدہ نبھایا، میں جب بھی ہنسا میری انگلیاں رو دیں، میری پوریں بہنے لگیں۔

Rs. 500/-

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
فون: 7352332 '7232336 فیکس: 7223584
www.ilmoirfanpublishers.com
E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com